قرآنی تعلیمات کا مُرقع

اِبلیس و آدم

جس میں

اِنسان کی پیدائش ○ قِصّہ آدم ○ اِبلیس ○ شیطان

جِنّات ○ ملائکہ ○ وحی اور رِسالت،

جیسے اہم موضوعات کے متعلّق بصیرت افروز مباحث شامل ہیں

پرویز

طلوعِ اِسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور

نام کتاب	------------------	ابلیس و آدم
مصنف	------------------	پرویز
شائع کردہ	------------------	طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
		25-B گلبرگ II لاہور۔ 54660
		email: trust@toluislam.com
		web: www.toluislam.com
ایڈیشن اول	------------------	1945
ایڈیشن ششم	------------------	اگست 2000ء (بلا ترمیم)
طابع	------------------	دوست ایسوسی ایٹس
مطبع	------------------	عالمین پریس لاہور

طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرستِ مطالب

رُوح

غ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف

میری زندگی کا مقصود و مطلوب قرآن کریم کا سمجھنا' اور اسے' اپنی بصیرت کے مطابق' دوسروں کو سمجھانا ہے۔ جہاں تک اس کے سمجھنے کا تعلق ہے' بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ میں نے اس میں اپنی ساری عمر صرف کی ہے۔ یہ کتاب فی الواقعہ معجزہ ہے۔ ضخامت اتنی چھوٹی سی لیکن حقائق و معارف کے اعتبار سے ایک بحرِ ناپید اکنار۔ سعدیؒ نے ذاتِ خداوندی کے متعلق جو کہا تھا کہ:

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر　　ما ہمچناں در اولِ وصفِ تو ماندہ ایم

تو یہی کیفیت خدائے جلیل کے اس آخری شاہکار کی ہے۔ جوں جوں آپ اس میں آگے بڑھتے جائیں' سامنے کا ساحل اور پیچھے ہٹتا چلا جاتا ہے۔

ایک انفرادیت اس کی یہ ہے کہ اس کا اسلوبِ بیان' انسانی تصانیف کے انداز سے مختلف ہے۔ انسانی تصانیف کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ایک کتاب ایک خاص موضوع سے متعلق ہوتی ہے۔ پھر اسے مختلف ابواب میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور جس مضمون سے متعلق وہ باب ہوتا ہے وہ پورے کا پورا اس باب میں آجاتا ہے۔ اس طرح جب اس کتاب کا قاری' باب در باب آگے بڑھتا جاتا ہے' کتاب کا مفہوم ساتھ کے ساتھ سمجھ میں آتا چلا جاتا ہے' اور وہ کتاب ختم کر لیتا ہے تو اس کا مفہوم' مربوط شکل میں اس کے ذہن میں منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کا انداز اس سے مختلف ہے۔ وہ ایک موضوع کو مسلسل و متواتر ایک ہی مقام پر بیان نہیں کرتا۔ وہ ایک جگہ' ایک بات کہتا ہے۔ دوسری جگہ اس میں اضافہ کرتا ہے۔ تیسرے مقام میں اس کی استثناء آجاتی ہے۔ کسی اور جگہ اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ کسی اور سلسلہ میں اس کا ضمنی تذکرہ آجاتا ہے تو اس کا ایک اور گوشہ نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اس اسلوب بیان کا نام' قرآن کریم کی اصطلاح میں "تصریفِ آیات" ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانے سے مفہوم کی وضاحت کرتے چلے جانا۔ قرآن کا یہ اسلوب کس قدر بلیغ اور عمیق ہے اس کی تشریح کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ اس

کا انداز عام انسانی تصانیف سے مختلف ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس انداز سے قرآنِ کریم نے اپنی تعلیم کو پیش کیا ہے، اُسے کماحقہٗ سمجھنے کے لئے قرآنِ مجید پر اتنا عبور ضروری ہے کہ جو بات آپ کے سامنے آئے اس سے متعلق قرآن کے دیگر تمام مقامات آپ کے پیشِ نظر ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس مبتدی کے دل میں قرآنِ کریم کے سمجھنے کا شوق پیدا ہو، نہ تو اسے، روزِ اوّل ہی قرآن پر اتنا عبور حاصل ہو سکتا ہے، اور نہ ہی اس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تم پہلے قرآن پر اتنا عبور حاصل کرو پھر اس کی بات تمہاری سمجھ میں آسکے گی۔ یہ تھی وہ دشواری جس کی وجہ سے اکثر وہ احباب جن کے دل میں قرآن فہمی کا جذبہ بڑا شدید تھا، اسے چوم کر پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ میں نے جب ان کی اس دشواری کا احساس کیا تو اس کا حل اس کے سوا اور کوئی نظر نہ آیا کہ میں خود ان کے سامنے قرآنِ کریم کی تعلیم اس انداز میں پیش کر دوں جس انداز میں وہ عام تصانیف کے پڑھنے کے عادی ہیں۔ اس مقصد کے لئے میں نے تصنیفی سلسلہ شروع کیا جس کا نام "معارف القرآن" رکھا۔ اس سلسلہ کی پہلی جلد جس کا عنوان (اللہ تھا ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی اور بیحد مقبول ہوئی۔ (بعد میں اس کا نام — من و یزداں — تجویز کیا گیا تھا) اس سلسلۂ زرّیں کی دوسری کڑی کا عنوان —— "ابلیس و آدم" تھا جو ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا اور اب تیسرا ایڈیشن پیشِ خدمت ہے۔ اس کے بعد، اس سلسلہ کی حسبِ ذیل کتابیں شائع ہوئیں:

(۱) جُوئے نُور — اس میں حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت شعیبؑ تک کے پیامبرانِ انقلاب کے کوائفِ جمیلہ اور ان کی اقوام کی عبرت آموز داستانیں مذکور ہیں۔

(۲) برقِ طُور — صاحبِ ضربِ کلیمی حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی آویزش اور بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی حقائق پرور سرگذشت۔

(۳) شُعلۂ مستُور — حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات، جدید تاریخی انکشافات کی روشنی میں۔

(۴) معراجِ انسانیت — صاحبِ قرآنِ عظیم کی سیرتِ طیبہ، خود قرآنی آئینہ میں۔

(۵) انسان نے کیا سوچا؟ اور
(۶) خدا نے کیا کہا؟ یعنی
اسلام کیا ہے؟
} انسانی فکر نے وحی کی راہ نمائی کے بغیر زندگی کے اہم مسائل حل کرنے میں کیا کیا کاوشیں کیں اور کس طرح ناکام رہی۔ اور پھر ان مسائل کو وحی نے کس خوبصورتی سے حل کر دیا۔

(۷) جہانِ فردا — مرنے کے بعد کی زندگی سے متعلق قرآنی تفاصیل۔

(۸) کتاب التقدیر — انسانی تاریخ کے مشکل ترین مسئلہ کا آسان ترین (قرآنی) حل۔

ان کے علاوہ میں نے لُغاتُ القُرآن مرتب کی جو چار ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہے اور اس کی روشنی میں، مفہوم القرآن جس میں پورے کے پورے قرآن مجید کا (الحمد سے والناس تک) مسلسل مفہوم آگیا ہے۔

یہ ہے قرآنِ کریم سمجھانے کے سلسلے میں میری حقیر سی کوششوں کا اجمالی تعارف۔ اب میں (گذشتہ کئی سالوں سے) تبویبُ القرآن کے مرتب کرنے میں مصروف ہوں۔ اس انسائیکلوپیڈیا میں پورے قرآن مجید کی تعلیم اس طرح مدون کر دی جائے گی کہ آپ جس عنوان سے متعلق چاہیں قرآن کے تمام مقامات بیک وقت آپ کے سامنے آجائیں۔ یہ سلسلہ کچھ لامتناہی سا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ کب تک مکمل ہو سکے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

سلسلۂ معارف القرآن کی پہلی پانچ کتابوں (من ویزداں، ابلیس وآدم، جوئے نور، برقِ طور، اور شعلۂ مستور) کے سابقہ ایڈیشن مدت ہوئی ختم ہو چکے تھے اور اگرچہ ان کے لئے احباب کے تقاضے مسلسل موصول ہو رہے تھے، لیکن چونکہ اس دوران میں میری تازہ تصانیف علی التواتر شائع ہو رہی تھیں، اس لئے ان کے جدید ایڈیشن جلدی شائع نہ ہو سکے۔ اب اُمید ہے کہ یہ سب تصانیف یکے بعد دیگرے چھپتی چلی جائیں گی۔ زیرِ نظر کتاب میں بڑے اہم بنیادی موضوعات آگئے ہیں جن کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے، بڑے اُلجھاؤ پیدا ہوتے ہیں۔ اس کتاب نے ان اشکال اور پیچیدگیوں کو بصیرت افروز انداز سے حل کر دیا ہے۔ فالحمد للہ علی ذٰلک۔

(۲) اس کا پہلا اور دوسرا ایڈیشن بسوط مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا تھا لیکن چونکہ میں اُن موضوعات پر اپنے مقالات نیز "انسان نے کیا سوچا؟" میں شرح وبسط سے لکھ چکا ہوں، اس لئے اس مقدمہ کی اب ضرورت نہیں رہی۔

(۳) جن موضوعات سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے، ان کے متعلق جو کچھ اس کتاب میں کہا گیا ہے، اس میں، اور ان کے متعلق ہمارے ہاں جو تصوّرات ونظریات (بلکہ عقائد) عام طور پر مروّج ہیں ان میں آپ اکثر وبیشتر مقامات پر اختلاف پائیں گے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میری بصیرت کے مطابق، قرآنی تعلیم ہے۔ اگر آپ اس سے متفق ہوں تو ہوا المراد۔ اور اگر آپ کو اس سے اختلاف ہو تو جو کچھ آپ صحیح سمجھیں اسے اختیار کیجئے۔ میں اپنے فہمِ قرآنی کو نہ حرفِ آخر سمجھا کرتا ہوں، نہ سہو وخطا سے مبرّیٰ۔ میری تمام کدوکاوش سے مقصود یہ ہے کہ قوم کا تعلیم یافتہ طبقہ اس چشمۂ زندگی (قرآن کریم) سے سیراب ہو سکے جو مزرعِ انسانیت کی شادابی وشگفتگی کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر میری اس کوشش سے کوئی ایک سعید روح بھی اس چشمۂ زندگی کے قریب آگئی تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔

(۴) آیات میں اوپر سورت کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا۔ مثلاً (۳/۱۲) سے مراد ہے سورۂ آلِ عمران کی

آیت ۱۲ء

اب آپ ورق اُلٹیے اور میرے ساتھ، حقائق کی ان وادیوں میں اُتریئے جنہیں قرآن کا مہرِ عالمتاب اس قدر درخشندہ و تابناک بنا رہا ہے۔

والسلام

پرویز
جولائی ۱۹۷۲ء

۲۵/ بی، گلبرگ ۲، لاہور۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاگ است

بَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ

انسان

شجرِ ارتقا کا گلِ سرسبد

سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی

کشاکشِ زم و گرما تپ و تراش و خراش
زخاک تیرہ درون تا بہ شیشۂ حلبی

مقامِ بست و کشاد و فشار و سوز و کشید
میانِ قطرۂ نیساں و آتشِ عنبی

مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند

ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

انسان

انسانی بچہ کی پیدائش آج ہمارے نزدیک ایک ایسا عادی اور معمولی واقعہ بن چکی ہے، جیسے سورج کا طلوع و غروب۔ لیکن اسباب و علل کی کڑیوں میں جکڑا ہوا انسان جب کتابِ تخلیق کے اوراق کو پیچھے کی طرف اُلٹتا ہے تو اُس کی نگہِ استعجاب کا اُس مقام پر جاکر رُک جانا ضروری ہے جسے وہ سلسلۂ تخلیقِ انسانی کی سب سے پہلی کڑی قرار دیتا ہے۔ اس وادیٔ حیرت میں پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رہ جاتا ہے کہ "سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود میں آگیا۔ اس کا تحیّر بجا اور تعجّب درست ہے۔ انسانی تحقیق و تفتیش کا ماحصل اور اس کے تمام انکشافات و ایجادات کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ کارگہِ عالم کے مختلف پُرزوں کے اسباب و علل کی کڑیوں پر پڑے ہوئے پردوں کو اپنی مژگانِ کاوش سے اُٹھا لینا ہے۔ لیکن جہاں اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی آجاتی ہے، اُس کی نگہِ تجسّس کے سامنے پردۂ حیرت کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ یہ مقام تحیّر و استعجاب انسانی علم و تحقیق کی نسبت سے متعیّن ہوتا ہے۔ یعنی جس قدر علم و دانش کی منازل آگے بڑھتی جائیں گی اسی نسبت سے یہ مقام بھی آگے سرکتا چلا جائے گا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ایک خدا فراموش مادہ پرست اور ایک حق شناس عبدِ مومن کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اوّل الذکر اس مقام سے آگے وادیٔ حیرت کو اپنی ذہنی قیاس آرائیوں کی آماجگاہ بناتا ہے اور اس طرح خود بھی ٹھوکریں کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی راہ سے گم کرتا ہے۔ لیکن ایک حکیم مومن وہاں پہنچ کر بلا تامّل پکار اُٹھتا ہے کہ اس سلسلۂ دراز کی ابتدا اس قادرِ مطلق کی اسباب فراموش مشیّت اور علل

نا آشنا صمدیت کی رہینِ منت ہے جو طبعی سلاسلِ اسباب و ذرائع سے مستغنی اور علائق و علل سے بے نیاز ہے۔ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقتِ عظمیٰ کا اعلان کرتا ہے اور اس طرح حیرت و استعجاب کی وہ وادی جو اِس خدا فراموش محقق کی قیاس آرائیوں سے تیرہ و تار ہو چکی تھی اس مردِ خود آگاہ و خدامست کی مشعلِ ایمان و شمعِ ایقان سے جگمگا اٹھتی ہے۔

سب سے پہلا انسان

"سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود پذیر ہو گیا۔ یہ وہ مقامِ تحیر ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ انسانی شعور نے جب پہلے پہل آنکھ کھولی تو اپنے گرد و پیش ایک نگار خانۂ حیرت دیکھا۔ سطحِ ارض کی حدود فراموش وسعتیں، فضائے آسمانی کی ناپیدا کنار پہنائیاں، سامنے ایک خوفناک بحرِ متلاطم، دائیں بائیں لرزہ انگیز، دیو ہیکل سلسلۂ کوہ، اوپر ایک معلق و مہیب چھت، اُفق کے اس پار سے، ہر صبح، ایک آتشیں انگارہ کی نمود اور ہر شام شفق کی جوئے خونیں میں اس کا غروب، محفلِ انجم کی شمع فروزاں، کہکشاں کی گردِ مریں اور چاند کا ساغرِ نور! وہ اس طلسمِ ہوش رُبا کو دیکھتا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ وہ بھلا کیسے سمجھ سکتا تھا کہ کائنات کا یہ محیر العقول سلسلہ کیا ہے؟ زمین کہاں سے آئی ہے۔ پہاڑ کیسے پیدا ہو گئے ہیں۔ سورج کہاں سے آتا اور کہاں چلا جاتا ہے؟ یہ چاند، یہ تارے، یہ سمندر کیسے پیدا ہو گئے۔ یہ سوالات بار بار اس کے سامنے آتے اور ہر بار اُسے ایک نئی دنیائے حیرت میں چھوڑ جاتے۔ وہ بیچارہ کیا سمجھ سکتا کہ ؎

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟　　(غالبؔ)

اور جب وہ عام عالمِ آفاق کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس کی تخلیق کس طرح ہو گئی ہے تو بھلا اس معمہ کو کیسے سلجھا سکتا کہ "سب سے پہلا انسان" کس طرح پیدا ہو گیا؟ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لے کہ سب سے پہلے کسی نہ کسی طرح ایک مٹی کا پُتلا بن گیا ہو گا جس میں جان ڈال دی گئی ہو گی۔ اور پھر اُس پُتلے کی پسلی چیر کر اس میں اس کے لئے ایک بیوی پیدا کر دی ہو گی۔ اور اس جوڑے سے اولاد کا سلسلہ آگے بڑھ گیا ہو گا۔ وہ بے چارہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا؟ لیکن جب اس کے شعور میں کچھ پختگی آ گئی اور اس نے زندگی کی کچھ منازل طے کر لیں تو اس کے زمانہ طفولیت کی یہ توجیہہ باعثِ طمانیت اور وجہِ شکیبائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے اضطراب نے کاوشِ تجسس و خلشِ

تحقیق کی صورت اختیار کی. علمِ اشیائے فطرت (NATURAL SCIENCES) کی رُو سے، جس کی صلاحیت اس میں ودیعت کر کے رکھ دی گئی تھی، اس نے ان پیچ در پیچ رموز کی گرہ کشائی کی کوشش شروع کی اور رفتہ رفتہ اُس کی تحقیقات نے اس نتیجہ کی صورت اختیار کر لی جسے آج نظریہ ارتقاء (THEORY OF ORGANIC EVOLUTION) سے تعبیر کیا جاتا ہے! اس کی نگہ تفحص نے بھانپا

نظریۂ ارتقاء

کہ کائنات میں منظم و مربوط انداز سے ایک سلسلۂ تدرج و تحوّل جاری و ساری ہے. یعنی ہر شے ایک خاص قانون کے ماتحت بتدریج نشو و ارتقاء کے مدارج طے کر رہی ہے اور یوں ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے. یہ تحوّل و تقلب کچھ ایسے غیر محسوس انداز سے عمل میں آ رہا ہے کہ سطحی آنکھ اسے محسوس طور پر دیکھ نہیں سکتی. اور پھر یہ تبدیلیاں اتنے طول طویل عرصے کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہیں کہ انسانی یادداشت کے لئے اس کا ریکارڈ رکھنا مشکل ہے. اس لئے ان تدریجی انقلابات کے لئے خود صحیفۂ فطرت کے اوراق، اور خزائن و دفائنِ ارضی کے نقوش و آثار کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے. کتابِ فطرت کے ان منتشر اوراق کے مطالعہ کے بعد، ذہنِ انسانی تخلیقِ انسانی کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ

(۱) صفحۂ ارض پر زندگی (LIFE) کی ابتدا پانی سے ہوتی ہے.

(۲) پانی اور مٹی کے امتزاج سے زندگی کے جرثومۂ اوّلیں کو پیکر عطا ہوا.

(۳) زندگی کے یہ جراثیم مختلف نوعوں میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخوں کی طرح بڑھنے پھولنے لگے.

(۴) ان جراثیم کے پیکروں میں ہزار ہزار سال کے مراحل کے بعد مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں.

(۵) اِن طویل المیعاد مراحل کو طے کر کے سلسلۂ تخلیق اس منزل پر پہنچا جسے "تخلیق بذریعہ تناسل" کہتے ہیں. یعنی حیوانی زندگی.

(۶) حیوانی زندگی اسی قسم کے غیر محسوس اور طویل المیعاد مراحل طے کرنے کے بعد منزل بمنزل انسانی پیکر میں جلوہ ریز ہوئی.

اس طرح نوعِ انسانی کی ابتدا ہوئی.

انسانی تخلیق کے متعلق یہ انکشافات وہ تھے جو مغربی سائنس دانوں کے سامنے ان کی سائنٹیفک تحقیقات

اور طبعی مشاہدات کے بعد آئے۔ اس کے برعکس، ان کی مذہبی کتابوں (بائبل) میں انسانی تخلیق کے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ اس علمی تحقیق کے سامنے ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے وہاں کے محققین اس نتیجے پر پہنچ گئے (اور ان کا اس نتیجے پر پہنچنا حق بجانب بھی تھا) کہ مذہبی کتابیں دراصل اس عہد کے افسانوں پر مشتمل ہیں جب انسانی شعور ہنوز بچپن میں تھا۔ اس لئے ان کتابوں کے بیانات و مذکورات علم و بصیرت کی روشنی میں پرکھے جانے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ اس حد تک تو مغرب کے محققین اپنے خیال میں سچے تھے لیکن انہوں نے بغیر تحقیق کئے، غلطی سے، یہ سمجھ لیا کہ ہر مذہبی کتاب اس قسم کے توہم انگیز افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اگر وہ اس باب میں جلد بازی نہ کرتے اور جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں علم و تحقیق کے بعد کسی نتیجے تک پہنچتے ہیں، اس بارے میں بھی ذاتی تحقیق سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی کہ دنیائے مذاہب میں ایک کتاب ایسی بھی ہے جس کا اعلان یہ ہے کہ:۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣعَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (۱۲/۱۰۸)

(اے پیغمبر!) ان سے کہہ دو کہ میری روش یہ ہے کہ میں خدا کی طرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی اور جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا ہے وہ بھی (اسی طرح دعوت دیتے ہیں) کائنات میں خدا کا قانون کارفرما ہے جو جہالت کی توہم پرستیوں سے بہت بلند ہے اور اس قدر قوتوں کا مالک کہ اس میں کسی اور کی قوت شامل ہی نہیں۔ (میں اسی قانون کو مانتا اور اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں)۔

یہ آواز صحرائے عرب سے، ایک نبیٔ اُمّیؐ کی زبانِ اقدس سے، اُس زمانہ میں بلند ہوئی جب اہلِ مغرب ہنوز درخت کے پتوں اور حیوانات کی کھالوں سے اپنا ستر ڈھانپا کرتے تھے۔ لیکن مغرب نے اس آواز (قرآنِ کریم) کو اپنی علمی تحقیق کا موضوع نہ بنایا اور پادریوں کے وضع کردہ افسانوں کو حقیقت سمجھ کر اس کی طرف سے مجرمانہ تغافل برتا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قرآنِ کریم جیسی سراپا علم و بصیرت کتاب، علم و عقل کی حریف سمجھ لی گئی۔ ارتقائے علومِ انسانی کے لئے وہ دن انتہائی بدبختی کا تھا جب یورپ کی "مسندِ تحقیق" سے یہ فتویٰ صادر ہوا کہ قرآنِ کریم بھی، بائبل کی طرح، اساطیر الاوّلین (توہم پرستانہ افسانوں) کا مجموعہ ہے۔ دنیا میں اس سے بڑا جھوٹ کبھی نہیں بولا گیا۔ اس سے بڑی "حماقت" اہلِ دانش و بینش" نے کبھی نہیں

کی. آج اس کا اندازہ بمشکل کیا جا سکتا ہے کہ مغرب اور اس کے ساتھ باقی دنیائے انسانیت اس غلط فیصلہ سے علم کے کتنے بڑے سرچشمے سے محروم ہوگئی. اگر مغرب کے متلاشیانِ حقیقت کے سامنے قرآن اپنی اصلی شکل میں آجاتا تو نہ معلوم آج دنیا کیا سے کیا ہو جاتی؛ زیرِ نظر موضوع میں سائنس کا معرکہ آرا کارنامہ نظریۂ ارتقاء (THEORY OF ORGANIC EVOLUTION) ہے. ذرا قرآنِ کریم کے اوراق الٹیے اور دیکھئے کہ اس باب میں اس کے ارشادات کیا ہیں. (واضح رہے کہ جیسا کہ میں دیگر مقامات پر تفصیلاً لکھ چکا ہوں)

قرآن اور سائنس کے انکشافات

قرآنِ کریم "سائنس کی تحقیقات" کی کتاب نہیں. اس کا اصل موضوع ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہے جس میں تمام نوعِ انسانی کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے اور اس طرح شرفِ انسانیت اپنی تکمیل تک پہنچ جائے. لیکن اس میں اس مقصدِ عظیم کی تبئین و توضیح کے سلسلہ میں ضمناً و تبعاً دوسری چیزوں کا بھی ذکر آجاتا ہے. اور چونکہ یہ ذکر خدائے علیم و حکیم کی طرف سے ہوتا ہے جو کائنات کا خلاق ہے، اس لئے ہو نہیں سکتا کہ اس کی طرف سے کائنات کے متعلق کوئی اشارہ آجائے. اور وہ (معاذ اللہ) حقیقت کے خلاف ہو. مشین کا مبدع و خالق مشین کے متعلق ذرا سا اشارہ بھی کرے گا تو وہ مبنی علی الحقیقت ہوگا.

اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ وَ ہُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۶۷/۱۴﴾

کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے؟ اور وہ بڑا باریک بیں اور انتہائی باخبر ہے.

اس ضمنی وضاحت کے بعد آپ دیکھئے کہ اشیائے کائنات کے طبعی ارتقاء اور انسانی تخلیق کے متعلق قرآنِ کریم نے کیا کہا ہے.

نظریۂ ارتقا اور قرآنِ کریم

سلسلۂ کائنات کی ابتدا اور اس کے تدریجی مراحل کے متعلق قرآنِ کریم نے ایک اصول بیان کیا ہے. جو اس بحث کا نقطۂ ماسکہ ہے. ارشاد ہے.

یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ ثُمَّ یَعۡرُجُ اِلَیۡہِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗۤ اَلۡفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ۝ ذٰلِکَ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ

وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ (۳۲/۶-۵)

تدابیرِ الٰہیہ (خدا کی اسکیموں) کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی مضمر شکل میں علمِ الٰہی کی بلندیوں پر ہوتی ہیں. جب ان میں سے کسی اسکیم کو بروئے کار لانا مقصود ہوتا ہے تو زمین کی پستیوں سے اس کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے. پھر وہ اسکیم اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوتی اپنے مقامِ تکمیل کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہے. یہ مراحل بڑے بڑے طویل المیعاد وقفوں میں طے ہوتے ہیں. جن میں کا ایک ایک وقفہ (PERIOD) تمہارے حساب و شمار کی رُو سے ہزار ہزار برس کا ہوتا ہے. یہ سب کچھ اس خدا کے قانون کے مطابق ہوتا رہتا ہے جو ہر شے کی موجودہ صورت سے بھی واقف ہوتا ہے اور اس کے مضمر ممکنات سے بھی. وہ اپنے اندر اتنی قوت رکھتا ہے کہ ہر شے کو مناسب نشوونما دے کر اس کے نقطۂ تکمیل تک پہنچا دے.

مشیّتِ ایزدی کے سامنے ایک اسکیم ہوتی ہے جسے اس کی انتہائی پستی، نقطۂ اوّلیں (سب سے نچلی منزل) سے شروع کیا جاتا ہے. پھر وہ اسکیم اُن خاص قوانین کے ماتحت جو اس کے لئے متعین کئے جاتے ہیں، نشوونما و ارتقاء کے مراحل طے کرتی اپنی تکمیل کے نقطۂ آخریں تک جا پہنچتی ہے. یہ مراحل بڑے بڑے طویل المیعاد "ایام" (PERIOD) میں طے ہوتے ہیں. کہیں ہزار ہزار سال کا ایک ایک تدریجی مرحلہ کہیں پچاس پچاس ہزار سال کا.

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (۷۰/۴)

"ملائکہ اور روح" اس کی طرف بلند ہوتے ہیں ایک (ایک) دن میں جس کی مقدار (پچاس پچاس) ہزار سال کی ہوتی ہے.

نقطۂ آغاز بیج کو درخت، قطرے کو گہر، خاک کے ذرّے کو انسان بننے کے لئے ان تدریجی مراحل سے گذرنا پڑتا ہے. کارگہِ مشیّت کے ان عظیم المرتبت امور (SCHEMES) میں سے ایک اہم اسکیم انسان کی تخلیق ہے. اس اسکیم کا نقطۂ آغاز طین (درجۂ جمادات[1]) بتایا گیا ہے.

---

[1] (INANIMATE)

وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۞ (۳۲/۷)

اس نے انسانی تخلیق کی ابتدا مٹی سے کی۔

واضح رہے کہ خلق کے بنیادی معنی کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا نہیں۔ اس کے معنی ہیں مختلف عناصر میں خاص ترکیب پیدا کرکے، اس سے ایک نئی چیز بنا دینا۔ یہاں جس "نقطۂ آغاز" کا ذکر ہے وہ، وہ مقام ہے جہاں سے زندگی ایک محسوس و مشہود شکل میں سامنے آجاتی ہے۔ اس سے پہلے مقامات کا ذکر نہیں۔

سورۂ انعام میں ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۞ (۶/۲)

وہ ذات جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر تمہارے لئے (مختلف مراحل کی) ایک میعاد مقرر کر دی۔ اور (ان میعادوں کے بعد) ایک اور میعاد بھی اس کے علم میں ہے۔ پھر بھی تم (اس حقیقت میں) شک کئے جاتے ہو۔

سورۂ ہود میں طین کے بجائے ارض کہا گیا ہے جو اور بھی جامع اور واضح ہے۔

هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا (۱۱/۶۱) نیز (۵۳/۳۲)۔

خدا نے (قانونِ تخلیق کے مطابق) تمہاری نمود ارض (زمین) سے کی۔

سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۞ (۲۰/۵۵)

ہم نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اسی میں تمہیں گردشیں دے رہے ہیں اور پھر اسی سے دوسری مرتبہ اٹھائے جاؤ گے۔

مٹی کا پُتلا نہیں بنایا، بلکہ مٹی کے خلاصہ سے اس کی تخلیق کی ابتدا کی۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۞ (۲۳/۱۲)۔ (نیز ۷/۱۲)

(۲۳/۱۲؛ ۷۶/۳۸)۔

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔

سُلٰلَۃٍ مِّنْ طِیْنٍ (مٹی کے خلاصہ) کے الفاظ غور طلب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شے کی نشوونما "مٹی کے خلاصہ" سے ہوتی ہے۔ ہم ایک بیج زمین میں بوتے ہیں۔ اس بیج میں اُگنے کی صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن جن اجزا پر اس کی نشوونما کا دار و مدار ہے انہیں وہ زمین سے جذب کرتا ہے۔ اگر زمین میں ان اجزا (نمکیات، معدنیات وغیرہ) کی کمی ہو جاتی ہے، تو اس پودے کی نشوونما رک جاتی ہے۔ یہی اجزا "مٹی کا خلاصہ" کہلاتے ہیں۔ زمین کی اس روئیدگی کو حیوانات کھاتے ہیں اور اس طرح وہی اجزا ان کی نشوونما کا ذریعہ بنتے ہیں گوشت خور جانور ان حیوانات کو کھاتے ہیں تو اس طرح بالواسطہ وہی اجزائے ارض ان کی نشوونما کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یہی وہ طین کا سُلالہ (مٹی کا خلاصہ) ہے جس سے ان جراثیم حیات (LIFE CELLS) کی نشوونما ہوتی ہے جو انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز ہیں۔ (تفصیل اس نکتہ کی ذرا آگے چل کر آئے گی)۔

لیکن منزلِ جمادات میں (جو اس سلسلہ کا نقطۂ آغاز ہے) زندگی محوِ خواب تھی۔ اس کی بیداری پانی کے چھینٹے سے ہوئی۔

وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ ○ (۲۱/۳۰)

اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی (الماء) سے بنایا۔ کیا یہ لوگ اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتے؟

سرچشمۂ حیات

زندگی کی جل پری نے اپنی آنکھ پانی کی گہرائیوں میں کھولی۔ سائنس کی تحقیق اسی نقطہ پر پہنچی ہے کہ حیات کے جرثومۂ اوّلیں (PROTOPLASM) کی ابتدا سمندر میں ہوئی۔ اسی لئے (ہم) میں اسی نوعیت اور اسی تناسب کے املاح (SALTS) پائے جاتے ہیں جیسے سمندر کے پانی میں۔ یوں تخلیقِ انسانی کا قافلہ وادیٔ خاک سے منزلِ آب کی طرف منتقل ہوا۔ "پانی اور مٹی کے خلاصہ" کے امتزاج سے اس جرثومہ نے خلیہ[۱] (CELL) کی شکل اختیار کی جس کے ہیولیٰ کو قرآنِ کریم نے طینِ لازب (کیچڑ کی سی چپچپی مٹی) سے تعبیر کیا ہے۔

---

[۱] خلیہ (CELL) مرکب ہوتا ہے مادہ خمیر (NUCLEUS) اور پیکر (CELL-BODY) سے۔

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ٥ (۳۷/۱۱)

ہم نے انسانوں کو طینِ لازب (چپچپی مٹی) سے تعمیر کیا ہے۔

طینِ لازب یہ طینِ لازب وہی ہے جو تالابوں کی تہ میں اور جوہڑوں کے کنارے دکھائی دیتی ہے۔ جب پانی سوکھ جاتا ہے تو یہ سیاہ رنگ کی (کالی بھُجنگ) مٹی بڑی سخت ہو جاتی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ٥

(۱۵/۲۶ ; ۵۵/۱۴)

اور بلا شبہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے۔

پانی اور مٹی کی آمیزش سے جرثومۂ حیات نے پیکر کی شکل اختیار کی۔ ان خلیات (CELLS) میں ایک لیسدا مادہ (NUCLEUS) زندگی کے تمام عظیم المرتبت امکانات اپنے اندر لئے ہوتا ہے، جیسے ایک ننھا سا بیج ایک تناور درخت کو اپنے اندر سمیٹے نمودِ شگفتگی کے لئے ہمہ تن اضطراب ہو۔ حیات کا یہ نقطۂ آغاز وہ نفسِ واحدہ ہے جس سے شجرِ زندگی کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ ایک خلیہ خاص حد تک پہنچ کر جوشِ نمود سے خود بخود دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے جنہیں (DAUGHTER-CELLS) کہا جاتا ہے۔ اس

شجرِ ارتقا نفسِ واحدہ سے جاندار مخلوق کی شاخیں پھوٹیں اور ایک طویل القامت درخت کی طرح سطحِ ارض پر پھیل گئیں۔ ہر شاخ کو مخلوق کی ایک الگ نوع (SPECIES) سمجھئے جو بڑھتی، پھولتی، پھلتی اپنی اپنی سمت میں نشوو ارتقاء کے منازل طے کئے جا رہی ہے۔ ان تمام شاخوں میں سربلند نوعِ انسانی کی شاخ ہے۔ جو اس نفسِ واحدہ کے ننھے سے بیج سے مختلف مراحل طے کرتی، درجہ بدرجہ، قدم بقدم، جادہ بجادہ، منزل بمنزل اس بلندی تک آ پہنچتی ہے۔

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۚ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ٥ .... وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۙ (۷۱/۱۳-۱۷)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ سے وقار کے آرزومند نہیں ہوتے اور یقیناً اس نے تمہیں مختلف مراحل سے گزار کر پیدا کیا ہے...... اور تمہیں زمین سے اگایا پوری طرح جما کر

پھیلاکر۔

درجہ بدرجہ طبقاً طبقاً یہاں تک پہنچادیا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ (۸۴/۱۹)

تم یقیناً ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتے ہوئے شاہراہِ زندگی پر آگے بھی بڑھتے جاؤ گے اور بلند بھی ہوتے جاؤ گے۔

اس خوردبینی نفسِ واحدہ سے سلسلۂ تخلیق آگے بڑھا۔ اس نشأۃِ اولیٰ کے بعد، وہ نفسِ واحدہ مختلف منازل میں ٹھہرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ حتّٰی کہ وہ اُس پیکرِ بشریت کے مقام تک آپہنچا جو حیاتِ ارضی میں اس کی جائے قرار ہے۔

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۝ (۶/۹۸)

وہی ہے جس نے تمہیں نفسِ واحدہ سے نشوونما دی۔ پھر تمہارے لئے مختلف منازل مقرر کیں کہ تم ایک وقتِ معیّن کے لئے ایک منزل میں ٹھہرو اور وہ منزل پھر تمہیں اگلی منزل کے سپرد کردے۔ بلاشبہ ہم نے اپنے قوانینِ حیات کو سمجھ بوجھ کر رکھنے والوں کے لئے تفصیل کے ساتھ بیان کردیا ہے۔

اس انتقالِ مکانی، یعنی ایک مستقر سے دوسری منزل تک پہنچنے میں قرنہا قرن (اَلْفَ سَنَةٍ) گزر گئے اور یوں جراثیمِ حیات LIFE CELLS کے ابتدائی مرحلہ کے بعد وہ مقام آگیا جہاں تخلیق کا سلسلہ بذریعہ تناسل شروع ہوا۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ (۳۲/۸)

پھر اُس کی (انسان کی) نسل کو کمزور سے پانی کے خلاصہ سے بنایا۔

حیوانی زندگی کی ابتدا

یعنی ان تمام سابقہ طبقات سے گزار کر، ہزارہا سال کی تدبیر و تعمیر اور ساخت و بافت کے بعد، اس کا سلسلہ "کمزور سے پانی کے نچوڑ" سے جاری رکھا۔ یعنی حیوانی زندگی کا سلسلۂ افزائش نسل تولید کے ذریعے شروع ہوا۔ (اس سلسلہ میں یہ آیات بھی دیکھئے، یعنی (۱۲ــ۲۳/۱۳)؛ (۳۶/۷۷)؛ (۱۶/۴)؛ (۲۲/۵)؛ (۴۰/۶۷)؛ (۷۷/۲۰)؛ (۵ ــ ۸۶/۶)؛

(۱۸/۳۷)۔

قافلۂ حیات کی اس منزل میں جو مخلوق پیدا ہوئی اس میں رینگنے والے اور پاؤں کے بل چلنے والے حیوانات سب شامل ہیں۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى اَرْبَعٍ ؕ (۲۴/۴۵)

اللہ نے ہر جاندار حیوان کو پانی سے پیدا کیا۔ ان میں سے وہ ہے جو اپنے پیٹ کے بل رینگتا ہے اور ان میں وہ بھی ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے۔ اور ان میں وہ بھی ہے جو چار پاؤں پر چلتا ہے۔

صرف رینگنے اور پاؤں کے بل چلنے والے ہی نہیں، بلکہ پرندے بھی۔ یعنی وہ تمام مخلوق جس کا سلسلۂ افزائش بذریعہ تناسل آگے بڑھتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ زندگی کی اس بڑی شاخ سے بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں ادھر اُدھر پھوٹیں۔ اس لئے اس حد تک یہ مختلف اقسام کی مخلوق، دراصل ایک ہی نوع کی مختلف شکلیں اور ایک ہی قافلہ کے مختلف افراد ہیں۔

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝ (۶/۳۸)

اور زمین میں چلنے والا کوئی حیوان اور ہوا میں اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں جو تمہاری ہی طرح کی نوع نہ ہو۔ یہ سب کچھ ہمارے قانون کے مطابق ہو رہا ہے جس کے دائرے سے کوئی چیز باہر نہیں رہ سکتی۔ یہ سب خدا کی طرف سے عطا شدہ راہ نمائی کے گرد جمع رہتے ہیں۔ (کوئی اس سے باہر نہیں رہ سکتا)۔

نر و مادہ کا امتیاز

یہ وہ مقام ہے جہاں ذکور و اناث (نر اور مادہ) کا امتیاز محسوس طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ (۳۵/۱۱)

اور اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے۔ پھر تمہیں جوڑے بنا دیا۔

یعنی اس مقام پر خلیاتِ حیات (LIFE-CELLS) میں جنسی تخلیق (SEXUAL REPRODUCTION) کا جوہر نمایاں ہوگیا۔ یہ جرثومے (GERM CELLS OR GAMETES) دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک (OVUM) یعنی مادہ کا خلیہ اور دوسرا SPERMATOZOON نر کا خلیہ۔ یعنی ایک جرثومۂ زندگی، ذوقِ تخلیق سے نر اور مادہ کے خلیوں میں بٹ گیا۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا......
(۷/۱۸۹)

وہی تمہارا پروردگار ہے جس نے تمہیں ایک نفسِ واحدہ (جرثومۂ حیات) سے پیدا کیا اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنا دیا۔

اس سلسلہ میں ان آیات کو بھی دیکھئے ۔(۲۰۔ ۳۰/۲۱)؛ (۴/۱۱)؛ (۳۹/۶)؛ (۴۲/۱۱)؛ (۵۳/۴۵)؛ (۷۵/۳۹)۔

———○———

ہر چند اپنے موضوع کے اعتبار سے ہم اس مقام پر احاطۂ بحث کو صرف حیوانی زندگی تک محدود رکھنا چاہتے ہیں لیکن بعض دیگر نکات کا (جو اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں) اجمالی ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے نر و مادہ کی تمیز کا ذکر صرف حیوانات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کے جوڑے بنائے ہیں۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○ (۵۱/۴۹ نیز ۴۳/۱۲)

اور ہم نے ہر شے کے جوڑے بنا دیئے ہیں۔ (ہم نے ان امور کا تذکرہ اس لئے ضروری سمجھا ہے) تاکہ تم قانونِ خداوندی کی ہمہ گیری کو پیشِ نظر رکھ سکو۔

نباتات میں جوڑے

حیوانات کے ذکور و اناث کے متعلق تو کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔ تحقیقِ جدید نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ نباتات میں بھی نر اور مادہ کا جوڑا ہوتا ہے اور ان کا مسکن بالعموم پودے کا پھول ہوتا ہے۔ پھول کی نرم اور نازک پتیوں میں اوپر کی طرف ایک ایسا مادہ ہوتا ہے جس میں نر کا جوہرِ تولید (MALES TAMENS) حفاظت سے رکھا ہوتا ہے۔ پھول کے درمیانی حصہ میں ایک اور خانہ ہوتا ہے جسے (PISTIL) کہتے ہیں۔ اسے مادہ کا گوشۂ رحم سمجھئے۔ بعض پودوں میں جنہیں (MONOECIOUS) کہتے ہیں۔ یہ دونوں جوہر ایک ہی پھول

یں نہیں ہوتے بلکہ ایک پھول میں صرف نر کا مادہ تولید ہوتا ہے۔ اسے (STAMINATE) کہتے ہیں اور دوسرے پھول میں مادہ کا جوہر جسے (PISTILLATE) کہتے ہیں۔ بعض پودے ایسے ہوتے ہیں جن میں ایک پودا نر اور دوسرا پودا مادہ ہوتا ہے۔ اس نوع کا نام (DIOECIOUS) ہے۔ سطح بین نگاہوں کے نزدیک یہ تحقیق بھی دورِ حاضرہ کی رہینِ منت ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ نہ صرف نباتات میں نر و مادہ کے امتیاز کا علم بلکہ اصولی طور پر خود نظریۂ ارتقاء مغربی محققین سے بہت پہلے مسلمان حکماء دریافت کر چکے تھے۔

مسلمان حکماء اور نظریۂ ارتقا

اس باب میں حکیم ابنِ مسکویہ (المتوفی ۴۲۱ھ) کی معرکہ آراء تحقیق دنیائے علم میں ایک خاص امتیازی شان رکھتی ہے۔ اس نے اپنے مشہور رسالہ "الفوز الاصغر" میں اس نظریہ پر خصوصیت سے بحث کی ہے۔ نباتات کے تدریجی ارتقائی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے یہ حکیم لکھتا ہے:

> اب یہی تدریجی ترقی کر کے خرما کے درخت میں بغایت شرف ظہور کرتا ہے اور نباتات کو مرتبۂ اعلیٰ پر پہنچاتا ہے۔ کہ اگر اس مرتبہ سے ذرا سا بھی آگے بڑھے تو حدِ نباتی سے نکل جائے اور صورتِ حیوانی اختیار کرے۔ خرما کے درخت میں نفس کا اثر اس درجہ قوی اور زیادہ ہوتا ہے کہ حیوان سے کثیر مشابہت اور قوی نسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک تو مثل حیوان کے اس میں نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ اور بارآور ہونے کے نر کو مادہ سے ملانا ضروری ہوتا ہے۔ اس ملانے کو تلقیح کہتے ہیں جو حیوانات کے جماع کے مثل ہے۔ پھر خرما کے درخت میں علاوہ جڑ اور رگوں کے ایک چیز مثلِ دماغ حیوانات کے ہوتی ہے۔ یہ اس کے لئے ایسی ضروری ہے کہ اگر اس کو کوئی آفت لاحق ہو جائے تو درختِ خرما ضائع ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ مسلمان حکماء کے زمانہ میں دورِ حاضرہ کے ریسرچ کے ذرائع موجود نہ تھے۔ لیکن ان کے پاس قرآنِ کریم کی ایک ایسی درخشندہ قندیل تھی جس کی روشنی میں حقائق بے نقاب ہو کر سامنے آجاتے تھے۔

ہر شے کے جوڑوں کے متعلق قرآن کریم کے اشارات کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ خود نباتات کے متعلق ارشاد ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ

اَنۡفُسِهِمۡ وَ مِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ ٥ (۳۶/۳۶)

وہ ذات (تمام نقائص وعیوب سے) پاک ہے جس نے زمین سے اُگنے والے (پودوں) میں سے ہر ایک کے جوڑے بنا دیئے اور خود نوعِ انسانی میں سے بھی اور (ان چیزوں سے بھی) جنہیں وہ (ہنوز) نہیں جانتے۔

زوج کے معنی

واضح رہے کہ بنیادی طور پر زوج کے معنی جوڑا ہی نہیں ہوتے۔ اس سے مراد ایسا جوڑا ہوتا ہے جس میں ایک فرد کی تکمیل دوسرے فرد کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ مثلاً گاڑی کے دو پہیئے ایک دوسرے کے زوج کہلاتے ہیں۔ ان میں سے اگر ایک نہ ہو تو دوسرا بیکار ہوجاتا ہے۔ اور جب یہ دونوں موجود ہوں اور ایک جیسے ہوں تو ان کا مقصدِ تخلیق پورا ہوسکتا ہے۔ زوج کے اس تصور کو سامنے رکھنے سے بہت سے گوشے بے نقاب ہوجاتے ہیں۔

اس ضمناً تذکرہ کے بعد، ہم پھر اپنے اصلی موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ اس نفسِ واحدہ نے، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، پیکرِ حیوانی میں بھی قرنہا قرن گزارے۔ ان ادوار میں "انسان" ابھی قابلِ ذکر شے نہ تھا۔

هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ یَکُنۡ شَیۡئًا مَّذۡکُوۡرًا ٥ (۷۶/۱)

کیا انسان پر وہ زمانہ نہیں گزر چکا جب یہ قابلِ ذکر شے نہ تھا۔

پیکرِ انسانی

حیوانی زندگی کی ان تمام شاخوں میں سے ایک شاخ اوپر کو اُبھری۔ یہ پیکرِ انسانی کی شاخ تھی۔ یعنی پیکرِ حیوانی کو بتدریج سنوارا گیا۔ اسے حشو و زوائد سے پاک کرکے اس کے لطیف و نازک جوہروں میں جِلا دی گئی اور یوں عروسِ حیات، حریمِ بشریت میں جلوہ ریز ہوئی۔

اَلَّذِیۡ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ فَعَدَلَکَ ٥ (۸۲/۷)

وہ ذات جس نے تجھے پیدا کیا۔ پھر (ہر طرح سے) درست کیا پھر (اعضاء و جوارح میں) تناسب پیدا کیا۔

پھر اسے احسنِ تقویم عطا فرمائی۔ یعنی بہترین توازن و تناسب کو لئے ہوئے۔

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ٥ (۹۵/۴)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا جس
میں توازن و تناسب حسین ترین مقام تک پہنچ گیا۔

دوسرے مقام پر "احسن صور" کہا گیا ہے (۲ ــ ۴۴/۳)۔

یہ احسنِ تقویم کیا ہے؟ اس بہترین ہیئت میں کون سی امتیازی خصوصیت ہے؟ وہ کون سا جوہرِ خصوصی ہے جس کی بنا پر انسان سلسلۂ ارتقاء کی سابقہ کڑیوں سے الگ حیثیت کا مالک بن گیا۔ قرآن کریم نے اسے ایک لفظ میں بیان فرمایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہی لفظ اس کی امتیازی خصوصیات کو ایک نمایاں جامعیت سے ادا کر سکتا ہے۔ فرمایا۔ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (۳۲/۴)۔ پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی) یعنی شجرِ ارتقاء کی اس شاخِ بلند و بالا کو ہر طرح سے درست کیا۔ اس میں مناسب صلاحیت و استعداد پیدا کی۔ اسے سنوارا۔ آگے بڑھایا اور جب اس میں یہ صلاحیتیں پیدا ہو گئیں تو اسے درجۂ حیوانیت سے آگے بڑھا کر اس میں خدائی توانائی (DIVINE ENERGY) کا شمہ ڈالا۔ اب وہ دیکھنے، سننے اور سمجھنے سوچنے والا انسان بن گیا۔ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ٥ (۳۲/۹) اور اس نے تمہارے لئے سمع، بصر اور فواد بنایا۔ (یعنی عقل اور جذبات دونوں عطا کر دیئے) لیکن تھوڑے ہیں جو ان صلاحیتوں کی بھرپور نشوونما کرتے ہیں۔ یہ "روحِ خداوندی" کیا ہے جس کی کرشمہ سازیوں نے ایک پیکرِ آب و گل کو کائنات کا جانِ مدعا بنا دیا؟ اس کی تفصیل تو اپنے مقام پر آئے گی، اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ اس "نفخِ روح" سے حاصل کیا ہوا؟ قرآن کریم کے الفاظ میں اس سے سمع و بصر و فواد عطا ہوا۔ کہنے کو تو یہ تین لفظ ہیں۔ لیکن غور سے دیکھئے تو شرف و مجدِ انسانیت کی پوری کی پوری دنیا ان تین گوشوں میں سمٹ آئی ہے۔ سمع و بصر انسانی حواس کے نمائندے ہیں جو خارجی دنیا کی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ معلومات انسانی قلب (MIND) تک پہنچتی ہیں اور اس سے انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے لئے کچھ فیصلہ کرے۔ اس کے اس طرح فیصلے کرنے کی صلاحیت کو اس کا اختیار و ارادہ کہتے ہیں۔ اسی سے انسان ایک ذمہ دار مخلوق بن گیا ہے۔ سورہ الدھر میں ہے؛

شرفِ انسانیت

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ٥ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا

كَفُوْرًا ۝ (۲-۳/۷۶)

یقیناً ہم نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا جس میں مختلف امکانی صلاحیتیں باہمدگر مخلوط ہوتی ہیں۔ (پھر اسے) ہم مختلف حالتوں میں گردش دیتے رہے۔ (حتّٰی کہ) اسے سننے اور دیکھنے والا بنا دیا۔ اسے (پھر) ہدایت کا راستہ دکھا دیا۔ اور اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا کہ یہ چاہے تو اسے قبول کرلے اور چاہے تو اس سے انکار کردے۔

اختیار و ارادہ کا جوہر یہ ہے وہ سب سے بڑا امتیاز جو انسان کو حیوانی زندگی سے الگ کرتا ہے. یعنی انسان کا صاحب اختیار و ارادہ ہونا۔ اس مقام پر پہنچ کر سلسلۂ ارتقاء کی یہ کڑی اپنی سابقہ کڑیوں سے یکسر الگ ہوجاتی ہے۔ انسانی پیکر، اپنے سلسلہ کے گذشتہ طبقات کی استعداد اور صلاحیتوں کا حاصل جمع (SUM-TOTAL) نہیں بلکہ یہاں پہنچ کر ان تمام صلاحیتوں اور جوہروں میں ایک ہی قسم کی تبدیلی پیدا ہوئی جو ارتقاء کے اس سلسلہ سے بالکل مختلف تھی جو اس وقت تک چلا آرہا تھا۔ (اب تو خود مغرب کے سائنسدان بھی اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ یہ تبدیلی ارتقاء کے میکانکی اثر کا نتیجہ نہیں. تفصیل وحی کے عنوان میں ملے گی) اس تبدیلی کا نتیجہ انسانی اختیار و ارادہ ہے جس سے نبضِ کائنات میں تموّج اور زندگی کی جوئے رواں میں تلاطم برپا ہے۔ اختیار و ارادہ کے بغیر یہ دنیا پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں کا بے رنگ مجموعہ اور درندوں، چرندوں، پرندوں کا بے کیف مسکن (ZOO) رہتی. حُسن کی ضیائے تابندہ اور عشق کی آتشِ سوزندہ اس کے نصیب میں نہ ہوتی. یہ سب "نفخِ رُوح" کی سحر کاریاں ہیں جن سے یہ ویرانہ، رنگ و تعطّر کا کاشانہ بن گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں صفاتِ خداوندی محدود (FINITE) شکل میں بطور ممکنات (POTENTIALITIES) ودیعت کردی گئیں. یہ خصوصیت اس سے پہلے کسی مخلوق کے حصے میں نہیں آئی تھی یہی وہ "نفخِ رُوح" تھی جس سے یہ آدمِ خاکی مسجودِ ملائکہ قرار پایا.

---

[1] اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم میں کہیں رُوحِ انسانی کا ذکر نہیں۔ اس میں روحِ خداوندی کا ذکر ہے۔ "روح" کے معنی توانائی کے ہوتے ہیں۔ یہی وہ الوہیاتی توانائی ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہا جاتا ہے اور جو انسانی اختیار و ارادہ کی حامل ہے۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِينٍ ۝ فَإِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝

(۳۸/۷۲ - ۷۱)

جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں۔ پس جب اسے (مختلف مراحلِ ارتقاء کے بعد) سنواروں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا۔

یہ ہے قرآن کریم کی رُو سے جواب اس سوال کا کہ "سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود میں آگیا؟ کہیئے کہ "علم و عقل، دانش و بینش، سائنس اور علوم و فنونِ متعلقہ" اس سے کچھ زیادہ یا الگ بھی پیش کر سکے ہیں۔ اور یہ تبیانِ حقیقت ہوا کس زمانہ میں، اُس زمانے میں جب دنیا ہنوز سائنس اور اس کے لزومات و ماجریات سے آشنا تک نہ تھی۔ آگے بڑھنے سے بیشتر ایک مرتبہ پھر نگہ بازگشت ڈالئے اس آیۂ مقدسہ پر جس سے اس موضوع کی ابتدا ہوئی ہے۔ نگہ ڈالئے اور غور کیجئے کہ یہ پوری کی پوری داستانِ طول طویل کس حُسن و اعجاز نگاری سے چند جملوں میں سمیٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ ارشاد ہے۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝...... قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ (۵؛ ۷تا۸؛ ۹/۳۲)

تدابیرِ الٰہیہ (خدا کی اسکیموں) کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی مضمر شکل میں علمِ الٰہی کی بلندیوں پر ہوتی ہیں۔ جب ان میں سے کسی اسکیم کو بروئے کار لانا مقصود ہوتا ہے تو زمین (مادہ) کی پستیوں سے اس کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ یہاں سے وہ اسکیم اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی

(گذشتہ صفحے کا فٹ نوٹ) اسے بھی سمجھ لیجئے کہ خدا نے اپنی ذات کا کوئی حصہ انسان میں داخل نہیں کیا۔ اس لئے یہ تصور کہ انسانی روح کا منتہیٰ یہ ہے کہ یہ آخرالامر خدا کی ذات میں جا کر مل جائے، یکسر غیر قرآنی ہے۔ یہ ہندوؤں کے ہاں سے ویدانت کی شکل میں اُبھرا اور ہمارے ہاں تصوّف کے روپ میں جلوہ پیرا ہوا۔

اپنے مقامِ تکمیل کی طرف اُٹھتی چلی جاتی ہے. یہ مراحل بڑے بڑے طویل المیعاد وقفوں میں طے ہوتے ہیں جن میں کا ایک ایک وقفہ تمہارے حساب و شمار کے مطابق ایک ایک ہزار سال کا ہوتا ہے...... مثلاً اس کی اسکیم یہ ہے کہ ہر شے کو مختلف تخلیقی تراکیب سے گزار کر بہترین تناسب و توازن کا حامل بنا دیا جائے۔ (اس اسکیم کی ایک شق خود انسان کی تخلیق ہے)۔ اس تخلیق کی نمود مٹی (طبقۂ جمادات) سے ہوئی۔ (پھر یہ مختلف مراحل میں سے گزرتا ہوا اس منزل میں پہنچا جہاں) اس کی تولید کا سلسلہ نطفہ کے ذریعے قرار پایا۔ پھر اس میں ہر طرح کا اعتدال پیدا کیا۔ اس کے بعد اس میں "خدا کی توانائی" کا ایک شمہ ڈال دیا گیا۔ اور اسے علم و عقل اور احساسات و جذبات عطا کر دیئے۔ لیکن بہت تھوڑے لوگ ہیں جو ان صلاحیتوں کی کامل نشو و نما کرتے ہیں اور انہیں صحیح مقام پر صَرف کرتے ہیں۔

اس سلسلۂ ارتقاء سے، نوعِ انسانی (نہ کہ کوئی خاص فرد) وجود پذیر ہوئی۔

قرآنِ کریم کا منتہیٰ

لیکن اس مقام پر ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو سامنے لے آئیے جس کا ذکر ابتدا میں کیا جا چکا ہے۔ یعنی قرآنِ کریم، تاریخ و جغرافیہ، طبیعیات و کیمیات، حیاتیات و طبقات الارض کی کتاب نہیں۔ وہ ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جس کے مطابق عمل پیرا ہونے سے انسانیت نشو و ارتقاء کے مراحل طے کر کے اس منزل تک پہنچ جائے جو اس سفرِ زندگی کا مقصود ہے۔ اس میں اگر متذکرہ صدر علوم و فنون کے متعلق اشارات پائے جاتے ہیں تو ان سے مفہوم اس منزل کی طرف راہ نمائی اور اس نصب العین کی طرف نگاہوں کا مرکوز کرنا ہے۔ مثلاً اسی نظریۂ ارتقاء کو لیجئے۔ اس سلسلۂ دراز کی اوّلین کڑی طین (طبقۂ جمادات) سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں تک ایک مادہ پرست سائنسدان بھی متفق ہے۔ اس کی تحقیق اسے از خود اس مقام تک لے گئی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم، نگہِ تجسس کو اس سے پیچھے جانے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس مادہ کو (جسے سلسلۂ ارتقاء کی محسوس طور پر ابتدائی کڑی کہا جاتا ہے) کہیں ازلی اور ابدی نہ سمجھ لینا۔ ایک وقت وہ تھا کہ یہ مادہ بھی کوئی شے نہ تھا۔ؔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، انسانی تخلیق کے متعلق کہا کہ اس پر ایک

(فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

زمانہ ایسا بھی گذر چکا ہے۔ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا ۝ (۷۶/۱) یہ قابلِ ذکر شے ہی نہیں تھا۔ وَ لَمْ تَكُ شَيْئًا (۱۹/۹) تم کوئی شے نہیں تھے۔

یہ تو تھی ابتدا۔ اب انتہا کی طرف چلئے۔ مغرب کے محققین نے جب یہ دریافت کر لیا کہ خاک کا ذرہ کس طرح اپنی ارتقائی منازل طے کر کے درجۂ انسانی تک آ پہنچا ہے، تو انہوں نے کتابِ کائنات کے اس باب (CHAPTER) کو ختم کر دیا اور سمجھ لیا کہ انسان کی موجودہ منزل، ارتقاء کے سلسلۂ دراز کی آخری کڑی ہے، اس کے بعد کچھ نہیں۔ لیکن قرآن کریم نے اس سلسلۂ دراز کی مختلف کڑیوں کی طرف توجہ منعطف کرانے کے بعد نگۂ تجسس کو فوراً اس طرف پھیر دیا کہ انسان کی موجودہ زندگی اس سلسلہ کی آخری کڑی نہیں بلکہ اسے ابھی قانونِ ارتقاء کے مطابق آگے بڑھ کر کسی اور منزل تک پہنچنا ہے۔ اس موجودہ منزل سے اگلی منزل کا نام حیاتِ اُخروی ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ انسانی زندگی دو درجات پر مشتمل ہے۔ ایک درجہ حیوانی زندگی کا ہے جو اسے نچلے درجے سے ارتقائی طور پر ملا ہے۔ یہ اس کی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے جو اُنہی قوانین کے تابع ہے جن قوانین کے تابع دوسرے حیوانوں کی زندگی ہے۔ یعنی کھانے پینے سے زندہ رہنا اور پھر ایک مدت کے بعد، مر جانا۔ لیکن یہ موت انسان کے طبعی جسم کی موت ہے۔ یہ اس زندگی کا خاتمہ ہے جسے ہم نے درجۂ حیوانی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی زندگی کا دوسرا درجہ انسانی درجہ ہے جس کی بنیاد "نفخِ روح" (صفاتِ خداوندی) پر ہے۔ یہ انسانی ذات یا اس کی خودی ہے جو طبعی موت کے بعد بھی باقی رہ سکتی ہے۔ یہ درجہ انسانیت کا ہے۔ اس درجہ میں زندگی کی نشو و نما اور فلاح و بقا کے لئے طبعی قوانین کام نہیں دیتے۔ یہاں پر ایک اور ضابطۂ قوانین کارفرما ہوتا ہے (اس کی تفصیل دوسرے مقام پر ملے گی)۔ یہی وہ زندگی ہے جو حیاتِ اُخروی کے میدان میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ قرآن کریم نظریۂ ارتقاء کو بیان ہی اس انداز سے کرتا ہے کہ حیاتِ اُخروی یا نشاۃ ثانیہ ایک منطقی نتیجہ (LOGICAL INFERENCE) کی حیثیت سے خود بخود سامنے آجائے۔ وہ سلسلۂ تخلیق میں، سب سے پہلے اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ کائنات کی کوئی شے بلا مقصد پیدا نہیں کی گئی[1] جب کائنات کی دیگر اشیاء کے متعلق یہ تصریح فرما دی کہ وہ

(گذشتہ صفحے کا فٹ نوٹ) اس کی مختصر تفصیل عنوان زیرِ نظر کے آخر میں دیکھئے۔

[1] فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے

بلامقصد پیدا نہیں کی گئی، تو کیا انسان جو اس بزم کائنات کا صدر اور نظمِ عالم کا ٹیپ کا بند ہے، بلامقصد پیدا کر دیا گیا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ بیج سے لے کر کونپل تک درخت کا ایک ایک ریشہ کسی نہ کسی مقصد کو لئے ہو۔ لیکن اس کا پھل بلا غرض و غایت پیدا کر دیا گیا ہو؟ یہ ناممکن ہے۔ اسی لئے فرمایا:

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا وَّ اَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ ○ (۲۳/۱۱۵)

کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بلامقصد پیدا کر دیا ہے اور تمہاری زندگی کی گردشوں کا رُخ ہماری طرف نہیں! (تمہارا ہر قدم ہمارے قانون مکافات کی طرف نہیں اٹھ رہا؟)۔

مبدا سے معاد پر استدلال

دوسرے مقام پر اس کی تصریح ان الفاظ میں فرمائی۔

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی ؕ اَلَمۡ یَکُ نُطۡفَۃً مِّنۡ مَّنِیٍّ یُّمۡنٰی ۙ ثُمَّ کَانَ عَلَقَۃً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ۙ فَجَعَلَ مِنۡہُ الزَّوۡجَیۡنِ الذَّکَرَ وَ الۡاُنۡثٰی ؕ اَلَیۡسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰی ○ (۷۵/۴۰-۳۶)

کیا انسان خیال کرتا ہے کہ اسے بغیر کسی مقصد اور نصب العین کے یونہی چھوڑ دیا گیا ہے[1]؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ یہ پانی کے کمزور سے قطرہ میں زندگی کا چھوٹا سا جرثومہ تھا۔ پھر اس نے علقہ کی سی شکل اختیار کی۔ (پھر اللہ نے) اس کی دوسری صورت میں تخلیق کی۔ پھر اسے درست کیا۔ اُس

(گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ) یہ مسئلہ کہ یہ کائنات بلامقصد نہیں پیدا کی گئی۔ ایک عظیم الشان حقیقت کو اپنی آغوش میں لئے ہے۔ لیکن اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں جس مقام پر یہ تفصیل آئے گی وہاں بتایا جائے گا کہ خود یورپ کے مادہ پرست سائنسدان کس طرح بالآخر اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں جس کی طرف قرآن کریم نے اتنا عرصہ پہلے توجہ دلائی تھی۔

[1] سُدًی کے لفظی معنی ہیں تانا ہی تانا جس میں بانا نہ ہو۔ اس سے قرآن نے ایک ایسی عظیم القدر حقیقت بیان کی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ مختصراً یہ سمجھئے کہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ مقصودِ حیات "روح اور مادہ" "دنیا اور آخرت" "ارض اور سماء" کے امتزاج (تانے بانے) سے حاصل ہوگا۔ تنہا تانے یا تنہا بانے سے نہیں۔

کے بعد اس نے نر اور مادہ کا جوڑا بنایا۔ کیا (یہ سب کچھ کر سکنے والا خدا) اس پر قادر نہیں کہ وہ مُردوں کو زندگی عطا کر دے۔

قرآنِ کریم نے مقصدِ تخلیقِ انسانی کی تکمیل کے لئے اس زندگی سے اگلی زندگی کو ضروری قرار دیا ہے اور یہی ہے وہ مقصد جس کی طرف قرآنِ کریم سلسلہ ارتقاء کے تدریجی مراحل کا ذکر کرنے کے بعد ذہنِ انسانی کو منتقل کرنا چاہتا ہے۔ فرمایا؛

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ...... ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝ (۱۲-۱۶/۲۳)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ (یعنی زندگی کی ابتدا یہاں سے ہوئی) پھر ہم نے اسے نطفہ بنایا ایک ٹھہر جانے اور جماؤ پانے کی جگہ میں۔ پھر نطفہ کو ہم نے علقہ بنایا پھر علقہ کو ایک گوشت کا ٹکڑا کر دیا۔ پھر اس مضغہ کو ہڈیوں کا ڈھانچہ بنایا۔ پھر ڈھانچہ پر گوشت کی تہہ چڑھا دی پھر (دیکھو) اسے کس طرح ایک دوسری ہی طرح کی مخلوق بنا کر نمودار کر دیا۔ دیکھو! خدا کے پاس سامانِ نشوونما کی کس قدر فراوانیاں ہیں جن سے وہ اس قسم کے تخلیقی مدارج طے کرا کر انسان کو بہترین تناسب و توازن کا پیکر بنا دیتا ہے۔ اس قسم کا حسنِ تناسب کوئی اور عطا نہیں کر سکتا۔

ان مراحل کے بعد، تم سب کو مرنا ہے' پھر (مرنے کے بعد) ایسا ہونا ہے کہ قیامت کے دن اٹھائے جاؤ۔

سطح بیں نگاہوں کو انسان کی نشاۃِ ثانیہ کے خلاف یہ اعتراض نظر آتا ہے کہ جب ان عناصر ترکیبی کا شیرازہ بکھر جائے گا تو اس کے بعد ایک ترکیبِ جدید کیسے ہوگی؟ اور سطح بیں نگاہوں پر ہی کیا موقوف ہے۔ آج یورپ کے اکثر حکماء جنہیں دنیا علم و بصیرت کی انتہائی بلندیوں پر خیال کرتی ہے' اسی سطح بینی میں گرفتار ہیں۔ اس لئے کہ جس طرح وہ پہلے راستوں میں محض اپنے ذہن کی قیاس آرائیوں کی مدد سے چلتے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے تھے' اس منزل سے آگے بھی اپنے تصورات ہی کی روشنی میں بڑھنا چاہتے ہیں۔ اور ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ دنیا دیکھے گی کہ جس طرح ایک مدت کی صحرا نوردیوں کے بعد یہ لوگ تخلیقِ انسانی کے متعلق حقیقت کے ایک گوشہ تک جا پہنچے ہیں۔ بالآخر انہیں نشاۃِ ثانیہ کے متعلق بھی وہیں آنا پڑے گا جہاں

کی دعوت قرآن دیتا ہے[1]. اس لئے کہ قرآن کی دعوت ظنّ وتخمین کی آواز نہیں. علم وبصیرت اور حتم ویقین کی دعوت ہے. اس کا اعلان ہے کہ

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ (۳۱/۲۸)

تمہاری (موجودہ) پیدائش اور دوبارہ زندگی (نشأۃِ ثانیہ) ایک نفسِ واحدۃ[2] کی مثل ہے. بے شک اللہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے.

جس دستِ قدرت میں یہ طاقت ہے کہ وہ زندگی کے جرثومۂ اولیں سے موجودہ ہیئت کا انسان بنا دے اس کے لئے اس کے عناصرِ طبیعی کے انتشار کے بعد ترتیبِ جدید میں کیا مشکل ہو سکتی ہے؟

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝ (۲۰/۵۵)

اُس نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا. اسی میں تمہیں مختلف مراحل میں گردشیں دیں اور پھر اسی سے دوسری مرتبہ اٹھائے جاؤ گے.

---

[1] خود سائنس معترف ہے کہ ابدی حقائق کی لِم اور کُنہ ابھی تک بے نقاب نہیں ہو سکی. الفریڈ کوبن اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVLISATION) میں لکھتا ہے:

اس امر کا خیال تک بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہم قطعی حقیقت کا علم حاصل کر چکے ہیں. حتیٰ کہ سائنس کے محدود دوائر میں بھی نہیں جب تک اس تمام محسوس دنیا کا علم حاصل نہ ہو جائے." (ص۱۶)

اس کی تصریحات کے لئے وحی کا عنوان دیکھئے.

[2] قرآن کریم حیات (LIFE) کو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت (INDIVISIBLE UNIT) قرار دیتا ہے اور افراد کو اس وحدت کے مظاہر. جس طرح (محض سمجھنے کی خاطر یوں سمجھئے کہ) بجلی کی قوت (یا اس کی لہر) ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اور قمقمے، پنکھے، آلاتِ مکبّر الصوت وغیرہ اس قوت کے مظاہر. وحدتِ حیات (اور اس کی بنا پر فرد اور جماعت کا باہمی ربط) اسلام کا مابہ الامتیاز فلسفہ ہے اور اسی پر اس کا تمام نظام قائم ہے. اس کی تفصیل بھی وحی کے عنوان میں ملے گی.

دوسرے مقام پر ہے۔

وَ قَالُوْٓا ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝
.... قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ (۴۹ – ۱۷/۵۱)

اور یہ کہتے ہیں کہ جب ہم (مرنے کے بعد) محض چند ہڈیوں کی شکل میں رہ جائیں گے، تو پھر کیا ایسا ہو سکے گا کہ از سرِ نو اٹھا کھڑے کئے جائیں. تم کہہ دو کہ ہاں تم (مرنے کے بعد) کچھ ہی کیوں نہ ہو جاؤ. پتھر ہو جاؤ. لوہا ہو جاؤ یا کوئی چیز جو تمہارے خیال میں (دوبارہ زندہ ہونے کے لئے) بہت ہی سخت ہو، (لیکن تم دوبارہ زندہ ہو کر رہو گے).

اس پر یہ کہیں گے کہ وہ کون ہے جو اس طرح ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا؟

تم کہہ دو وہی جس نے پہلی مرتبہ تمہیں پیدا کیا۔

اس کے ساتھ سورۂ حج کی اس آیت (۲۲/۵) کو بھی دیکھئے. اور حقیقت اور بھی اُبھر کر سامنے آجائے گی. اس

موت اور حیات

مقام پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ قرآنِ کریم صرف اس زندگی کے بعد کی دوسری زندگی ہی سے بحث نہیں کرتا. بلکہ وہ اس زندگی کی "موت اور حیات" کے متعلق بھی ہدایات دیتا ہے. وہ قوموں کے عروج کو ان کی زندگی اور ان کے زوال و ہبوط کو ان کی موت سے تعبیر کرتا ہے. وہ بار بار بتاتا ہے کہ وہ کون سے اصول ہیں جن کے مطابق قوموں کو زندگی عطا ہوتی ہے. اور کون سی روش ہے جسے اختیار کرنے سے ان پر موت طاری ہو جاتی ہے. وہ اقوامِ سابقہ کے عروج و زوال کی داستانیں پیش کرتا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ ایک تاریخ کی کتاب ہے بلکہ ان کے اعمال کے انجام و عواقب سے قانونِ فنا و بقا پر شہادت لائے. اس کے لئے اُس نے کھلے کھلے الفاظ میں ایک اصول بیان کر دیا کہ:-

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُۨ ۝
الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ
وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۝ (۱ - ۶۷/۲)

زیست کی تمام فراوانیاں قانونِ خداوندی سے وابستہ ہیں جو تمام اختیارات و اقتدارات کا مالک ہے. لیکن اس نے تمام امور کے لئے پیمانے اور اندازے مقرر کر رکھے ہیں جن کے

مطابق اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اسی قانون کے مطابق قوموں کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یہ گردشیں اس لئے دی جاتی ہیں تاکہ زندگی اور عروج اس کے حصے میں رہے جو سب سے زیادہ توازن بدوش زندگی بسر کرے۔ اس کا قانون سب پر غالب رہنے والا اور تباہیوں سے بچنے کا سامان فراہم کرنے والا ہے۔

یعنی موت و حیات کا قانون اسی لئے متعین کیا گیا ہے کہ یہ نمایاں طور پر سامنے آ جائے کہ تم میں سے کون ایسے کام کرتا ہے جو اس قانون کے مطابق زندگی بخش ہیں۔ اور کون ایسا ہے جو اپنے اوپر ہلاکت وارد کر لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ واضح اور غیر مبہم قانون اسی لئے بیان کیا گیا ہے تاکہ

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ (۸/۴۲)

جسے ہلاک ہونا ہے واضح قوانین (کے ماتحت) ہلاک ہو۔ اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی واضح قوانین (کی رُو سے) زندہ رہے۔ اور اللہ بے شک (سب کچھ) سننے والا اور (ہر بات کا) علم رکھنے والا ہے۔

اعمالِ صالحہ سے مُراد

وہ قانونِ ارتقاء کے اس بنیادی اصول کو مختلف گوشوں اور متنوع پہلوؤں سے دل نشین کراتا ہے کہ اس کارگہِ سعی و عمل میں وہی نوع باقی رہ سکتی ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہو (جس کے اعمال صالح ہوں)۔ وہی آگے بڑھ سکتی ہے جو اپنے اندر آگے بڑھنے کی استعداد پیدا کرے۔ وہ دیگر انواع کی مثال دے کر اس سے خود انسانی زندگی پر استشہاد کرتا ہے کہ ارتقاء کے اس عظیم الشان درخت کو دیکھو اور غور کرو کہ کتنی شاخیں تھیں جو سوکھ سوکھ کر گر گئیں۔ کتنے پھول تھے جو مرجھا مرجھا کر زمین پر آ لئے اور راستہ چلنے والوں کے پاؤں تلے آ کر مسلے گئے۔ اس کے برعکس اتنی شاخیں ہیں جو سرسبز و شاداب ہوئیں۔ کیسے کیسے شگفتہ اور نورستہ پھول لائیں۔ اور کیسے کیسے نفیس و لطیف پھل پیدا کئے۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت کے اس قانون پر غور کرو اور یہ سوچو کہ اقوام و مللِ گذشتہ کا کیا حشر ہوا؟ اس کا ارشاد ہے کہ مختلف انواع کی طرح قوموں کی موت و حیات کا بھی یہی قانون ہے۔ جو قوم زندگی کی اہل نہیں رہتی فنا ہو جاتی ہے۔ اسے کوئی رعایت نہیں دی جاتی۔ اس فیصلہ یعنی ان کے اعمال کے ظہورِ نتائج میں ذرہ بھر تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی[1]

(۱ے فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (۷/۳۴)

اور ہر اُمّت (گروہ. جماعت. نوع) کے لئے (ظہورِ نتائج) کا وقت معیّن ہے. جب وقت آجاتا ہے تو پھر ایک ساعت کی بھی تقدیم وتاخیر نہیں ہوسکتی۔

اس اصولی نکتہ کو بیان کردینے کے بعد اگلی آیت میں یہ بتادیا کہ زندہ اور باقی رہنے کے لئے کیا قانون مقرر ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۷/۳۵)

اے نوعِ انسان! جب ایسا ہو کہ میرے پیغمبر تمہارے پاس آئیں اور میرے قوانین سے تمہیں مطلع کریں، تو (اس وقت) جو (ان قوانین سے ہم آہنگ ہو کر میری) حفاظت میں آجائے گا اور (یوں اپنے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی) صلاحیت پیدا کرلے گا، تو اس پر (مٹنے اور زوال پذیر ہوجانے کا) کوئی غم اور اندیشہ نہ ہوگا۔

یہ تو ہیں وہ جو باقی رہیں گے اور آگے بڑھیں گے. جنہیں ہلاکت و بربادی کا اندیشہ نہ ہوگا. ان کے برعکس.

وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۷/۳۶)

لیکن جو لوگ ان قوانین کو جھٹلائیں گے اور ان سے سرکشی برتیں گے تو ان کی کھیتیاں جُھلس کر رہ جائیں گی اور وہ زندگی کی خوشگواریوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہوجائیں گے۔

قوموں کے عروج وزوال کے اُصول

غور فرمایئے پہلی آیت میں قوموں کی موت و حیات کا ایک اصول بیان فرمادیا. اس کے بعد اس کی وضاحت کردی کہ ہلاکت سے مامون اور بربادی سے مصئون رہنے کا کیا طریقہ ہے اور وہ کونسا نظام ہے جس پر چل کر انسان امن وسلامتی کی جنت میں پہنچ سکتا ہے. اس وقت اس نظام کی تشریح کا موقع نہیں. یہاں صرف اتنا دیکھئے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے اس نظام کا اصل الاصول یہ ہے کہ اُس

ان امور کی تشریح دوسرے مقام پر ملے گی جہاں قوموں کے عروج وزوال کی داستان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے گی۔

ضابطہ کو نصب العین حیات بنایا جائے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو ملا ہے۔ آیندہ اوراق میں اسی پیغام حیات بخش اور اسی نظام روح پرور کی بصیرت افروز داستان کو پیش کیا جائے گا۔ وہ جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان میں وہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی جس سے وہ فنا و برباد کر دینے والی قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے اور اسے کسی قسم کا خوف ہلاکت و حزن بربادی نہ رہے (لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ٥) اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو خدا کا قانون استخلاف واستبدال (THE LAW OF SUCCESION AND SUBSTITUTION) اپنا اٹل فیصلہ کر دے گا اور اس قوم کی جگہ دوسری قوم آ جائے گی۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ۝

(۶/۱۳۴) نیز (۳۵/۱۶)

اور دیکھو تیرا نشوونما دینے والا اپنی نشوونما کے لئے کسی کا محتاج نہیں بلکہ اس کے پاس تمام کائنات کی نشوونما کا سامان فراواں موجود ہے۔ (لیکن یہ نشوونما اس کے قانون کے مطابق ملتی ہے) اگر تم اس کے قانون کے خلاف چلو گے تو تمہیں ہٹا دے گا اور تمہاری جگہ اس قوم کو لے آئے گا جس میں اس قانون کے مطابق جانشینی کی صلاحیت ہوگی۔ یہ اس قانون کے مطابق ہوگا جس کے مطابق اس نے تمہیں دوسری قوم کی ذریت سے اٹھا کھڑا کیا تھا۔

دوسری جگہ ہے۔

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ۝ (۴۷/۳۸ نیز ۵۶/۹۱ ؛ ۷۰/۴۱)

اور اگر تم نے (ان قوانین سے) سرکشی اختیار کی تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا۔ اور وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ (بلکہ تم سے بہتر ہوگی۔ اسی لئے تو وہ تمہاری جگہ لے گی)۔

مغنیِ آتشِ نفس، موسیقار کی طرح ایک قوم کی راکھ کے ڈھیر سے دوسری قوم وجود کوش ہوتی ہے۔ مٹنے والی قومیں مٹ جاتی ہیں اور باقی رہنے والی ان کی جگہ لے لیتی ہیں، ؎

چوں جہاں کہنہ شود پاک بسوزند اُو را
وز ہماں آب و گل ایجادِ جہاں نیز کنند

شرفِ انسانیت کے لئے قانونِ ارتقاء

جیساکہ اوپر کہا جا چکا ہے، قانونِ ارتقاءً کی اصل یہ ہے کہ وہی نوع باقی رہ سکتی ہے اور آگے بڑھ سکتی ہے جس میں حفظِ نفس اور بقائے ذات کی صلاحیت و استعداد موجود ہو، اُن تمام مخالف قوتوں کا مقابلہ کرسکے جو اسے مٹانے پر آمادہ ہوں. جو ناسازگار ماحول، نامساعد فضا اور ہلاکت آفریں اسباب کی مدافعت کا سامان اپنے اندر رکھتی ہو. وہ اقوام و ملل جنہوں نے سامانِ مدافعت اور قوتِ محافظت کو کھو دیا، ہلاک ہوگئیں. جنہوں نے اس کو قائم رکھا، ہلاکت سے محفوظ رہیں. قانونِ ارتقاءً کا اتنا حصہ انسان کی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) سے متعلق ہے اور اس اعتبار سے انسان اور اس سے پہلی کڑی (طبقۂ حیوانات) میں کچھ فرق نہیں. لیکن، جیساکہ پہلے کہا جا چکا ہے، انسان دیگر حیوانات سے ایک قدم آگے ہے. اور یہی وہ مقام ہے جو اسے اُفقِ حیوانیت سے بلند کرکے درجۂ انسانیت میں لے آتا ہے. وہ مقام جہاں قرآنِ کریم اسے (وَ نَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا) سے دیگر حیوانات سے ممتاز کر دیتا ہے. لہٰذا وہ قانونِ ارتقاء، جو انسان سے پیشتر تمام انواع میں محض طبیعی زندگی سے متعلق تھا، درجۂ انسانیت میں پہنچ کر طبیعی زندگی کے علاوہ نفسِ انسانی کو بھی اپنے حلقۂ اثر و نفوذ میں لے آیا. یعنی جس طرح انسان کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی طبیعی زندگی کی حفاظت کے لئے مخالف قوتوں سے مدافعت کی صلاحیت پیدا کرے (جس طرح دوسرے حیوانات کرتے ہیں) اسی طرح اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے "نفس" کی حفاظت اور نشوو ارتقاء کے لئے تمام متصادم و متحارب قوتوں کے خلاف اپنے اندر سامانِ مدافعت پیدا کرے. نفسِ انسانی کی حفاظت اور نشوو ارتقاء سے تغافل برت کر محض حیوانی زندگی کے حفظ و بقا کو مقصودِ زندگی سمجھ لینا، کفر ہے.

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ
وَ النَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝ (۴۷/۱۲)

وہ لوگ جو (قوانینِ الٰہیہ سے) انکار کرتے ہیں (ان کی کیفیت یہ ہے کہ) وہ پیش پا افتادہ مفاد سے اس طرح متمتع ہوتے ہیں اور یوں (محض) کھانے پینے (ہی کو مقصدِ زندگی سمجھ

لیتے ہیں) جس طرح حیوانات (کا مقصدِ زندگی محض) کھانا پینا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہوتا ہے۔

یعنی جو لوگ قوانینِ الٰہیہ کی جگہ انسانوں کے خودساختہ نظام کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا مقصدِ زندگی محض طبیعی حیات کی پرورش اور حفظ و بقا ہوتا ہے۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔ جو قوم تحفّظِ "نفس"، یعنی ارتقاءِ انسانیت سے یوں غفلت اختیار کرلے، وہ ہلاک و بربادی سے کیسے بچ سکتی ہے؟

اس سے اگلی آیت میں ہے؛

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۝ (۴۷/۱۳)

اور کتنی ایسی بستیاں تھیں جو قوت میں ان لوگوں سے بھی بڑھ کر تھیں جنہوں نے تجھے (اے رسولؐ! مکہ سے) باہر نکال دیا ہے۔ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ سو ان کا کوئی مددگار نہ ہوا۔

یہ کیوں؟ اس لئے کہ:۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ۝ (۴۷/۱۴)

کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے آمدہ واضح قوانین پر قائم ہو، اس کی مانند ہو سکتا ہے جس کے غلط اعمال اس کی نگاہوں میں مزین بنا دیئے جائیں۔ اور وہ لوگ اپنی خواہشات کے اتباع ہی کو (مقصدِ زندگی) قرار دے لیں۔

یعنی جس شخص نے اللہ کے ضابطۂ حیات کے بجائے اپنے خیالات و نظریات کو شاہراہِ عمل بنا لیا (وہ کبھی ہلاکت سے نہیں بچ سکتا۔ اس لئے کہ وہ قانونِ ارتقاء جو انسانیت کے تحفّظ اور عروج کے لئے ضابطہ ہے صرف خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت ہے۔ وہ خدا جو ذی المعارج ہے۔

مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ۝ (۷۰/۳)

اس خدا کی طرف سے جو بلندیوں کی راہوں کا مالک ہے۔

اب تو خود یورپ کے مادہ پرست محققین بھی رفتہ رفتہ اقرار کر رہے ہیں کہ سلسلۂ ارتقاء میں مادیات کے علاوہ "اخلاقیات" کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ارتقاء کا مقالہ نگار اپنے

مضمون کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے۔

> حبِ وطن، مذہب، آرٹ، سائنس اور لٹریچر کا بھی (میزانِ) بقا میں بڑا وزن ہے اور یہ سلسلۂ ارتقاء میں بڑا مفید کام کرتے ہیں۔ (اس سلسلہ میں) اخلاق کسی غیر متعلق خارجی قوت کی حیثیت نہیں رکھتا جو ایک مستبد اور بیگانۂ اخلاق آفاقی نظام کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ بلکہ یہ خود ارتقاء کی تخلیق ہے اور سلسلہ ارتقاء کے تدریجی تغیرات کو صحیح سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک اہم قوت۔ ہمیں امید بلکہ یقین ہے کہ وہ تہاذیب جو عدل و حریت، آئین و انضباط اور مستحکم اخلاقیات پر مبنی ہیں آخر الامر سب سے زیادہ کامیاب اور دیرپا ثابت ہوں گی۔

اے کاش! یورپ کے سامنے قرآن ہوتا تو وہ دیکھ لیتا کہ وہ کون سی تہذیب ہے جو عدل و حریت، نظم و ضبط اور مستحکم اخلاقیات پر مبنی ہے۔ اگر وہ قرآن کی رُو سے ان الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ لیتا تو آج اس طرح برباد اور ہلاک نہ ہوتا کہ خود اس کی تباہی بھی قانونِ ارتقاء ہی کے ماتحت ہو رہی ہے۔

یہ تو تھی محض طبیعی زندگی کو منتہائے نگاہ بنا لینے والوں کی کیفیت۔ اس کے برعکس طبیعی زندگی کے لوازم سے چشم پوشی کر کے محض "روحانیت" کی ترقی کے لئے بزعمِ خویش سعی و کاوش میں زاویہ نشینی اور سر بزیری اختیار کر لینا بھی قانونِ ارتقاء کی رُو سے غلط اندیشی ہے، جس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ فوج کی حفاظت کے لئے قلعہ کی دیواروں کا آہنی ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں نفسِ انسانی کے تحفظ و بقا اور عروج و ارتقاء کے لئے تاکید کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی رہبانیت کی زندگی کو غلط قرار دے کر طبعی زندگی کے استحکام کے لئے مادی قوتوں کے حصول و استبقاء کو بھی ضروری قرار دیا ہے اور اس طرح صحیح قانونِ ارتقاء کے مطابق ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات عطا فرمایا ہے جس میں انسان اپنی موجودہ منزل میں بھی اپنے آپ کو قائم رکھ سکے اور اس کے بعد کی منزل میں موجودہ زندگی سے ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت بھی اپنے اندر پیدا کرتا جائے۔

گذشتہ صفحات میں بیان کردہ اشارات سے ہم نے دیکھ لیا ہے کہ تمام کائنات میں (جس میں

انسان بھی شامل ہے) خدا کا ایک قانون کارفرما ہے. جس کی رُو سے ہر وہ شے جو اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کر لیتی ہے زندہ رہتی ہے اور جو اس صلاحیت کو کھو دیتی ہے وہ مٹ جاتی ہے. اس قانونِ "محو و اثبات" کو قرآن نے ایک جامع آیت میں بیان کر دیا ہے. جہاں فرمایا کہ

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝ (۱۳/۳۹)

خدا کا قانونِ مشیت یہ ہے کہ جو فرد یا قوم مٹنا چاہے اُسے مٹا دیا جاتے. جو ثبات و استحکام چاہے، اسے ثبات و تمکن عطا کر دیا جاتا ہے. اس کا یہ قانون کارگہ کائنات میں نافذ ہے اور اس کی اصل و بنیاد خود خدا کے پاس ہے (اس لئے کوئی اس میں تغیر نہیں پیدا کر سکتا).

یہ آیت ایک اور عظیم الشان حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے جس کا ذکر کرنا ضروری ہے. ہم گذشتہ اوراق میں دیکھ چکے ہیں کہ قانونِ ارتقاء کی رُو سے زندہ وہی رہ سکتا ہے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو. آگے وہی بڑھ سکتا ہے جس میں آگے بڑھنے کی استعداد ہو. یعنی وہ نوع جو کشمکشِ حیات میں ناسازگار قوتوں سے نبرد آزما ہو کر انہیں شکست دے اور یوں اپنے زندہ رہنے کا ثبوت پیش کرے وہ زندہ رہتی ہے لیکن جو ایسا نہ کرے وہ مٹ جاتی ہے. ڈارون نے اس اصول کو بقاء للاصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) سے تعبیر کیا ہے. (اگرچہ یہ الفاظ خود

ایک اہم حقیقت

ڈارون کے نہیں بلکہ ہربرٹ اسپنسر کے ہیں) لیکن ڈارون اور اس کے رفقاء سفر ان الفاظ سے جو مراد لیتے تھے وہ قرآنی مفہوم سے جداگانہ تھی. انیسویں صدی میں، یورپ کے علمائے طبیعیات کے نزدیک کائنات کا تصوّر میکانکی تھا[1]. اس تصوّر کی تشریح تو طول طویل ہے لیکن اس سے مختصر مفہوم یہ تھا کہ یہ کائنات کسی نہ کسی طرح وجود میں آگئی ہے اور اب خود بخود اپنی اندرونی قوتوں کے زور سے چلی جا رہی ہے. نہ اس کی تخلیق میں اور نہ اس کے بعد اس کے نشوو ارتقاء میں کسی مقصد، ارادہ یا اسکیم کو کوئی دخل ہے. ایک اندھی قوت (BLIND FORCE) ہے جس سے یہ تمام

---

[1] (MECHANISTIC CONCEPTION OF UNIVERSE) اس کی تشریح آئندہ چل کر ملے گی. اب خود یورپ اس تصوّر کو باطل قرار دے چکا ہے.

کارگہِ عالم حرکت میں ہے۔ لہٰذا جو نوع قوت حاصل کر لیتی ہے اُسے باقی رہنے اور آگے بڑھنے کے لئے چُن لیا جاتا ہے۔ ان علمائے طبیعیات کے نزدیک اس طریق کا نام "انتخاب طبیعی" (NATURAL SELECTION) ہے۔ عام الفاظ میں یوں سمجھئے کہ (اس نظریہ کی رُو سے) آج کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ اس لئے موجود نہیں کہ کسی مقصد یا اسکیم کے ماتحت اس کا موجود رکھنا ضروری تھا بلکہ اس لئے کہ ان میں کسی نہ کسی طرح باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی قوت پیدا ہو گئی اس لئے فطرت نے انہیں باقی رہنے کے لئے منتخب کر لیا۔ قرآنِ کریم، اس تصوّر اور نظریہ کو بنیادی طور پر غلط قرار دیتا ہے، اس کے نزدیک، یہ تمام سلسلۂ کائنات ایک خاص اسکیم (مقصد یا حکمت) کے ماتحت وجود میں لایا گیا ہے اور اسی مقصد کے ماتحت آگے بڑھ رہا ہے۔ لہٰذا جو چیز خدا کے قانون کے مطابق زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے اس کا زندہ رہنا اور آگے بڑھنا اس مقصد کے لئے مفید ہوتا ہے اور جو چیز اپنے اندر ایسی صلاحیت نہیں پیدا کرتی، اس کا اس مقصدِ عظیم کی راہ سے ہٹ جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ "وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝" کا مطلب یہی ہے کہ یہ قانونِ محو و ثبات یونہی اندھا دھند کام نہیں کر رہا۔ اس کے پیچھے ایک بلند مقصد ہے جس کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

اب رفتہ رفتہ خود علمائے مغرب اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ انیسویں صدی کا میکانکی تصوّر باطل تھا۔ اور وہ اس حقیقت کا اقرار کر رہے ہیں کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات ایک عظیم الشان مقصد کے ماتحت وجود میں لایا گیا ہے اور ایک اہم اسکیم کے ماتحت آگے بڑھ رہا ہے۔ (تفصیل ان امور کی آگے چل کر ملے گی) لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تمام سلسلۂ کائنات ایک لگے بندھے ضابطہ کے مطابق، ایک معیّن پروگرام کے ماتحت سرگرمِ عمل ہے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ یہ ایک گھڑی کے مانند ہے جسے اس کے خالق نے ایک مرتبہ کوک دیا اور اس کے بعد وہ ایک مرتّب شدہ نقشہ کے مطابق چلی جا رہی ہے۔ کائنات کے متعلق یہ تصوّر بھی قرآنی تصوّر کے خلاف ہے۔ قرآن کی رُو سے کائنات حرکیاتی ہے، سکونی نہیں۔ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۝ (۵۵/۲۹) "کائنات میں جو کچھ ہے سب اپنی نشوونما کے لئے خدا کی ربوبیت کا محتاج ہے۔ وہ قانون ان چیزوں کی نشوونما کرتا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر آن ایک نئی شان میں سامنے آتی ہیں۔ اس طرح کائنات میں مختلف تخلیقی اضافے ہوتے رہتے ہیں۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ایک ترکی شاعر کے الفاظ میں "کُن کے غُنّہ کی گونج ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہے۔" قرآن میں ہے۔

یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ (۳۵/۱)

خدا اپنی تخلیقات میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔

اس مقام پر (بر سبیلِ تذکرہ) ایک اور اہم حقیقت کی طرف اشارہ بھی بے محل نہ ہوگا۔ یہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ کائنات ایک متعیّن پروگرام کے مطابق ایک خاص مقصد اور اسکیم (حکمتِ بالغہ) کے ماتحت سرگرمِ عمل ہے۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس صورت میں جب کائنات کی ہر شے ایک خاص پروگرام کے مطابق عمل پیرا ہے انسان کو (جو خود کائنات ہی کی ایک شے ہے) مجبور ماننا جائے گا۔ لیکن (جیسا کہ آئندہ باب میں بیان ہوگا) انسان کو اختیار و ارادہ بھی دیا گیا ہے۔ اگر انسان اس پروگرام کے خلاف چلتا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے (یعنی تخلیقِ کائنات کے مقصد کے حصول کا پروگرام) تو اس کا اس عظیم الشان پروگرام پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ نظامِ کائنات اس خالقِ کائنات کے ہاتھوں میں ہے جس کے حیطۂ قدرت کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جبر و اختیار

البتہ اس سے انسان کی اپنی ذات، ارتقاء و عروج کے بجائے، پستی اور تنزّل کے جہنّم میں جا گرتی ہے۔ لیکن اگر یہ اس پروگرام کی تکمیل میں کوشاں ہوتا ہے تو اس پروگرام کی تکمیل سے خود اس کی اپنی ذات کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ہاتھ اُس کے ہوتے ہیں اور اُن میں قوّت، اللہ کی۔ تیر اس کے ہوتے ہیں اور ان کی انیوں کے ساتھ قضا مشیّت کی۔ وَ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (۸/۱۷) "جب تُو نے تیر چلایا تو وہ تُو نے نہیں چلایا۔ بلکہ درحقیقت خدا نے چلایا۔" یہ وہ مقام ہے جس کے متعلق ڈاکٹر ہنس ڈریش کہتا ہے کہ وہاں پہنچ "ہم اپنے آپ کو خدا کے سپاہی کہہ سکتے ہیں۔" (THE GREATEST DESIGN) اور علّامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

"اس ارتقائی تبدیلی کے طرق و نہج میں خدا خود بندہ کا رفیقِ کار ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ انسان اس میں سبقت کرے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (۱۳/۱۱)۔ لیکن اگر وہ اس باب میں سبقت نہیں کرتا۔ اگر وہ اپنی خودی کی مخفی قوّتوں کو بروئے کار نہیں لاتا۔ اگر وہ اُبھرنے والی زندگی کے اندرونی تلاطم کا احساس نہیں کرتا تو اس کی رُوح پتھر کی سی قساوت اختیار کر لیتی ہے اور وہ (انسان نہیں رہتا

بلکہ جامد مادہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔"

(خطبات تشکیل جدید، صفحہ ۱۱-۱۲)

جس جماعت کو ڈریشس نے "خدا کی سپاہ" کہا ہے یہ وہی ہے جسے قرآن کریم حزب اللہ کے ممتاز لقب سے تعبیر کرتا ہے۔

أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۵۸/۲۲)

ایک ضمنی گوشہ

سابقہ صفحات میں ضمنی طور پر لکھا گیا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے ایک وقت تھا کہ خود مادہ کا بھی وجود نہ تھا حدوث و قدم مادہ کا مسئلہ شروع سے بحث و جدل کا مرکز بنے چلا آ رہا ہے۔ شعورِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں سمجھ نہیں سکتا تھا کہ یہ محیر العقول مادی کائنات کس طرح عدم سے وجود میں آگئی۔ مادہ کہاں سے پیدا ہو گیا؟ لیکن مادہ کی حقیقت کے متعلق دورِ حاضرہ کی سائنس کی تحقیق کیا ہے؟ اس کے متعلق چند صفحات آگے چل کر، وحی کے عنوان میں واضح تصریحات سامنے آئیں گی۔ اس وقت صرف ایک اقتباس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ دورِ حاضرہ کا ماہر علم الافلاک؛ سر جیمز جینس لکھتا ہے۔

> دورِ حاضرہ کے علم طبیعیات کا رُجحان اس طرف ہے کہ یہ تمام مادی کائنات سوائے لہروں (WAVES) کے اور کچھ نہیں۔ یہ لہریں دو قسم کی ہیں۔ محصور لہریں (BOTTLED UP WAVES) جنہیں ہم مادہ کہتے ہیں اور آزاد لہریں جسے روشنی کہا جاتا ہے۔ فنائے مادہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ ان محصور لہروں کو آزاد کر دیا جائے کہ وہ فضا کی پہنائیوں میں منتشر ہو جائیں۔ ان تصورات کے ماتحت یہ تمام کائنات سمٹ سمٹا کر فقط "دنیائے نور" رہ جاتی ہے۔ مضمر یا مشہود۔ اس اعتبار سے تخلیق کائنات کی تمام داستان بالکل صحیح اور مکمل طور پر ان چند الفاظ میں بیان کی جا سکتی ہے کہ خدا نے نور (LIGHT) سے کہا کہ ہو جا (اور وہ ہو گیا)۔
>
> (THE MYSTERIOUS UNIVERSE)

سر جیمز جینس نے یہ بات آج سے کچھ سال پہلے کہی تھی۔ اب ایٹمی توانائی کی تحقیقات اور عملی تجارب

نے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح بے نقاب کردی ہے کہ جسے ہم مادّہ کہتے ہیں وہ درحقیقت کہربائی سالمات سے زیادہ کچھ نہیں۔ یعنی بجلی کی مثبت اور منفی قوت۔ اور جب اسے ایک قدم اور پیچھے لے جائیں تو یہ قوّت، توانائی محض (PURE-ENERGY) رہ جاتی ہے، جسے عالمِ خلق (دنیائے محسوسات) نہیں بلکہ عالمِ امر سے متعلق سمجھنا چاہیئے۔

خلاصۂ مبحث

یہ سوال کہ دنیا میں "سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود میں آگیا۔ ذہنِ انسانی کے لئے وجۂ ہزار حیرت واستعجاب رہا ہے۔ چنانچہ اُن مذاہب میں جن میں توہم پرستی نے حقائق کی جگہ لے رکھی ہے اور دنیا کا کونسا مذہب ہے جس میں ایسا نہیں ہوا)۔ اس عقیدے کے حل میں عجیب وغریب افسانہ طرازیوں سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اس کے متعلق جو کچھ بتایا ہے وہ ٹھیک ٹھیک وہی ہے جس کی طرف علم و بصیرت کے انکشافات راہ نمائی کئے جارہے ہیں۔ سائنس کے انکشافات کی رُو سے خاک کے ذرّے مختلف ارتقائی منازل طے کرکے، قرنہا قرآن کے بعد انسانی شکل میں متشکّل ہو گئے۔ یعنی سب سے پہلے کوئی ایک فرد صورتِ انسانی میں، جلوہ گر نہیں ہوا، بلکہ ایک نوع وجود پذیر ہوئی۔ ان متنوّع مراحل کی تفصیل قرآنِ کریم کی آیاتِ جلیلہ میں عجیب انداز میں سمٹی ہوئی ہے۔ لیکن قرآن کریم اس سے بھی ایک قدم اور آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں بلکہ یہ پیش خیمہ ہے آنے والی زندگی کا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ حیات اس کے نزدیک ایک جوئے رواں ہے جس کا خاتمہ موجودہ وادی میں نہیں ہو جاتا۔ انسان کی زندگی محض حیوانی زندگی نہیں بلکہ اس سے بلند وبالا ہے۔ اب اس انسانی زندگی (یعنی شرفِ انسانیت) کے ارتقاء کا سلسلہ شروع ہوگا۔ اس کے لئے قرآنِ کریم ایک مکمّل نظام عطا کرتا ہے جس کے تابع زندگی بسر کرنے سے اس شرفِ انسانیت میں بڑھنے پھیلنے اور پھولنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے جس سے یہ بتدریج بلندیوں کی طرف اُٹھتا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اجتماعی زندگی میں ہوتا ہے انفرادی طور پر نہیں۔

خود یورپ کے محقّقین ومفکّرین، جو انسان کے طبیعی ارتقاء کو حرفِ آخر سمجھا کرتے تھے اب رفتہ رفتہ

اس سے آگے بڑھ رہے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ ارتقائے طبیعی کے بعد اب ارتقائے نفسی کے مراحل آئیں گے۔ چنانچہ پروفیسر جوڈ لکھتا ہے:

انسانیت کے ارتقاء کی اگلی منزل طبیعی نہیں بلکہ نفسی اور ذہنی ہوگی۔ پہلے پہل انسان ارتقاء کی منزلیں طے کرکے حیوانیت سے انسانیت کے مقام میں آیا۔ پھر اس نے صنعت و حرفت کی مدد سے اپنے آپ کو آلات و اسباب سے آراستہ کیا۔ ہمارے اس دور میں انسان نے صنعت و حرفت میں پورا کمال حاصل کر لیا ہے۔ اب اس کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے اور جس طبیعی ارتقاء نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ حیوان سے ترقی کرکے انسان کے درجے میں قدم رکھے۔ پھر اس کی جبلّی ضرورتوں نے اس سے اوزار و آلات بنوائے اور وہ مشین اور سٹیم کا خالق بنا۔ اسی طرح وہ آج مجبور ہے کہ اپنا قدم آگے بڑھائے۔ اور اس کا یہ قدم مادی نہیں بلکہ نفسی اور ذہنی ترقی کی طرف ہوگا[1]

لیکن یہ ترقی، وحی کے بغیر ممکن نہیں۔

○

---

[1] پروفیسر جوڈ کا یہ مضمون "ہندوستان ٹائمز" میں شائع ہوا تھا اور اس کے بعد اس کا ترجمہ ماہنامہ "کتاب" نے چھاپا تھا۔

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۲/۳۰

آدمؑ

(نمایندۂ آدمیّت)

خُودگرے خُودشکنے خُودنگرے پیدا شُد

آدمؑ

(۲)

حُسن کے ذوقِ نمود نے انگڑائی لی۔ خطیرۂ قدس کی ملکوتی فضا میں ہلکا سا تموّج پیدا ہوا۔ ملاءِ اعلیٰ کے حریمِ ناز کے حریری پردوں میں غیر محسوس سی جنبش نظر آئی۔ بربطِ عدم کے خاموش تاروں میں نورانی ارتعاش سا محسوس ہوا۔ فرشتوں کی معصوم سی نگاہیں اُدپر کو اٹھیں اور "سُبُّوحٌ۔ قُدُّوسٌ" کی بے صوت صدائیں، نور و نکہت کے رنگین ترشح کی صورت میں زمزمہ ریز و نغمہ بار ہوئیں۔ دُور جانبِ عرشِ عظیم سے "کُن" کی تخلیقی آواز نے اس طلسمِ سکوت کو توڑا۔ عدم کے پردے اُٹھنے لگے اور اُفق کے اس پار، عالمِ امر سے نگار خانۂ کائنات نے خاموشی سے اُبھرنا شروع کیا۔ سائنسدان نے اسے حرکت و حرارت سے تعبیر کیا۔ فلسفی نے اسے حلقۂ دامِ خیال قرار دیا۔ صوفی نے جلوۂ یکتائی محبوب کہا۔ اربابِ قضا و قدر نے ایک متعین پروگرام کا نقطۂ اوّلیں بنایا۔ اور قرآن نے امرِ تکوین کا کرشمۂ ایمان افروز نام رکھا جسے قلبِ سلیم نے قانونِ مثبت مان کر سر جھکا دیا۔

ہیولائے کائنات اُبھرنے کو تو اُبھرا لیکن بڑا بے کیف اور بہت بے رنگ۔ آہستہ آہستہ اس کے بکھرے ہوئے ذرّوں میں ربط و ضبط پیدا ہونا شروع ہوا۔ ربط و ضبط سے اس خاکہ میں کچھ رنگینیوں کے آثار محسوس ہونے لگے۔ منتشر رنگینیوں نے آہستہ آہستہ ایک نقطہ پر مرکوز ہونا شروع

کیا۔ بکھری ہوئی شوخیاں سمٹ کر بجلیاں بننے لگیں۔ جنّت کی حوروں نے کن انکھیوں سے باہم اشارے کئے۔ نوامیسِ فطرت کی نگاہوں میں ہلکا سا تبسم پیدا ہوا۔ حریم قدس کے رازداروں نے کانوں ہی کانوں میں کچھ سنا۔ زمین کانپی۔ آسمان تھرتھرایا۔ چاند کا ساغرِ زرّیں چھلک گیا۔ ستاروں کے نغمے سے دل دہل گئے۔ فضا میں ایک شور اٹھا اور :-

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد ۔۔۔ حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور ۔۔۔ خودگرے، خود شکنے، خودنگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل ۔۔۔ حذر اے پردگیاں! پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بآغوشِ حیات ۔۔۔ چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

حوروں نے نغمۂ تبریک گایا۔ فرشتوں نے سر جھکایا۔ ارض و سماوات نے اپنی باج گزاری کا خریطہ پیش کیا۔ ابلیس نے مقابلہ کا چیلنج دیا۔ اور یوں یہ عالمِ بے کیف، دنیائے رنگ و بو اور جہانِ سوز و ساز بن گیا۔ اب درحقیقت اس پروگرام کی پہلی منزل شروع ہوئی جس کے پیشِ نظر عالمِ جمادات سے لے کر پیکرِ انسانی تک کے ارتقائی مراحل قرنہا قرن کے عرصۂ دراز میں طے ہوئے تھے۔ اب وہ مقام آگیا جہاں انسان تخاطب کے قابل ہو گیا۔ جہاں اسے سمع و بصر، شعور و ادراک، ارادہ و اختیار عطا کر کے ھُوَ (وہ) کے بجائے (کُمْ)[1] تم سے خطاب کیا گیا۔ یہ تو ہم پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ انسان کی پیدائش کس طول طویل سلسلۂ ارتقار کے ماتحت واقع ہوئی ہے اور اس سلسلۂ ارتقار کے بعد کسی ایک فرد کی تخلیق نہیں ہوئی بلکہ ایک نوع کی تخلیق ہوئی جسے نوعِ انسانی کہا گیا ہے۔ لہٰذا آدم سے یہ مراد نہیں کہ وہ "سب سے پہلا انسان" تھا جو کسی نہ کسی طرح یونہی بنا دیا گیا تھا اور اس سے پھر نسلِ انسانی آگے بڑھی بلکہ آدم سے مراد آدمی

---

[1] سابقہ عنوان میں ۳۲/۹ ملاحظہ کیجئے "نفخ روح" سے پہلے تمام ارتقائی منازل میں انسان کے لئے ھُوَ (ضمیرِ غائب) استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً (سوا ہ) وغیرہ۔ لیکن نفخ روح کے فوری بعد یہ ضمیر غائب، مخاطب (کُمْ) سے بدل گئی ہے۔ وجعل لکم السمع گویا اب انسان تخاطب کے قابل ہو گیا۔

آدم سے مُراد! (THE MAN) ہے۔ قصۂ آدم خود آدمی کی سرگذشت ہے نہ کہ کسی خاص فرد کی داستانِ زندگی۔ "بابا آدم اور اماں حوّا" کا تصور بائبل کا تصور ہے قرآن کا نہیں۔ قرآن نے آدمی کی سرگذشت کو تمثیلی رنگ میں بیان کیا ہے تاکہ مجرّد حقیقتیں، تشبیہات کے لباسِ مجاز میں سامنے آسکیں۔

آغازِ داستان قرآن کریم کا پہلا ورق الٹئے اس عظیم المرتبت کتاب کی غرض وغایت اور انسانوں کی تین جماعتوں (متقین، کفار اور منافقین) کے اجمالی تذکرہ کے بعد سرگذشتِ آدم کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّى جَاعِلٌ فِى ٱلْأَرْضِ خَلِيفَةً (۲/۳۰)

اور جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

لفظ خلیفہ کی تشریح، اس عنوان کے آخر میں ملے گی۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ اس سے مراد "خدا کا خلیفہ" نہیں اس سے مطلب سابقہ آبادی یا نوع کا جانشین ہے۔ "خلیفۃ اللہ" قرآن میں کسی کو نہیں کہا گیا۔

انسان سے پہلی انواع میں (ہم دیکھ چکے ہیں کہ) اختیار و ارادہ کی قوت نہیں تھی۔ سلسلۂ ارتقاء میں یہ پہلی کڑی تھی جسے اختیار و ارادہ دیا گیا تھا۔ باقی کائنات (جسے اختیار و ارادہ حاصل نہیں) بلاچون و چرا قانونِ خداوندی کے مطابق اپنے اپنے مفوضہ فرائض کی تکمیل میں سرگرمِ عمل ہے۔ لیکن انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو قانونِ خداوندی کی اطاعت کرے اور چاہے تو اس سے سرکشی اختیار کر لے۔ قانونِ خداوندی سے سرکشی کا نتیجہ، فساد کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ لٰہذا کائنات کی قوتوں (ملائکہ) نے کہا کہ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ ٱلدِّمَآءَ (۲/۳۰) کیا اب دنیا میں ایک ایسی مخلوق کو پیدا کیا جائے گا جو اس میں فساد انگیزیاں اور خون ریزیاں برپا کر دے گی؟ اس کے برعکس، ہماری یہ حالت ہے کہ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (۲/۳۰) ہم ہمیشہ تیرے پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل رہتے ہیں جس کے نتائج دیکھ کر ہر دیدۂ بینا مصروفِ حمد و ستائش ہو جائے اور اس میں جتنی دُور تک بھی ہمیں جانا پڑے، جاتے ہیں؛ کبھی تھکتے ہی نہیں۔

خلّاقِ فطرت کے چہرۂ جمال آگیں پہ ایک حسین سی ہنسی برقِ طور بن کر لہرا گئی اور ارشاد ہوا کہ

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲/۳۰)

میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

استحقاقِ خلافت

استحقاقِ خلافت کے لئے تسبیح و تقدیس ہی کافی نہیں، اس کے لئے اور بھی بہت کچھ درکار ہے۔ بقول اقبالؒ:۔

مقامِ بندگی دیگر مقامِ عاشقی دیگر
زنوری سجدہ می خواہی زخاکی بیش ازیں خواہی

کائنات کی قوتیں، اس مشینری کو خدا کے حکم کے مطابق چلا سکتی ہیں۔ اس کے حُسن میں خود کوئی اضافہ نہیں کر سکتیں۔ وہ خدا کے حکم کی فرماں پذیر ہو سکتی ہیں، اس کی رفیق نہیں بن سکتیں۔ یہ مقام صرف انسان کے لئے مختص ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے یہ کیا گیا کہ

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ......
وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ (۳۱-۲/۳۳)

اور اس نے آدم کو علم الاشیاء عطا کر دیا۔ پھر ان اشیاء کو ملائکہ کے سامنے رکھا اور کہا اگر تم (اپنے دعوئے استحقاقِ خلافت میں) سچے ہو تو ان کی خاصیت و ماہیت کے متعلق مجھے بتاؤ۔ انہوں نے (سر جھکا لیا اور) عرض کیا کہ (بارِ الٰہا!) ہم تو صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنے کا علم تُو نے ہمیں دیا ہے۔ اس سے زیادہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ بے شک تُو ہی سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس نے آدم سے کہا کہ تو اس سے ملائکہ کو مطلع کر دے۔ سو جب اس نے ایسا کر دیا تو (اللہ نے ملائکہ سے) کہا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں پستیوں اور بلندیوں کی تمام غیب کی باتوں سے واقف ہوں اور تمہاری بارز اور مستتر صلاحیتوں سے بھی۔

یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ آدم کو اسماء (NAMES) کا علم دیا گیا۔ اس میں ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ علم کا پہلا درجہ (PERCEPTUAL) ہوتا ہے۔ یعنی وہ علم جو حواس (SENSES) کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ قرآن نے اس علم پر بھی بڑا زور دیا ہے۔ وہ سمع و بصر سے کام لینے کی اہمیت

کو بار بار اجاگر کرتا ہے. لیکن اس سے آگے علم کا وہ درجہ ہے جسے (CONCEPTUAL) کہتے ہیں.
یعنی مدرکات (PERCEPTION) سے تصوّرات (CONCEPTS) متعیّن کرنا. یہ حصہ خالص
انسانی سطح زندگی پر حاصل ہوسکتا ہے. جہاں تک تصوّرات اور اسماء کا تعلق ہے، اسے سمجھ لینا
چاہیئے کہ کوئی تصوّر ذہن میں نہیں آسکتا جب تک اس کے لئے لفظ (اسم) موجود نہ ہو. اور کوئی لفظ بغیر
تصوّر کے وجود پذیر نہیں ہوسکتا. اسماء اور تصوّرات کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے. اس کے لئے

علم الاشیاء کی بخشش

ہمارے زمانے میں (SEMANTICS) میں بہت کچھ لکھا
جاچکا ہے. بہرحال قرآن نے یہ بتایا ہے کہ آدم کو تصوّراتی علم
(CONCEPTUAL KNWLEDGE) کی صلاحیّت دی گئی. یہ وہ خصوصیت تھی جس کے سامنے
ملائکہ (کائنات کی مختلف قوّتوں) کا سر جُھک گیا.

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۗ
اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ٭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۲/۳۴)

اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کے سامنے جُھک جاؤ تو وہ سب کے سب جُھک
گئے. لیکن ابلیس نہ جھکا، اس نے سرکشی برتی. اس نے استکبار کیا اور وہ نہ ماننے
والوں میں سے تھا.

ملائکہ نے اپنا سرِ تسلیم خم کردیا. قوائے ملکیّہ کی فطرت میں جُھک جانا ہے. ان کی خصوصیّت طاعت و
انقیاد، تسلیم و رضا ہے. اس کے برعکس قوّتِ ابلیسی کی شعلہ مزاجی کی فطرت میں سرکشی و استکبار
ہے. قوانینِ الٰہیّہ کے سامنے جُھک جانا اسلام اور ان سے اعراض و سرکشی برتنا کفر ہے. وَ كَانَ
مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ [ملائکہ اور ابلیس کی تفسیر آگے چل کر ملے گی]. اس مقام پر صرف اتنا سمجھ
لینا چاہیئے کہ اگر انسان قانونِ فطرت سے آگہی حاصل کرلے تو یہ فطرت کی قوّتوں کو مسخّر کرسکتا ہے. لیکن
خود اس کے اپنے جذبات (اگر انہیں وحی کے تابع نہ رکھا جائے) تو وہ سرکشی اختیار کرلیتے ہیں. وہ ملائکہ
ہیں. اور یہ ابلیس (یا شیطان).

یہ پہلی خصوصیّت ہے جس کی وجہ سے آدم کو ملائکہ پر شرف حاصل ہے. اس کے بعد دوسری

دوسری خصوصیت۔ اختیار و ارادہ

خصوصیت کا تذکرہ فرمایا۔ یعنی اختیار و ارادہ۔ اشیائے کائنات کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (۴۹-۵۰/۱۶) (نیز ۱۸/۲۲)

اور آسمانوں (بلندیوں) میں جس قدر چیزیں ہیں اور زمین (پستیوں) میں جس قدر جاندار اور ملائکہ ہیں، سب قوانینِ خداوندی کے سامنے سربسجود ہیں اور وہ سرکشی نہیں کرتے اپنے پروردگار کے قانونِ ربوبیت سے ڈرتے ہیں جو ان کے اوپر موجود ہے اور جو کچھ انہیں حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں!

اختیار و ارادہ کی سحر کاریاں

یہاں انسان اور دیگر اشیاء کائنات کا فرق ظاہر ہو گیا۔ یہ انسان کا اختیار و ارادہ ہے جس سے یہ دیگر اشیائے کائنات سے ممتاز اور متمیز ہے۔ انسان کے سوا کسی اور مخلوق میں یہ قوت ہی نہیں کہ وہ جس نہج و اسلوب پر چلنے کے لئے پیدا کی گئی ہے اس سے سرکشی و انحراف اختیار کرے۔ (كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ ۝) لیکن انسان میں سجدہ ریزی اور سرکشی دونوں کی قوتیں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں۔ یہی قوت اس کی سرفرازی و سربلندی کا باعث ہے۔ اسی سے مسجودِ ملائک اور مخدومِ خلائق ہے۔ کش مکشِ حیات میں پُرکیف جاذبیتیں ہیں تو اسی سے اور کشاکشِ زندگی میں رنگین کیفیتیں ہیں تو اسی کے دم سے۔ بربطِ ہستی کے تاروں میں خوابیدہ نغمے بیدار ہوتے ہیں تو اسی مضراب سے، اور مینائے حیات کے سادہ پانی میں کیفِ رنگ و تعطر کی ارغوانی موجیں اٹھتی ہیں تو اسی کے جوش سے۔ سینۂ کائنات میں ایک دھڑکنے والا دل ہے تو اسی کے تموج سے اور اگر اس دل میں مچلنے والی آرزوؤں کی رسیلی بجلیاں ہیں تو اسی تحرک سے۔ غرضیکہ انسان، انسان ہے تو اسی کی بدولت اور یہ دنیا، دنیا ہے تو اسی کے صدقے۔ اگر یہ اختیار و ارادہ نہ ہوتا تو انسان پتھر کا بُت ہوتا، یا اشیائے کائنات میں سے کوئی عام شے۔ مسجودِ ملائک و مسخرِ کائنات کبھی نہ ہوتا۔ قصۂ آدم کا پہلا باب اسی اختیار و ارادہ کے مظاہرے سے شروع ہوتا ہے جو معصیتِ آدم کی شکل میں

سامنے آتا ہے. نیکی وہی نیکی ہے جو بدی کی قدرت رکھتے ہوئے عمل میں آئے. اطاعت وہی اطاعت ہے جو سرکشی کی استطاعت کے باوجود سرزد نہ ہو. نیازمندی اسی کی قابلِ ستائش ہے جو خود سراپا ناز ہو. اسی سر کے جھکنے میں لذت ہے جس کی پیشانی میں دنیا بھر کی سرفرازیاں جھلک رہی ہوں. جس میں انتقام کی قوت نہیں اس کے عفو میں کیا خوبی ہے. جس میں ہمسری کی ہمت نہیں اس کا جُھک کر سلام کرنا خوئے غلامی ہے. جس کے پاؤں تلے تختِ حکومت نہیں اس کا بوریہ نشین ہونا گداگری ہے. اختیار رکھتے ہوئے خود پر کنٹرول رکھنا ہی انسانیت کا شرفِ اجتبار ہے. اسی سے اس کی خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور استحکامِ خودی ہی انسانیت کی معراج ہے. نظریۂ ارتقاء میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس

آگے بڑھنے کی صلاحیت

کی کیا وجہ ہے کہ بعض حیوانات جس مقام میں تھے وہیں ٹھٹھر کر رہ گئے، آگے نہیں بڑھ سکے اور بعض ارتقائی منازل طے کرتے کرتے بہت دُور آگے نکل گئے. عروجِ ارتقاء کن کے حصے میں آیا اور جمود و تعطّل کن کے مقدر میں تھا؟ اس باب میں ماہرینِ فن کی تحقیق یہ ہے کہ ہر وہ نوع جسے اپنی بقاء (یعنی ارتباطِ جسم و جان) کے لئے کسی خاص تگ و دو کی ضرورت نہ پڑی وہ بیکار ہو کر رہ گئی. مثلاً جو نوع کسی ایسے مقام میں آباد تھی جہاں اشیائے خورد نوش کی فراوانی تھی. کسی قسم کا خوف و خطر نہ تھا. جہاں

نے تیر کماں میں تھا نہ صیاد کمیں میں!

وہ نوع یا تو رفتہ رفتہ مٹ گئی یا منجمد ہو کر رہ گئی. آگے نہیں بڑھ سکی. لیکن اس کے برعکس جس نوع کو اپنی بقا اور حفاظت کے لئے تگ و تاز کی سراپا حرکت زندگی بسر کرنی پڑی. جس کا ہر لمحہ کشِ مکشِ حیات میں گزرا، جسے یمِ زندگی کے ساحل پر لہروں کی موسیقی میں جذب ہو کر رہ جانے کے بجائے تلاطمِ دریا میں موجوں سے ہم آغوش ہونا پڑا. اس میں باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیتیں پیدا ہو گئیں اور اسی نے ارتقائی منازل طے کیں. چونکہ انسان کی تخلیق کا مقصد ہی اسے ارتقائی منازل طے کرا کر آگے بڑھانا تھا اس لئے خارجی دنیا کی کش مکش کے علاوہ خود اس کے قلب کی دنیا کو ایک کش مکش کی آماجگاہ بنا دیا. جس میں ہر وقت اور ہر آن خیر و شر کی نبرد آزمائی اور اہرمن و یزداں کی ستیزہ کاری وجہ گرمیٔ حیات رہے. یہی کش مکش پیہم اور کشاکشِ مسلسل ہے جو اس کی شمشیرِ خودی کے لئے فساں اور جوہرِ انسانیت کے لئے سامانِ بالیدگی ہے. صرف انسان اپنی ذات ہی کے لئے وجہ بالیدگی نہیں بلکہ کائنات

ہیں حسین ندرت کاریوں کے اضافے بھی انسان کے اختیار و ارادے ہی کے رہینِ منت ہیں. باقی مخلوق، خدا کی بنائی ہوئی کائنات کو چھیڑتی نہیں. لیکن انسان کی یہ حالت ہے کہ بقول علامہ اقبالؒ

گفت یزداں کہ چنیں است و چناں خواہد ماند
گفت آدم کہ چنیں ہست و چناں خواہد بود

جو کچھ ہے (WHAT IS) کو جو کچھ ہونا چاہیئے (WHAT OUGHT TO BE) بنا دینے کا جذبہ انسان ہی کے سینے میں پنہاں ہے. اس میں شبہ نہیں کہ خود کائناتی قوانین کے مطابق بھی کائنات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں. اس طرح پوری کی پوری کائنات ارتقائی منازل طے کئے جا رہی ہے. لیکن یہ تبدیلیاں (قرآن کے الفاظ میں) ایسے ایسے طویل المیعاد منازل (PERIODS) کے بعد ہوتی ہیں جن میں سے ایک ایک منزل (یوم) ہزار ہزار اور پچاس پچاس ہزار سال کی ہوتی ہے. لیکن اس کائناتی قانون کے ساتھ جب انسان کی رفاقت شامل ہو جاتی ہے تو یہ تبدیلیاں دنوں کے اندر واقع ہو جاتی ہیں. اس لئے کہ انسان ان تبدیلیوں کو اپنی عمر کے پیمانوں کے مطابق ظہور میں لاتا ہے. خدائی پیمانوں کے مطابق نہیں لاتا.

یہ سب کچھ انسان کے اختیار و ارادہ کی قوت سے ہوتا ہے. اسی لئے قرآن کریم نے انسان کی خصوصیت علم الاشیاء کے ساتھ ہی اس خصوصیت کا بھی ذکر کر دیا جس کی رُو سے یہ معصیت و قانون شکنی کا بھی اختیار رکھتا ہے.

وَقُلْنَا يَاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ص وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ٥ (۲/۳۵)

اور ہم نے کہا کہ اے آدم! تو اور تیری بیوی (یعنی مرد اور عورت دونوں) جنت میں رہو اور اس میں جہاں سے جی چاہے بافراغت کھاؤ (پیو) لیکن اس شجر کے قریب نہ جانا ورنہ ظالمین میں سے ہو جاؤ گے.

یہ جنت کہاں تھی جس میں آدم کو رکھا گیا تھا؟ وہ شجر کونسا تھا جس کے پاس جانے سے اسے روکا گیا تھا؟ اس کے قریب جانے سے ان میں کس قسم کی کمی آجاتی تھی. (ظلم کے معنی کمی کے بھی ہیں) ان نکات کی تشریح ذرا آگے چل کر ملے گی. اس مقام پر صرف اتنا دیکھ لینا کافی ہے کہ خدا نے حکم دیا کہ یہ کام نہ کرنا. اس کے بعد

کیا ہوا؟

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ص (۲/۳۶)

اس کے بعد شیطان نے انہیں پھسلا دیا اور اس طرح وہ جس (جنتی کیفیت) میں تھے وہاں سے انہیں نکال دیا۔

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ ہبوط۔ آدم نیچے گر گیا۔ ارتقاء میں عروج و بلندی ہے، جمود میں سکون، اور ہبوط میں زوال و انحطاط۔ انسان عروج وارتقاء کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ جمود یا انحطاط کے لئے نہیں۔ لیکن جب یہ قانونِ خداوندی سے سرکشی برتتا ہے تو یہ بلند ہونے کے بجائے پستی کے گڑھوں میں گر جاتا ہے اور اس کی کیفیت حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ اس کش مکش کی رزمگاہ ارضی زندگی ہے۔ جس میں اس کے لئے قیام اور تمتع ہے۔

وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ٥ (۲/۳۶)

ہم نے کہا کہ (اس مقام) سے نیچے گر جاؤ (کیونکہ سرکشی کا یہی نتیجہ ہے) تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اب تمہارے لئے زمین میں ایک وقتِ معین تک کے لئے ٹھکانہ اور سامانِ زیست ہے۔

ہبوط میں کس طرح ایک انسان اور دوسرے انسان میں بیگانگی اور مغایرت آجاتی ہے۔ (عداوت کے یہی معنی ہیں) اور ارض میں مستقر اور متاع کا مفہوم کیا ہے۔ یہ چیزیں چند صفحات آگے چل کر سامنے آئیں گی۔ اس وقت یہ دیکھئے کہ کیا ایک بار کی لغزش کا نتیجہ ابدی ہلاکت ہو گیا یا اس کے بعد بازآفرینی کی صورت بھی باقی رہی؟ قرآن کہتا ہے کہ ایسا نہیں۔ آدم ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ نہیں ہو گیا۔

بازآفرینی

فَتَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ٥ (۲/۳۷)

اس کے بعد آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے اور یوں سیدھی راہ کی طرف پھر لوٹا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اللہ بھی اس کی طرف لوٹ آیا۔ (اس کے قانونِ مکافات نے بازآفرینی کی راہیں اس کے لئے کشادہ کر دیں)۔ کیونکہ بازآفرینی کے لئے سامانِ نشوونما

عطا ہو جانے کی گنجائش اس کے قانونِ ربوبیت میں موجود ہے۔

لیکن یہ باز آفرینی اب اس مقام میں جس مقام میں آدم گر گیا ہے، قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوگی۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا (۲/۳۸)

ہم نے کہا کہ اس مقام سے تو (بہرحال اب) سب کو نیچے گرنا ہوگا۔

اس پستی سے اُبھرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ (۲/۳۸)

ہماری طرف سے تمہارے پاس ہدایت پہنچا کرے گی۔ سو جو شخص میری ہدایت کا اتباع کرے گا تو انہیں کسی قسم کا خوف اور غم نہ ہوگا۔

فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کی صورت

ہلاکت اور بربادی سے مصئون رہنے کی ایک ہی صورت ہوگی اور وہ یہ کہ زندگی قوانینِ الٰہیہ کے تابع بسر کی جائے۔ اگر ان قوانین کی تکذیب و انکار کی روش اختیار کی تو ہلاکت کا جہنم سامنے ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ٥ (۲/۳۹)

اور جو لوگ ہمارے قانون سے انکار کریں گے اور اس کی تکذیب پر اُتر آئیں گے تو یہ لوگ جہنم کے رہنے والے ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

آیاتِ متذکرہ بالا میں کئی ایک اہم نکات ہیں جن کی تشریح اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔ مثلاً خلیفہ۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ علم الاشیاء۔ جنت۔ ظالم۔ توبہ۔ اصحاب النار وغیرہ۔ لیکن یہاں ایک چیز قابلِ غور ہے۔ لغزشِ آدم تک "آدم اور اس کی بیوی" کا ذکر ہے جن کے لئے عربی زبان کے قاعدے کے مطابق افعال و ضمائر تثنیہ (دو) آئے ہیں۔ لیکن اس کے بعد وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا

بَعْضُكُمْ ۔ وَ لَكُمْ ۔ جَمِيْعًا ۔ يَأْتِيَنَّكُمْ ۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ۔ يَحْزَنُوْنَ ۔ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا ۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ ان سب میں تثنیہ کے

قصۂ آدم، خود انسان کی سرگذشت ہے

بجائے جمع کے صیغے ہیں اور خطاب تمام نوعِ انسانی سے ہے۔ لہٰذا قصۂ آدم کسی ایک "میاں بیوی" کا واقعہ نہیں بلکہ خود انسان کی سرگزشت ہے۔ دیگر آیات میں یہ نکتہ اور بھی کھلے کھلے الفاظ میں واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً سورۃ اعراف میں ہے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ○ (۷/۱۱)

اور (دیکھو) ہم نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تمہیں بہترین صورت عطا کر دی۔ پھر ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جُھک جاؤ اس پر سب جُھک گئے بجز ابلیس کے کہ وہ جھکنے والوں میں سے نہ تھا۔

دیکھئے! یہاں نوعِ انسانی کی تخلیق اور صورت گری کے بیان کے بعد قصۂ آدم شروع کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آدم اس مقام کا مظہر ہے جہاں زندگی درجۂ حیوانیت سے نکل کر دائرۂ انسانیت میں پہنچی اور جہاں سے انسان کی تمدنی زندگی کی ابتدا اور کش مکشِ حیات کا آغاز ہوا۔ اس مقام میں سب سے پہلے ہمارے سامنے ابلیس و آدم کی کشمکش آتی ہے۔ اس کشمکش سے مراد کیا ہے اس کی تفصیل ابلیس کے عنوان میں آئے گی۔ سردست اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ملائکہ سے مراد فطرت کی قوتیں ہیں جنہیں انسان جب جی چاہے مسخر کر سکتا ہے۔ لیکن ابلیس سے مراد اس کے وہ جذبات ہیں جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کر لیں تو انہیں شیطان یا ابلیس سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ قرآن کریم میں متعدد مقامات میں بتایا گیا ہے کہ "آدم اور اس کی بیوی" جنت کی زندگی کرتے تھے کہ شیطان نے انہیں معصیت پر آمادہ کر دیا۔ اور وہ اس زندگی سے نکل کر پست سطح پر آگئے۔ اس مقام پر آدم سے کہا گیا۔

لے دیکھئے (۱۳ — ۷/۱۹)؛ (۲۰ — ۷/۲۴)

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ○ (۲۴ — ۷/۲۵)

فرمایا (بہرحال) یہاں سے سب نکل جاؤ (یا اس مقام سے نیچے گرجاؤ) تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اب تمہارے لئے زمین میں ٹھکانا ہے۔ اور ایک وقتِ خاص تک کے لئے وہاں سامانِ زندگی سے فائدہ حاصل کرنا۔ (پھر) کہا کہ تم اسی (زمین) میں زندگی بسر کروگے۔ اسی میں مروگے اور (پھر مرنے کے بعد) اسی میں سے (دوبارہ) نکالے جاؤگے۔

مزید وضاحت

سورۂ اعراف کی آیات (۱۱ — ۷/۲۵) پر پھر غور کیجئے۔ ابتدا میں نوعِ انسانی کی تخلیق کا ذکر ہے۔ (خَلَقْنٰكُمْ وَصَوَّرْنٰكُمْ) پھر آدم کے لئے سجدہ۔ اس کے بعد ابلیس کا انکار اور چیلنج۔ لیکن چیلنج کے مخاطب صرف آدم اور اس کی بیوی (تثنیہ) نہیں بلکہ جمع کا صیغہ ہے (لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ۔ خَلْفِهِمْ وغیرہ) نہ صرف ابلیس، بلکہ خود اللہ تعالےٰ کی طرف سے بھی جواب میں انسانوں کے متعلق جمع ہی کا صیغہ ہے (فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ ......)۔ اس کے بعد آدم اور اس کی بیوی کا ذکر ہے۔ جن کے لئے تثنیہ کا صیغہ آیا ہے۔ لیکن آخر میں جہاں ہبوط کا ذکر ہے وہاں پھر صیغہ جمع ہے (آیات ۲۴ — ۲۵) اس سے ظاہر ہے کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے) قصۂ آدم نوعِ انسانی کا تذکرہ ہے نہ کسی ایک میاں بیوی کی سرگذشت۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ سورۂ بقرہ میں ہبوط کے بعد فرمایا تھا کہ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى...... (۲/۳۸)۔ سورہ اعراف میں بنی آدم کو خاص طور پر مخاطب کرکے کہا گیا ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ...... اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (۳۵ — ۷/۳۶)

اے بنی آدم! میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں گے اور وہ میرے قوانین تمہارے سامنے پیش کریں گے۔ سو جو کوئی اپنے آپ کو (اُن قوانین کی) حفاظت میں لے آئے گا اور (یوں اپنے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کرلے گا تو ان لوگوں کو کسی قسم کا خوف اور غم نہیں ہوگا لیکن جو لوگ میرے قوانین کی تکذیب کریں گے اور ان سے سرکشی

اختیار کریں گے تو اُن کی صلاحیتیں جُھلس کر رہ جائیں گی اور وہ ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے۔

اس سے واضح ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت (۲/۳۰) میں بھی بنی آدم ہی مقصود ہیں۔

سورۂ حجر میں اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں آئی ہے۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ (۲۸-۲۹/۱۵)

اور جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں خمیر اٹھے ہوئے گارے سے جو سُوکھ کر بجنے لگتا ہے بشر پیدا کرنے لگا ہوں۔ سو جب اُسے میں درست کر دوں (یعنی وہ تکمیل تک پہنچ جائے) اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے سامنے جُھک جانا۔

یہاں کسی شُبہ کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ مسجودِ ملائک وہی بشر ہے جسے مٹی سے پیدا کیا تھا (اور جس کی تشریح سابقہ عنوان میں گزر چکی ہے) اس کے بعد انکارِ ابلیس کی سرگزشت ہے جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ (دیکھئے آیات ۳۰-۴۴/۱۵)۔ ان آیات میں بھی ضمائر کا استعمال قابلِ غور ہے۔ ابتدا میں بشر کا ذکر ہے اور ضمیر واحد غائب کی ہے لیکن جب ابلیس چیلنج دیتا ہے تو ضمائر جمع غائب کی شروع ہو جاتی ہیں۔ جن سے واضح ہے کہ مقصود تمام نوعِ انسانی ہے۔ اس باب میں سورۂ صٓ کی آیات (۷۱-۸۵/۳۸) بھی غور طلب ہیں۔ نیز آیات (۶۱-۶۵/۱۷)؛ (۱۱۶-۱۲۲/۲۰)۔

جنّت اور دُنیا کی زندگی

اتنا سمجھ لینے کے بعد کہ یہ قصّہ کسی خاص میاں بیوی کا نہیں بلکہ نوعِ انسانی کی سرگذشت ہے۔ ان مقامات کا صحیح مفہوم بھی سمجھ لیجئے جنہیں قرآنِ کریم نے تمثیلی رنگ میں بیان کیا ہے۔ سب سے پہلے دیکھئے کہ اس میں جنت سے کیا مراد ہے؟ سورۂ بقرہ میں اس کے متعلق فرمایا تھا۔ فَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵)۔ اس میں سے جہاں سے جی چاہے بافراغت کھاؤ (پیو)۔ سورۂ طٰہٰ میں کہا اس میں نہ بھوک ہوگی نہ برہنگی، نہ تشنگی نہ سورج کی جھلس دینے والی تپش (۱۱۸-۱۱۹/۲۰)۔ یعنی انسان کی طبعی زندگی کے لئے جس سامانِ

معیشت کی ضرورت ہے اس کی فراوانی. اور اس "جنت" سے باہر نکلنے کا نتیجہ کیا ہوا؟ اسی سامانِ معیشت (خوراک، لباس، مکان) کے حصول کے لئے سخت مشقت اٹھانی پڑی. یعنی وہ سامانِ نشو ونما جو حیوانات تک کے لئے اس آسانی سے میسر آجاتا ہے، انسان کو اس سامان کے حصول کے لئے بھی جانکاہ مشقتوں سے گزرنا پڑے گا. (فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى) آدم جنّت کی زندگی کھو بیٹھا. اور اسے ان تمام مشقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا. اب ان مشقتوں سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟ (فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (۲۰/۱۲۳) جو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کا اتباع کرے گا تو نہ تو اس کی محنت رائیگاں جائے گی اور نہ ہی وہ مشقت میں پڑے گا یعنی اُسے بھوک اور پیاس تشنگی اور خستگی کے مصائب سے نجات مل جائے گی. اس کے برعکس؛

وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ٥ (۲۰/۱۲۴)

جو میرے قوانین سے اعراض برتے گا تو اس کی معیشت تنگ کر دی جائے گی اور قیامت کے دن بھی وہ اندھا اٹھایا جائے گا.

یعنی قوانینِ الٰہیہ کا لازمی نتیجہ خوش حالی اور اسبابِ معیشت کی فراوانی ہے. اس کے برعکس ذکرِ الٰہی سے اعراض اور روگردانی کا نتیجہ روزی کی تنگی ہے.

اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قصۂ آدم میں "جنت کی زندگی" سے مراد نوعِ انسانی کی زندگی کا وہ ابتدائی دَور ہے جس میں سامانِ رزق کی فراوانیاں تھیں. یعنی وہ دَور جس میں ہنوز اس کی تمدنی زندگی کا آغاز نہیں ہوا تھا[1]. علمائے علم الانسان (ANTHROPOLOGISTS) کا کہنا ہے کہ زمانہ قبل از تمدن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انسان ملکیت کے لفظ سے ناآشنا تھا. جس کا جہاں سے جی چاہتا سامانِ زیست لے لیتا. اس کے بعد اس کی تمدنی زندگی شروع ہوئی جس کا پہلا دَور

---

[1] لفظ آدم کا مادہ (ا-د-م) ہے اور اُدْمَۃٌ کے معنی ہیں مل جل کر رہنے کی صلاحیت. چونکہ اس زمانہ کے ساتھ انسان کی ایک نئی زندگی (یعنی تمدنی زندگی) کا آغاز ہوا تھا اس لئے اس کے نمائندہ کو تمثیلی انداز میں آدم کہا گیا.

قبائلی زندگی کا تھا۔ یعنی اب نوعِ انسانی مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر الگ الگ ہوگئی۔ عربی زبان میں الگ الگ ہونے کو مشاجرت کہتے ہیں۔ اسی کا نام وہ شجر ہے جس کے قریب جانے سے انسان کو روکا گیا تھا۔ اس مشاجرت کا نتیجہ کیا ہوا؟ ارض (سامانِ معیشت یا رزق کے سرچشمے) مختلف لوگوں نے اپنی اپنی ملکیت میں لے لئے اور اس طرح وہی سامانِ زیست جو اس سے پہلے اس طرح فراوانی سے ملتا تھا، اس کا حصول مشقت طلب ہوگیا۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) زندگی کا جبلی تقاضا ہے۔ کوئی فرد مرنا نہیں چاہتا۔ زندگی کا دارومدار سامانِ رزق پر ہے اس لئے انسانی عقل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہر فرد زیادہ سے زیادہ سامانِ رزق اپنے لئے سمیٹ لے۔ اسی سے انفرادی زندگی کی وہ افراتفری شروع ہوتی ہے جو انسانی معاشرہ کو جہنم بنا دیتی ہے۔ حیوان صرف اپنا پیٹ بھرنا جانتا ہے۔ لیکن انسان کا پیٹ کبھی بھرتا ہی نہیں۔ وہ سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ تاآنکہ اسے موت آجاتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر بہت سے انسانوں نے ایک ہی جگہ رہنا ہو اور ان میں سے ہر ایک اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سمیٹنا شروع کر دے تو اس سے معاشرہ میں سخت ناہمواریاں پیدا ہونا شروع ہو جائیں گی۔ انفرادی عقل کا یہ تقاضا کہ دنیا میں سب کچھ میرے ہی لئے ہونا چاہیئے، ابلیس کہلاتا ہے۔ ملائکہ، یعنی کائنات کی قوتیں (جن سے رزق پیدا ہوتا ہے) انسان کے تابع فرمان ہیں۔ وہ سب اس لئے سرگرمِ عمل ہیں کہ انسان کو نشوونما کا سامان ملتا رہے۔ وہ سب اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں لیکن اس کی اپنی ہوس ہے کہ زندگی کے عالمگیر تصوّر کے خلاف سرکشی اختیار کرتی ہے وہ اپنے انفرادی مفاد کے مقابلے میں کسی اور کے مفاد کی کوئی حیثیت نہیں سمجھتی۔ یہ ہے ابلیسی کشمکش یعنی عالمگیر انسانیت کے مفاد اور ہر فرد کے ذاتی مفاد میں تصادم۔

اگر انفرادی مفاد کا دائرہ ایک فرد کی اپنی زندگی تک ہی محدود ہوتا، تو بھی اس کی حد مقرر ہو سکتی تھی۔ لیکن اپنے مفاد کے بعد انسان اپنی اولاد کے مفاد کا تحفظ شروع کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ مرنے کے بعد اپنی اولاد کے ذریعے اپنا نام روشن رکھنا چاہتا ہے اور اس طرح اس حیاتِ جاوید کی ہوس پوری کر لیتا ہے جس سے طبیعی موت نے اسے محروم کر دیا تھا۔ یہ ہے وہ جذبہ جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ابلیس نے آدم کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ وہ اسے حیاتِ جاوید عطا کر دے گا۔ اور اس کا ذریعہ بتایا اولاد۔ یہ ہے مفہوم اس تمثیلی بیان کا جس میں کہا گیا ہے کہ اس حیاتِ جاوید کے حصول کی تمنا میں انسان کے جنسی ترغیبات کے

عنوان اُبھر کر سامنے آگئے۔

یہ ہے اس معاشرے کی تصویر جسے انسان نے اپنی تمدنی زندگی کے ساتھ شروع کیا اور جس نے رفتہ رفتہ اسے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کہ کوئی فرد کسی دوسرے قریب نہ رہ سکا۔ ان میں انفرادی مفاد کی (WEDGES) اس طرح دراندازہوئیں کہ گوشت سے ناخن جدا ہو گیا۔ یہ ہے آدم کا ہبوط۔ اس کا وہ تنزل جس میں یہ حیوانات کی سطح سے بھی نیچے گر گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا انسان کے لئے اس پستی سے نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے؟ قرآن اس کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان اپنے اس مقام سے اُبھر کر سطحِ انسانی پر آسکتا ہے اور وہاں سے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا "اقطار السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" سے بھی آگے نکل سکتا ہے۔

(جیسا کہ ہم سابقہ عنوان میں دیکھ چکے ہیں) قرآن کہتا ہے کہ انسان کی زندگی فقط طبعی زندگی نہیں۔ زندگی کی اس سطح تک تو حیوان اور انسان دونوں مشترک ہیں۔ انسان کے اندر ایک اور چیز بھی ہے جسے قرآن نے "روحِ خداوندی" (الوہیاتی توانائی) کہہ کر پکارا ہے اور جسے ہماری اصطلاح میں انا یا خودی یا انسانی ذات (یا) کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی طبعی ضروریات کا بھی تحفظ کرے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کا بھی تحفظ اور استحکام کرے۔ انسان کو حیاتِ جاوید نہ طبعی جسم کی پرورش سے ملتی ہے اور نہ ہی اولاد کے ذریعے۔ اسے حیاتِ جاوید ملتی ہے اس کی ذات (خودی) کے استحکام سے۔ قرآن ایک ایسا نظام تجویز کرتا ہے جس میں انسانی جسم کی پرورش بھی بطریقِ احسن ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی ذات کا استحکام بھی ہوتا جاتا ہے۔ استحکامِ ذات کے لئے ضروری ہے کہ انسان، اپنے آپ سے آگے بڑھ کر نوعِ انسانی کے مفادِ کلی اور عالمگیر ربوبیت کا بھی انتظام کرے۔ اگر انسان اپنے معاشرے کو وحی کے مطابق متشکل کرلے تو اس سے اس کی یہ زندگی بھی جنت کی زندگی بن جاتی ہے اور اس کے بعد کی زندگی بھی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے، اس طرح انسان، تباہی اور بربادی کے عذاب سے بے خوف ہو جاتا ہے۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

لے عداوت کے بنیادی معنی ہیں۔

انسانی عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کے لئے اسباب و ذرائع فراہم کرتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس فیصلے کو ہم انسان کا اپنا فیصلہ کہتے ہیں وہ فیصلہ کس کا ہوتا ہے ظاہر ہے کہ انسان کے اندر ایک تو اس کی جبلّت (INSTINCT) کے تقاضے ہیں۔ ان تقاضوں کو بھی انسان ہی کے فیصلے کہا جاتا ہے۔ مثلاً جب مجھے بھوک لگتی ہے تو میں اُٹھتا ہوں کہ کہیں سے کچھ کھانے کو لاؤں۔ غذا کا حصول میرا فیصلہ ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ درحقیقت میری جبلّت کا تقاضا ہے جو میری حیوانی زندگی کی سطح پر ہے۔ میری عقل مجھے یہ بتاتی ہے کہ فلاں جگہ کھانے کا سامان رکھا ہے یا فلاں جگہ پیسے رکھے ہیں جن سے کھانا خریدا جاسکتا ہے۔ عقل کا یہ کام نہیں کہ وہ بتائے کہ وہ کھانا جائز ہے یا ناجائز اور وہ پیسے مجھے لینے چاہئیں یا نہ لینے چاہئیں۔ چونکہ عقل کا کام جبلّت کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے، اس لئے وہ عقل مجھے بار بار یہی کہے گی کہ اُٹھ اور کھانا لے۔ جا اور پیسے لے آ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے سامنے ایک اور تقاضا آتا ہے اور وہ یہ کہ وہ کھانا حلال نہیں اس لئے مجھے نہیں کھانا چاہیئے۔ وہ پیسے میرے نہیں اس لئے مجھے نہیں لینے چاہئیں۔ اگر میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ پیسے مجھے چرا لینے چاہئیں تو میرا یہ فیصلہ عقلِ بے باک کے تابع ہوگیا۔ اسے ابلیسی فیصلہ کہیں گے۔ اگر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ نہیں جو کچھ میرے لئے ناجائز ہے مجھے وہ کبھی نہیں لینا چاہیئے، تو میرا یہ فیصلہ وحی کے تابع ہوگا جس نے جائز و ناجائز کی تمیز سکھائی ہے۔ اس فیصلے کے بعد میں عقل سے کہوں گا کہ وہ کوئی تدبیر سوچے جس سے مجھے حلال و طیّب رزق مل سکے۔ اب جس روش پر عقل کام کرے گی اس کے متعلق کہیں گے کہ عقل وحی کی روشنی میں کام کر رہی ہے۔ اس کا نام ہے وحی کا اتّباع۔ اگر ہم عقلِ بے باک کا اتّباع کرتے جائیں گے تو ہر شخص کی ساری تگ و تاز اس کے اپنے ذاتی مفاد (یا اپنی اولاد کے مفاد) کے تحفّظ تک محدود رہے گی اور اس میں جائز و ناجائز کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ہم اسی عقل کو وحی کے تابع چلائیں گے تو اس سے تمام نوعِ انسانی کے مفاد کا تحفّظ ہوگا اور انسانی جسم کے ساتھ ساتھ انسانی ذات کا استحکام بھی ہوتا جائے گا۔ پہلی روش "آدم" کو جنّت سے نکلوا دیتی ہے اور دوسری روش اسے پھر سے جنّت میں داخل کر دیتی ہے۔ یہ ہے قصّۂ آدم کی روئیداد اور اس کا مقصود و منتہیٰ۔

تصریحاتِ سابقہ سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ سجدۂ ملائکہ اور انکارِ ابلیس وغیرہ کے تذکرہ میں آدم سے مراد خود انسان ہے۔ کوئی خاص فرد (INDIVIDUAL) نہیں۔ اور انسانوں کی ہر دو اصناف

(ذکور و اناث) کا بیان ہے۔ اس لئے آدم درحقیقت نمایندۂ آدمیت ہے نہ کہ کوئی خاص فرد۔

نبوّتِ آدم

قرآنِ کریم میں البتہ ایک مقام پر آدم کا لفظ اس انداز سے بھی آیا ہے جو "فردِ واحد" کے مفہوم کا حامل ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىٓ اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ إِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۗ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۳/۳۳-۳۴)

یقیناً اللہ نے آدم اور نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو (ان کی ہم عصر) اقوام پر فضیلت دی۔ ان میں سے ایک دوسرے کی نسل (میں سے) تھے۔ اور اللہ (سب کچھ) سننے والا، جاننے والا ہے۔

یہاں آدم کا ذکر حضرت نوحؑ کے ساتھ آیا ہے جس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس سے مفہوم کوئی خاص فرد ہے جو غالباً نبی تھا۔ اگرچہ اِصْطَفٰى کا لفظ قرآنِ کریم میں غیر نبی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً حضرت مریمؑ کے متعلق فرمایا ہے،

وَ إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۳/۴۱)

اور جب ملائکہ نے کہا کہ اے مریم! بے شک اللہ تجھے برگزیدہ اور مطہر بنانے والا ہے اور تجھے تمام اقوام کی عورتوں پر بزرگی عطا کرنے والا ہے۔

اور خود اُمّتِ محمدیہؐ کے متعلق ہے۔

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ (۳۵/۳۲)

پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث بنا دیا جنہیں اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا تھا۔

لیکن سورۂ آلِ عمران کی متذکرہ بالا آیت (۳/۳۲) میں چونکہ آدم کا ذکر نوحؑ کے ساتھ آیا ہے اور دونوں کے لئے اِصْطَفٰى کا لفظ استعمال ہوا ہے اس لئے گمانِ غالب ہے کہ یہ آدمؑ نبی تھے۔ اگرچہ قرآنِ کریم میں اس کی تائید میں کوئی نصِ صریح موجود نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آدمؑ کسی نبی کا نام ہو جس کی ذریّت کے

متعلق سورۂ مریم ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ..... عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا (۱۹/۵۸)

یہ ہیں وہ لوگ (یعنی جن کا تذکرہ سابقہ آیات میں گزر چکا ہے) جو انبیاء میں سے ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا۔ آدم کی نسل میں سے اور ان کی نسل سے جنہیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا۔ نیز ابراہیم اور اسرائیل کی نسل سے۔ اور ان گروہوں میں سے جنہیں ہم نے راہِ راست دکھائی اور منتخب کرلیا۔ (یہ وہ لوگ ہیں کہ) جب خدا کے احکامات انہیں سنائے جاتے تھے تو ان کے سامنے جھک جاتے تھے اور ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔

لیکن جو قرآنی تصریحات گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہیں ان کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ سجدۂ ملائکہ وغیرہ کے قصہ کا آدم ایک فرد نہیں۔ یہ خود انسان کی سرگزشت ہے جسے قصے کے تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اس تمثیل میں آدم کا لفظ غالباً اس رعایت سے لایا گیا ہے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے اولیں مراحل میں جن کا تعارف قرآنِ کریم نے کرایا ہے۔ آدم نامی کسی شخصیت کو ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ لیکن اس تمثیل میں اس شخص کی ذات مُراد نہیں ہے۔ (عربی زبان میں اٰدَمُ کسی خاندان کے ایسے مثالی فرد کو کہتے ہیں جس سے اس قبیلہ کو پہچانا جا سکے)۔ علاوہ ازیں ایک نبی سے حکم خداوندی کی ایسی کھلی ہوئی خلاف ورزی ممکن نہیں جیسی اس تمثیل میں مذکور ہے۔ اور ابلیس اللہ کے بندوں پر کبھی غلبہ نہیں پا سکتا۔ سورۂ حجر میں ہے۔

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ (۱۵/۴۲)

یقیناً میرے بندوں پر تجھے (کبھی) غلبہ حاصل نہیں ہوگا۔

لہٰذا اگر قصۂ زیرِ نظر کے آدم کوئی نبی تھے تو انہیں ابلیس کبھی نہیں پھسلا سکتا تھا۔ اس لئے تصریحاتِ قرآنی کے مطابق جنت سے نکلنے والا آدم، کوئی خاص فرد نہیں تھا۔ بلکہ انسانیت کا تمثیلی نمایندہ تھا جس کی ذریت سے مراد تمام نوعِ انسانی ہے نہ کہ کسی فردِ خاص کی نسلی اولاد۔ یہی وہ نوعِ انسانی ہے جو ابلیسی قوتوں کے ساتھ قیامت کے لئے حریفانہ کشمکش میں ستیزہ کار ہے۔

قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَىَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ○ (۱۷/۶۲)

(ابلیس نے کہا) کہ ذرا اس پر غور تو فرما کہ تُو نے اس (حقیر) ہستی کو مجھ پر بڑائی دے دی ہے. اگر تو مجھے قیامت کے لئے مہلت دے دے تو میں اس کی ناک میں نکیل ڈال کر لئے لئے پھروں گا اور اس سے بہت تھوڑے لوگ بچ سکیں گے.

ان تصریحات کی رُو سے اس تمثیلی داستان کے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ ذہن سے اس تصور کو نکال دیں کہ یہ کسی سچ مچ کے واقعہ کا بیان ہے. یہ بیان (یعنی تمثیل) نہ کسی خاص زمانے سے متعلق ہے نہ کسی خاص مقام سے. یعنی یہ نہیں کہ آج سے پانچ دس ہزار سال پہلے اس زمین پر، یا کہیں آسمانوں پر اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا تھا. ایسا نہیں بلکہ اس قصہ میں انسانی خصوصیات کو استعارہ کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے. (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے. اس قصے میں) ملائکہ سے مراد کائنات کی قوتیں ہیں جنہیں خاص قوانین کے تابع سرگرمِ عمل رکھا گیا ہے ان قوانین کا نام قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) ہے. ان قوانین کے علم سے انسان ان تمام قوتوں سے اپنے منشار کے مطابق کام لے سکتا ہے. یہ سجدۂ ملائکہ ہے. پھر اس زندگی کو جس میں انسان نے ہنوز "میری اور تیری" کی تفریقات پیدا نہیں کی تھیں اور جس میں ہر فرد جہاں سے جی چاہتا پیٹ بھر کر کھا پی سکتا تھا، جنّت کی زندگی سے تعبیر کیا گیا. یہ جو انسانی تمدن سے پہلے کی زندگی تھی. اس کے بعد ایک طرف شعورِ خویش بیدار ہوا، اور دوسری طرف مدنیت کی زندگی اختیار کرنے سے باہمی مفاد کا تصادم شروع ہو گیا. عقلِ حیلہ جو نے ہر فرد (یا ہر گروہ) کے دل میں اس کے اپنے مفاد کے تحفظ اور اس کی طبیعی زندگی کی بقا کا جذبہ اتارا. یہ فریبِ ابلیس ہے، اور اس کشمکش کی زندگی ہبوطِ آدم. اس کشمکش کی زندگی میں متصادم قوتوں پر غالب آنے کے لئے وحیٔ آسمانی کی تائید و نصرت کی ضرورت ہے. یعنی علم (عقل) کی رُو سے کائنات کی تمام قوتوں کو مسخر کیا جائے (کہ اسی خصوصیت کی بنا پر آدم مسجودِ ملائک قرار پایا تھا). اور پھر ان تمام قوتوں کو وحیٔ آسمانی کی روشنی میں کام میں لایا جائے تاکہ اس سے نہ صرف طبیعی زندگی عزت و تکریم سے گزرے بلکہ بقائے ذات سے وہ حیاتِ جاوید حاصل ہو جس کے حصول کے لئے انسان نے عقلِ بے باک (ابلیس) کا فریب کھایا تھا. یہ وہ اندازِ زندگی ہے جس میں انسانی ذات صحیح نشوونما پا کر (جس کا ذریعہ عالمگیر ربوبیت ہے) حیاتِ جاوید کے قابل بن

جاتی ہے اسے جنت کی زندگی کہا جاتا ہے۔ یہ اُن اعمال کی بدولت ملتی ہے جو انسان میں بقائے دوام کی صلاحیت پیدا کر دیں۔ یہ ہے انسان کا تمثیلی بیان جسے قصۂ آدم کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔

خلیفہ فی الارض کا مفہوم

جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں قصۂ آدم کی ابتداء ان الفاظ سے ہوئی ہے۔ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً۔ اس میں لفظ خَلِيْفَة تشریح طلب ہے۔ خلیفہ، خلف سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پیچھے آنا۔ لہٰذا خلیفہ کے معنی ہیں پیچھے آنے والا۔ جانشین (SUCCESSOR)۔ درخلافت، کے معنی ہیں جانشینی (SUCCESSOR)۔ خلیفۃ الرسول کے معنی ہیں رسول کا جانشین۔ استخلاف کے معنی ہیں جانشین بنانا۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں یہ لفظ ان معنوں میں آیا ہے۔ لیکن یہ بھی واضح ہے کہ جب کوئی قوم یا جماعت کسی ماسبق قوم یا جماعت کی جانشین ہوتی ہے تو اس میں تمکن و تسلط بھی داخل ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جانشینی سے مفہوم ہی یہ ہے کہ کسی قوم کو قومِ ماسبق کی جگہ متمکن و مسلط کر دیا جائے۔ قرآنِ کریم میں استخلاف کا لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے۔

غلبہ و تسلط سے جانشینی

لہٰذا آدمؑ (نوعِ انسانی) کے خلیفہ فی الارض سے مفہوم اپنے سے پہلی مخلوق کی جانشینی اور تسلط و تمکن اور قوت و غلبہ کے ساتھ جانشینی ہے۔ یہ کون سی مخلوق تھی جس کا جانشین انسان کو بنایا گیا تھا، اس کے متعلق سورۃ الحجر میں ہے۔

وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۝ (۱۵/۲۷)

انسان سے پہلے ہم نے جانّ کو تیز آگ سے پیدا کیا۔

اس سے واضح ہے کہ انسانوں سے پہلے زمین میں کوئی اور مخلوق آباد تھی جو اَب ناپید ہے۔ (تفصیل اس کی جنات کے عنوان میں ملے گی)۔ بہرحال آدمؑ (انسان) اس مخلوق کا جانشین تھا۔

نیابت

خلیفہ کا مفہوم آپ کے سامنے آگیا۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں عام طور پر جو عقیدہ مروج ہے کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا، یعنی خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ اس عقیدے کی کوئی سند قرآن میں نہیں۔ اس لئے کہ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) خلیفہ کے معنی ہیں کسی کا جانشین (SUCCESSOR) اس لئے خدا کا جانشین (SUCCESSOR) ہونا نہ صرف مضحکہ خیز بلکہ گمراہ کن تصور ہے۔ حضرت ابوبکر

صدیقؓ خلیفۃ الرسول (یعنی رسول اللہ کے جانشین تھے) خلیفۃ اللہ (خدا کے جانشین) نہیں تھے۔ اگر خلیفہ کے معنی نائب یا قائم مقام لئے جائیں تو بھی انسان خدا کا نائب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ نیابت اس کی ہو سکتی ہے جو خود موجود نہ ہو۔ خدا ہر جگہ اور ہر مقام پر موجود ہے اس لئے اس کا نائب (REPR ESENTATIVE) ہونا کیا معنی؟ اسی نیابت کے غلط تصور نے ہمارے ہاں یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ خدا نے اپنے اختیارات انسان کو تفویض (DELEGATE) کر دیئے ہیں۔ یہ عقیدہ بھی یکسر غلط ہے۔ جو شخص اپنے اختیارات کسی اور کو تفویض (DELEGATE) کر دیتا ہے وہ اختیارات اس شخص کے پاس باقی نہیں رہتے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خدا نے اپنے بعض اختیارات انسان کو تفویض کر دیئے ہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اختیارات خدا کے پاس نہیں رہے اور وہ ان قوتوں سے عاری ہو گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی حیثیت نہ تو خدا کے خلیفہ (جانشین) کی ہے اور نہ ہی اس کے نائب (VICEGERENT) کی اور نہ ہی خدا نے اپنے اختیارات اسے تفویض کئے ہیں۔ خدا نے انسان کو (ایک محدود پیمانے کے اندر) اختیار و ارادہ دیا ہے۔ اگر وہ اپنے اختیار و ارادے کو وحی کی حدود کے اندر (قوانین خداوندی کے مطابق) استعمال کرے تو انسانی معاشرے میں صحیح توازن پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے انسانی ذات کی ایسی نشوونما ہو جاتی ہے جس سے وہ زندگی کے مراحل طے کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا اور اوپر کو اٹھ جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ ان اختیارات کا استعمال اس طرح نہیں کرتا تو اس کے معاشرے میں ایسی ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اسے جہنم بنا دیتی ہیں اور جس میں انسانی ذات کی تمام صلاحیتیں جھلس کر رہ جاتی ہیں۔

اسے پھر دہرا لیجئے کہ انسان دنیا میں کسی سابقہ مخلوق (سلسلۂ ارتقا کی سابقہ کڑی) کا جانشین (SUCCESSOR) ہے۔ خدا کا خلیفہ (جانشین) نہیں ہے۔ وہ خدا کے احکام کو دنیا میں نافذ کرنے پر مامور کیا گیا ہے۔ اور یہی اس کی صحیح پوزیشن ہے۔

باہمی عداوت ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ "ہبوطِ آدم" کے وقت نسلِ انسانی سے کہہ دیا گیا کہ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ "حیاتِ ارضی میں تم ایک دوسرے کے باہمی دشمن ہو گے" شیطان یہی چاہتا ہے۔ اس کے برعکس ہدایتِ خداوندی کی تعلیم اتحاد اور مودّت، یک جہتی و یک نگہی، تمام نوعِ انسانی کی وحدت ہے۔ جو آسمانی تعلیم کا اتباع کریں گے ان میں تحزب و تشیع، اختلاف و تنازع،

گروہ سازیاں اور فرقہ بندیاں نہیں ہوں گی۔ ان میں باہمی مواخات و محبت ہوگی۔ وہ سب متحد اور یک جان ہوں گے۔ لیکن وحیِ خداوندی سے انحراف اور اتباعِ شیطانی کا نتیجہ، باہمی اختلاف، قتل و خونریزی اور فساد و مناجرت ہوگا۔ چنانچہ سورۂ مائدہ میں "تمثیلی" انداز میں دو بھائیوں کا قصہ بیان کیا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ قتل کی ابتدا کس طرح باہمی حسد سے ہوئی ہے۔ (دیکھئے ۲۷-۳۱/۵)۔

سجدہ گزشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو سجدہ کا حکم دیا۔ اور انہوں نے آدم کو سجدہ کیا۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ملائکہ نے آدم کے سامنے اپنی پیشانی کو زمین پر رکھ دیا۔ سجدہ کے معنی جھکنے کے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ اقرارِ اطاعت کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ وہ سجدہ جس میں پیشانی زمین بوس ہوجاتی ہے، درحقیقت، اقرارِ اطاعت ہی کی ایک محسوس شکل ہے۔ اس لئے قصۂ آدم میں ملائکہ کے سجدہ سے مراد اقرارِ اطاعت ہے۔ سورۂ رعد میں ہے۔

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ۝ (۱۳/۱۵)

اور پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا (کے قوانین) کے آگے جھکا ہوا ہے۔ خوشی سے ہو یا مجبوری سے۔ اور (دیکھو) ان کے سائے صبح و شام کس طرح گھٹتے، بڑھتے اور ادھر اُدھر ہوتے رہتے ہیں۔ (جس سے ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ایک خاص نظام کے ماتحت واقع ہو رہا ہے)۔

ظاہر ہے کہ اس سے مفہوم، اطاعت کوشی کا عملی اعتراف و اقرار ہے۔ اس مفہوم کی وضاحت سورۂ نحل میں یوں کردی گئی۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (۱۶/۵۰-۴۹)

اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اور زمین میں جتنے ذی حیات ہیں سب اللہ (کے قوانین) کے آگے سربسجود ہیں اور ملائکہ بھی وہ (بھی) سرکشی نہیں اختیار کرسکتے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ملائکہ کے سجدے سے مراد اقرارِ اطاعت ہے۔ یعنی کائناتی قوتیں انسان کے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دی گئی ہیں جن سے یہ اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا ہے۔

تورات اور قصۂ آدم

بائبل (عہدِ عتیق) میں بھی قصۂ آدم مذکور ہے لیکن اس کی اور قرآن کریم کی بیان کردہ تفاصیل میں جو بین فرق ہے وہ انسانی ہاتھوں سے مسخ شدہ تعلیم اور خالص آسمانی تعلیم کی ایک زندہ شہادت ہے (اور یہ شہادت آپ کو آیندہ اوراق میں اکثر و بیشتر ملے گی۔ سب سے پہلے بائبل میں مذکور ہے کہ :-

"خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔" (تورات کتاب پیدائش ۱/۲)

تخلیقِ انسانی کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (۹۵/۴)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین متوازن ہیئت میں پیدا کیا۔

نگارخانۂ کائنات میں انسانی تخلیق بلاشبہ فطرت کا شاہکار ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ خدا نے اسے اپنی صورت پر پیدا کیا اس حُسنِ ازل کو (جس کا تصور بھی حیطۂ انسانی سے باہر ہے) اس کے بلند و بالا مقام سے کھینچ کر بہت نیچے لے آنا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ ارشادِ خداوندی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ تصورِ ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے جس نے جذبۂ خودستائی سے سرشار ہو کر اتنا بھی نہیں سوچا کہ اپنی نسبت کہاں ملا رہا ہے؟ اور نہ ہی یہ کہ اس عقیدہ سے خدا کے متعلق ذہنِ انسانی میں کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

(۲) جنتِ آدم کے متعلق ہے۔

> اور خداوند خدا نے عدن میں پورب کی طرف ایک باغ لگایا اور آدم کو جسے اُس نے بنایا تھا وہاں رکھا اور خداوند خدا نے ہر درخت کو جو دیکھنے میں خوشنما اور کھانے میں خوب تھا اور باغ کے بیچوں بیچ حیات کے درخت اور نیک و بد کی پہچان کے درخت کو زمین سے اگایا۔ اور عدن سے ایک ندی باغ کے سیراب کرنے کو نکلی اور وہاں سے تقسیم ہو کر چار سرے نہروں کے بنی۔ پہلی کا نام فیسون جو حویلہ کی ساری زمین کو گھیرتی ہے۔ وہاں سونا ہوتا ہے اور اس زمین کا سونا اچھا ہے۔ اور وہاں موتی اور بلور بھی ہیں اور دوسری نہر کا نام جیحون

ہے جو کوش کی ساری زمین کو گھیرتی ہے۔ اور تیسری نہر کا نام دجلہ ہے جو اسور کے پورب جاتی ہے اور چوتھی نہر کا نام فرات ہے۔ (پیدائش ۲/۱۴)

قرآن نے انسانی سرگزشت کو تمثیلی رنگ میں بیان کیا ہے اس لئے اس میں کسی مقام کا نام نہیں لیا گیا کیونکہ اس طرح وہ تمثیل نہ رہتی، تاریخ کا ایک واقعہ بن جاتی۔

(۳) شجرِ ممنوعہ کے متعلق لکھا ہے :۔

اور خداوند خدا نے آدم کو لے کر باغ عدن میں رکھا کہ اس کی باغبانی اور نگہبانی کرے۔ اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دے کر کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل کھایا کر لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا کیونکہ جس دن تو اسے کھائے گا ضرور مرے گا۔

(پیدائش ۱۶-۲/۱۷)

انسان کو نیک و بد کی پہچان وحی کے ذریعے کرائی جانی مقصود تھی۔ لہٰذا، اس شجر کے قریب آنے سے منع کرنے کے کیا معنی؟

(۴) آدم کی بیوی کی پیدائش کے متعلق لکھا ہے :۔

اور خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا۔ اور آدم نے کہا کہ اب یہ میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور گوشت میں سے گوشت ہے۔ اس سبب سے وہ ناری کہلائے گی۔ کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی۔ اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔ اور وہ دونوں آدم اور اس کی جورو ننگے تھے اور شرماتے نہ تھے۔ (پیدائش ۲۱- ۲/۲۵)

اس کے بعد یہ مذکور ہے کہ کس طرح سانپ نے (ابلیس نے نہیں بلکہ سانپ نے) اس عورت کو بہکایا اور اس نے شجرِ ممنوعہ کا پھل خود بھی کھایا اور اپنے خاوند کو بھی کھلا دیا۔ اس کے بعد :۔

اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سنی۔ اور آدم اور اس کی جورو نے آپ کو خداوند خدا کے سامنے سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب

خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے. وہ بولا کہ میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور ڈرا کیونکہ میں ننگا ہوں. اس لئے میں نے اپنے آپ کو چھپایا. اور اس نے کہا کہ تجھے کس نے جتایا کہ تو ننگا ہے؟ کیا تُو نے اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم کیا تھا کہ اسے نہ کھانا؟ آدم نے کہا کہ اس عورت نے جسے تو نے میری ساتھی کر دیا مجھے اس درخت سے دیا اور میں نے کھایا. تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ عورت بولی کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا۔

(پیدائش ۸ ـ ۳/۱۳)

چنانچہ اس جرم کی پاداش میں؛

اس نے (یعنی خداوند خدا نے) عورت سے کہا کہ میں تیرے حمل میں تیرے درد کو بہت بڑھاؤں گا اور درد سے تو لڑکے جنے گی اور اپنے خصم کی طرف تیرا شوق ہوگا اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔ (پیدائش ۳/۱۶)

اور آدم سے کہا کہ :

اس واسطے کہ تُو نے اپنی جورو کی بات سنی اور اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم کیا کہ اس سے مت کھانا. زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا اور وہ تیرے لئے کانٹے اور اونٹ کٹارا اگائے گی اور تو کھیت کی نبات کھائے گا۔

اس کے بعد مذکور ہے کہ

اور خداوند خدا نے کہا. دیکھو کہ انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا. اور اب ایسا نہ ہو کہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے اور کچھ کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے. اس لئے خداوند خدا نے اس باغ کو عدن سے باہر کر دیا. تاکہ وہ زمین کی جس میں سے وہ لیا گیا تھا کھیتی کرے. چنانچہ اس نے آدم کو نکال دیا اور باغ عدن کی پورب کی طرف کروبیوں کو چمکتی تلوار کے ساتھ جو چاروں طرف پھرتی تھی مقرر کیا کہ درختِ حیات کی راہ کی نگہبانی کریں۔ (پیدائش ۲۲ ـ ۳/۲۴)

آپ نے غور فرمایا کہ اس قصّہ کی مذکورہ صدر تفاصیل میں کس طرح زمین کی پستی اور خاک کی کثافت جھلک رہی ہے یہ چیز بھی خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ تورات میں عورت کو مجرم قرار دیا گیا ہے کہ وہی سانپ کے فریب میں آئی اور اس نے پھر اپنے خاوند کو بھی بہکایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے نزدیک عورت ایک ایسی جنس ملعون ہے جسے شرفِ انسانیت سے کچھ علاقہ نہیں۔ عیسائیت کے اربابِ حل و عقد میں چھٹی صدی عیسوی تک یہ مسئلہ نہایت متانت و سنجیدگی سے مرکزِ بحث و تمحیص رہا کہ عورت میں روحِ انسانی ہوتی ہے یا نہیں۔ بڑے بڑے بزرگانِ کلیسا عورت کو فریب کا مجسمہ اور دنیا کی تمام تکالیف و مصائب کا سرچشمہ قرار دیتے رہے۔ (ST. HEVONYMUS) کا قول ہے کہ "عورت شیطان کا دروازہ، برائیوں کی راہ اور بچھو کا ڈنک ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیت میں متاہل زندگی مذہبی تقدس و روحانیت کے مانع ہے۔ عیسائیوں کے قانون کی رُو سے سوسائٹی میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کی انفرادیت تک بھی تسلیم نہیں کی جاتی۔ ہندو دھرم میں بھی عورت کی یہی حالت ہے۔ منوسمرتی میں ہے۔

> کسی لڑکی۔ جوان عورت یا بڑھیا کو، خواہ اپنے ہی گھر میں کیوں نہ ہو، کوئی کام بھی اپنی مرضی کے مطابق نہیں کرنا چاہیئے۔ بچپن میں لڑکی کو اپنے باپ کی مرضی کے تابع رہنا چاہیئے جوانی میں اپنے خاوند کی۔ اور اگر خاوند کی موت ہو جائے تو اپنے لڑکے کی مرضی کے ماتحت۔ عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کبھی بھی اپنی مرضی برت سکے۔ حتّٰی کہ خرچ اخراجات میں بھی اسے کوئی اختیار نہیں ہونا چاہیئے۔

(THE BIBLE OF THE WORLD, P-81)

ملکیت کے معاملہ میں فیصلہ یہ ہے کہ

> بیوی لڑکے اور غلام کی اپنی جائیداد کوئی نہیں۔ پس جو کچھ ان کا ہے وہ ان کے مالک کا ہے۔ (ایضاً، صفحہ ۸۴)

چنانچہ ہندو سوسائٹی میں لڑکیوں کو دان (خیرات) دیا جاتا ہے۔ بطور استحقاق انہیں کچھ نہیں مل سکتا۔ لیکن قصّہ آدم میں قرآنِ کریم میں تنہا عورت کو مجرم نہیں ٹھیرایا۔ اُس نے کہا کہ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ (اُن دونوں کو شیطان نے بہکایا) اس لئے کہ یہ انسان کی کیفیات کا بیان ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انسانی کیفیت مرد و عورت دونوں میں موجود ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے عورت کو محض عورت ہونے کے اعتبار سے مجرم و معتوب

قرار نہیں دیا۔ (اسلام میں عورت کی کیا حیثیت ہے اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی[1]۔ یہاں فقط اتنا ہی دیکھئے کہ قرآن نے معصیتِ آدم کا باعث عورت کو قرار نہیں دیا)۔

یہ ہے بائبل اور قرآنِ کریم میں بیان شدہ قصۂ آدم کی تفاصیل کا بدیہی فرق۔ بائبل میں ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کس طرح (معاذ اللہ) خدا کو یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ کہیں آدم نیکی و بدی کی پہچان کے درخت کی طرح شجرِ حیات سے بھی نہ کچھ کھالے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لئے خدا نے اسے جنّتِ عدن سے باہر نکال دیا۔ لیکن اس سے بھی کچھ نہ بنا اور اللہ میاں (معاذ اللہ) تخلیقِ آدم کے اپنے اس فعل پر پشیمان ہی رہا۔ لیکن اس پیدائش کے باب ششم کی پانچویں سے آٹھویں آیت میں ہے۔

> اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی ہے اور اس کے دل کے تصوّر اور خیال روز بروز صرف بد ہی ہوتے ہیں۔ تب خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دل گیر ہوا۔ اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا روئے زمین پر سے مٹا ڈالوں گا۔ انسان کو بھی حیوان کو بھی اور کیڑے مکوڑے اور آسمان کے پرندوں تک۔ کیونکہ اُن کے بنانے سے پچھتاتا ہوں۔ مگر نوح پر خداوند نے مہربانی سے نظر کی۔

یہ حقائق کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔

قصۂ آدم کی حکمتِ بالغہ

قصۂ آدم کی قرآنی تفاصیل آپ کے سامنے آگئیں۔ لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر ایک مرتبہ اس پر نگہ بازگشت ڈالئے اور دیکھئے کہ یہ قصہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آدم کی جنّت کی زندگی سے نوعِ انسانی کو یہ بتا دیا گیا ہے کہ تمہاری منزلِ مقصود جسے تمہیں رزمگاہِ حیات میں مسلسل سعی و عمل سے حاصل کرنا ہے۔

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۴۳/۷۲)

اور یہ ہے وہ جنّت جس کا تمہیں تمہارے اعمال کی بدولت وارث بنایا گیا ہے۔

اس منتہیٰ کو اچھی طرح سے ذہن نشین کرا کر اُن کے سفرِ حیات کی ابتدا کرائی گئی۔ یہ نقطۂ آغاز ہے۔ اس کے

---

[1] دیکھئے میری کتاب "اسلام کیا ہے؟" باب "عورت"۔

بعد ہے ہبوطِ آدم۔ یعنی سلسلۂ ارتقار کی اس اوّلین کڑی (سب سے نچلی منزل)۔ سے انسانیت نے اُبھرنا شروع کیا اور برابر اُبھرتی چلی جارہی ہے۔ زمانہ کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ستیزہ گاہِ جہاں میں طاغوتی قوتوں سے مقابلہ سخت ہے۔ انسانی معاشرہ میں بالعموم ان ہی قوتوں کا اثر غالب نظر آتا ہے لیکن بایں ہمہ اگر آپ بنگاہِ تعمق غور کریں گے تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہوجائے گی کہ انسانیت من حیث الکل وحی کی تعلیم کے قریب آتی چلی جارہی ہے اور تماشا یہ کہ اس کا جو قدم آگے اٹھتا ہے آگ اور خون کے ان چھینٹوں سے ٹکراتا ہوا اُٹھتا ہے جسے ملائکہ کی نگاہوں نے خمیرِ آدم میں بھانپا تھا۔ انسان کے خود قائم کردہ نظام کی سب سے مہیب لعنتیں کیا ہیں؟ ملوکیت، استعماریت، برہمنیت، غلامی، سرمایہ داری، قومیّت پرستی (جس میں امتیازِ رنگ ونسل وخون کی سب خباثتیں شامل ہیں) اور مفاد پرستی (جس میں سرمایہ داری، زمینداری، اجارہ داری وغیرہ کی خون آشام جونکیں سب شامل ہیں)۔ دنیا کی تاریخ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ انسان کس طرح ٹھوکریں کھا کھا کر ان لعنتوں سے تنگ آرہا ہے اور آہستہ آہستہ انہیں دُور کرتا چلا جارہا ہے۔ اور یوں بتدریج غیر شعوری طور پر (بلا اعتراف) قرآنی حقائق کے قریب آتا جارہا ہے۔ ذرا انقلابِ فرانس کو دیکھئے کہ جب انسانیت خون کے اس سیلاب میں ڈوب کر اُبھری ہے، تو کس طرح شاہنشاہیت (شخصی حکومت کے بنیادی تصور) کے خلاف جذبۂ بغاوت لے کر آگے بڑھی ہے۔

انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے ارتقائی مراحل

وہ شاہنشاہیت جو انسانیت کے رگ وپے میں اس طرح سرایت کرچکی تھی کہ گویا اُن کی زندگی کا جزو ہے۔ شہنشاہ دنیا میں خدا کا سایہ (ظل اللہ)، برہما کا اوتار، آسمانی برکات کا حامل، شئونِ الٰہیہ کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔ اس کی پرستش ہوتی تھی۔ بادشاہ کے بغیر کوئی نظامِ حکومت انسان کے تصور میں آ نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس ایک انقلاب کی بھڑکتی ہوئی آگ نے ان تمام تصورات کو بھسم کرکے رکھ دیا اور اس کی جگہ اس نئے تصور نے لے لی کہ حکومت منشائے عامہ (GENERAL WILL OF THE PEOPLE) کے مطابق قائم ہونی چاہیئے۔ دنیا میں آج جمہوریت کے جس قدر چرچے ہیں اسی تصور کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دنیا ہنوز اس صحیح تصور تک نہیں پہنچ سکی جو قرآن نے پیش کیا ہے[1]۔ لیکن بایں ہمہ ملوکیت

---

[1] آپ نے عام طور پر سطح میں لوگوں کو کہتے سنا ہوگا کہ "اسلام جمہوریت کا مذہب ہے"۔ اور اس سے ان کی مراد مغرب

کا خواب تو پریشان ہو چکا۔ اس کا مقدس بُت تو پاش پاش ہو گیا۔ تخریب کی منزل (وادیٔ لَا) کچھ تو طے ہو گئی۔ انسانیت کا ایک قدم تو آگے بڑھا۔

پھر ذرا امریکہ کی اس جدّوجُہد کی داستان پر چھلکتی ہوئی نگاہ ڈالئے جو انسدادِ غلامی کے لئے معرضِ وجود میں آئی۔ جب سے انسان نے آنکھ کھولی تھی غلامی انسانی حیاتِ اجتماعیہ کا جزوِ لاینفک نظر آتی تھی۔ دنیا کا کوئی خطّہ ایسا نہ تھا جس میں غلامی کا رواج نہ ہو اور یہ تصور کچھ جہالت و وحشت ہی سے متعلق نہ تھا بلکہ بڑے بڑے اربابِ علم و حکمت بھی اس کے جواز (بلکہ اہمیت) کے قائل تھے۔ حکمتِ یونان میں دیکھئے کس طرح فلاطون وارسطو غلامی کے جواز و ضرورت میں دلیل پر دلیل لاتے نظر آ رہے ہیں۔ اگرچہ امریکہ (اور اس کے ساتھ انگلستان) نے غلامی کی ایک محسوس شکل کو مٹایا ہے اور ابیض و احمر میں جو بیّن امتیاز وہاں آج تک کارفرما ہے اس کی رُو سے وہ غلامی کی رُوح کو نہیں مٹا سکے۔ بایں ہمہ انسانوں کی بیع و شریٰ کی لعنت کا ٹیکہ تو انسانیت کے ماتھے سے دُھل گیا۔

اور پہلی عالمگیر جنگ کے بعد اس عظیم الشّان انقلاب پر نگاہ ڈالئے جو نظامِ سرمایہ پرستی کے خلاف

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) کے نظامِ جمہوریت سے ہوتی ہے حالانکہ وہ نہیں سمجھتے کہ مغرب کے نظامِ جمہوریت اور قرآنی نظامِ حکومت میں اساسی اور بنیادی اختلاف ہے۔ مغربی نظام میں ملوکیت ہو یا آمریت، جمہوریت ہو یا عمومیت، ہر ایک نظام اس اساس پر مبنی ہے کہ اقتدار و حاکمیت کا حق انسانوں کو حاصل ہے۔ ایک انسان کو یا انسانوں کی کسی جماعت کو۔ اس کے برعکس قرآنی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ حاکمیت و اقتدار کا حق خدا کے سوا اور کسی کو نہیں۔ لہٰذا مغرب کا نظامِ جمہوریت بھی قرآنِ کریم کے نزدیک ایسا ہی مردُود ہے جیسا کوئی اور نظام۔ قرآن "طرزِ حکومت" سے بحث نہیں کرتا بلکہ اس اصول سے بحث کرتا ہے کہ انسانوں پر حکومت کا حق کسے حاصل ہے؟ اور اس کا جواب صرف ایک ہے کہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آذری

اور یہ "خدا کی حکمرانی" سے مراد ہے اس کی کتاب کی حکمرانی۔ اسلامی مملکت قرآنی احکام و قوانین کے نفاذ کا ذریعہ ہوتی ہے اور بس۔

روس میں رونما ہوا۔ ہر چند روس اپنے تشدد (ا) کے طوفانوں میں انتہا تک جا پہنچا۔ اور ردِ عمل میں اعتدال کی راہ سے بہت دُور نکل گیا۔ لیکن وہ سرمایہ داری جو شجرِ انسانیت سے اکاس بیل کی طرح لپٹ رہی تھی اور جس نے انسانوں کی ہڈیوں کے گودے تک سے زندگی کی رمق نچوڑ لی تھی۔ اس کے خلاف تو ایک فضا پیدا ہو گئی۔

اِدھر ہندوستان میں دیکھئے ورنوں کی تقسیم کس طرح انسانوں کو پیدائشی امتیازات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھی۔ یہ وہ تقسیم تھی جسے مذہبی تقدس کی سند حاصل تھی اور جو قرنہا قرن سے ہندو تمدن کی اساس و بنیاد قرار پائے چلی آ رہی تھی۔ آپ نے دیکھا کہ جنگِ عظیم کے بعد انسانوں کی اس تقسیم کے خلاف یہاں کیسی فضا پیدا ہوئی۔ ہر چند صدیوں سے رگ و پے میں سرایت شدہ جراثیم ایک ہی دھچکے سے نہیں نکل جایا کرتے۔ لیکن اس قصرِ "مقدس" کی بنیادیں تو متزلزل ہو گئیں جو اس تقسیم کے لئے قلعہ کی سی حفاظت کا کام دے رہا تھا۔ اسی طرح برہمنیت (PRIESTHOOD) کو لیجئے جس کے بغیر دنیا میں مذہب کا تصور ہی ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ اس لعنت کے خلاف لُوتھر نے آواز اٹھائی اور آج دنیا کے قریب قریب ہر مہذب ملک سے یہ خباثت ختم ہو گئی ہے (یا ختم ہو رہی ہے) آپ نے دیکھا کہ اس باب میں بھی دنیا کس طرح قرآن کے قریب آتی جا رہی ہے۔

اس کے بعد دوسری جنگِ عظیم کو دیکھئے۔

قومیت پرستی کی وہ لعنت جس نے یورپ کو سچ مچ جہنم بنا رکھا ہے محسوس طور پر اقوامِ مغرب کے سامنے آ چکی ہے اور جنگ کے بعد جس نظامِ جدید کے تصورات مدبرین یورپ کی آنکھوں کے سامنے دھندلے سے نقوش کی صورت میں متشکل ہو رہے ہیں اس کی بنیاد اس اصول پر رکھی جا رہی ہے کہ ساری دنیا کو نوعِ انسانی کی برادری تصور کر کے ایک عالمگیر وفاق (WORLD FEDERATION) کا نظام قائم کیا جائے۔ (مزید تصریحات وحی کے عنوان میں ملیں گی)۔ آپ نے غور فرمایا کہ دنیا

دُنیا کس طرح قرآن کے قریب آ رہی ہے

کس طرح ٹھوکریں کھا کھا کر قرآنی نظام کے قریب آتی جا رہی ہے؟ اس لئے کہ قرآنی تعلیم کے اصول غیر محسوس طور پر فضائے عالم میں پھیلے ہوتے ہیں اور ذہنِ انسانی ان سے غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اگر

(ا) اور اب چین اس کی آماجگاہ ہے۔

یورپ اپنی ضد کو چھوڑ کر براہِ راست قرآن کی طرف آجاتا تو پھر دیکھتا کہ اس کا یہ جہنم کس طرح جنتِ ارضی میں تبدیل ہو جاتا ہے؟ لیکن اس کے برعکس ذرا "عالمِ اسلام" (یعنی مسلمانوں کے ممالک) پر غور کیجئے اور دیکھئے

لیکن خود مسلمان کہ نظامِ اجتماعی کی وہ تمام لعنتیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور جنہیں مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا کس طرح ایک ایک کر کے اُن کے نظامِ زندگی میں داخل اور ان کے اعصاب پر مسلط ہیں۔ کیا قیامت ہے کہ آج دنیا میں ملوکیت کی سب سے بڑی لعنت آپ کو ممالکِ "اسلامیہ" میں مسلط نظر آتی ہے! اور آگے بڑھئے آج اس صفحۂ ارض پر اگر کہیں انسان، حیوانوں کی طرح نخاس میں آکر بکتے ہیں تو وہ مکہ کی گلیاں ہیں (ہرچند اس حقیقت کے اظہار سے ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ لیکن حقیقت سے چشم پوشی بھی کس طرح کی جا سکتی ہے[1]؟) سرمایہ داری کی لعنت مسلمانوں کے ہاں عام طور پر موجود ہے۔ ذات پات کی تقسیم ان کی معاشرت کا جزوِ اعظم ہے۔ قومیت پرستی (NATIONALISM) ان کی سیاست کا عروۃ الوثقیٰ ہے حب الوطن کو من الایمان ان ہی کے یہاں قرار دیا جاتا ہے اور اس دیدہ دلیری کے ساتھ کہ اس دورِ جاہلیت کے تصوّر کو منسوب کیا جاتا ہے اس ذاتِ اقدس واعظمؐ کی طرف جو وطن پرستی کے طاغوت کو پاش پاش کرنے کے لئے مبعوث ہوئی۔ برہمنیت ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے اور زندگی کے کسی شعبہ میں یہ ان "مقدس زنجیروں" سے آزاد نہیں۔

سوچا آپ نے کہ وہ تمام لعنتیں جنہیں آج کفار اپنے ہاں سے یا تو دُور کر چکے ہیں اور یا دور کرنے کی فکر میں ہیں کس طرح مسلمانوں کے اعماقِ قلب میں جاگزیں ہیں اور ان سے نفرت اور سرکشی کے آثار کہیں نہیں دکھائی دیتے یہ سب اس لئے کہ

بندۂ مومن ز قرآں برنخورد   در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد
خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست   خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت   دینِ او نقشِ ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر
عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

---

[1] سنا ہے کہ اب وہاں سے بھی یہ لعنت ختم ہو گئی ہے۔

قصۂ آدم اور ملتِ اسلامیہ

ان حقائق کو سامنے رکھئے اور ایک بار پھر قصۂ آدم پر نگاہ ڈالئے
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ نے اس خطۂ ارض پر
قرآنی حکومت کا نظام قائم کر کے اس جنّت کا نمونہ دکھایا جو انسانیت کا منتہیٰ ہے۔ اس کے بعد ہبوطِ آدم ہوا۔ یعنی مسلمانوں نے قرآنی نظام کو الگ کر دیا اور اس جنّت سے نکل کر جسے اس نظام نے قائم کیا تھا یہ بھی دوسرے انسانی کی طرح حیوانی زندگی کی سطح پر آ گئے اب یہ تیرہ سو برس سے ٹھوکریں کھا رہے ہیں (اور ان کے ساتھ ساری دنیا ان ہی ٹھوکروں میں مبتلا ہے) اور اس فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کے لئے تڑپ رہے ہیں، جسے چشمِ فلک نے ایک بار دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کے لئے سرگرداں ہے۔ جب انسان چاروں طرف سے ہار تھک کر قرآن کی طرف آ جائے گا تو پھر اس مقام کو پالے گا جس کی تلاش میں یہ مارا مارا پھر رہا ہے۔ اس وقت آواز آئے گی کہ

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ۝ .... وَ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۴۳/۷۱-۷۰)

تم اور تمہارے رفقاء جنّت میں داخل ہو جاؤ خوش و خرم یہ (مسرتوں کے چھلکتے ہوئے) ساغرِ سیمیں و زرّیں کا دور ہو گا۔ جو کچھ نفس (انسانی ذات) کو مطلوب ہو گا سب کچھ ملیگا۔ (دل کی آرزوئیں) اور آنکھوں کی ٹھنڈک، اس جنّت میں تم رہو گے۔ یہ ہے وہ جنّت جس کے تم اپنے اعمال کی بدولت وارث بنائے گئے ہو۔

خلاصۂ مبحث

خاک کے ذرّات، ارتقائی منازل طے کر کے صورتِ انسانی میں متشکل ہوئے۔ انسان اپنی نیم حیوانی اور نیم انسانی زندگی کے مراحل طے کر کے اس مقام تک آپہنچا جہاں اسے آپس میں مل جُل کر رہنا تھا۔ اس معاشرتی زندگی کا پہلا دَور وہ تھا جس میں انسان نے ہنوز رزق کے سرچشموں پر انفرادی ملکیت کا سبق نہیں سیکھا تھا۔ ہر انسان جہاں سے جی چاہے بافراغت کھا پی سکتا تھا۔ اس کے بعد اس نے انفرادی ملکیت کا تصور پیدا کیا جس سے ان کے مفاد میں تصادم شروع ہو گیا۔ یہاں سے کش مکشِ حیات کی ابتدا ہوئی۔ قرآنِ کریم نے انسانی تمدن کے ان ماجریات و کیفیات کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے جسے قصۂ آدم کہتے ہیں۔ آدم آدمیّت کا نمائندہ ہے۔ آدم کو اختیار و ارادہ کی خصوصیت

دی گئی ہے اسے علم الاشیاء عطا کیا گیا ہے۔ کائنات کی تمام ملکوتی قوتیں اس کے تابع فرمان کر دی گئی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کشمکشِ زندگی میں متصادم و متخالف ابلیسی قوتیں بھی ہیں۔ ان میں خود انسان کے بیباک جذبات بھی شامل ہیں اور معاشرہ کے مستبد طاغوتی اربابِ اقتدار بھی۔ انسان کا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ کائنات کی تمام قوتوں کو تابع فرمان بنائے۔ پھر ان قوتوں کے ماحصل کو وحیِ آسمانی کی روشنی میں صحیح مصرف میں لاکر ایسا نظام قائم کرے جس میں تمام نوعِ انسانی کی ضروریاتِ زندگی بلا مشقت و تردد پوری ہوتی جائیں اور جملہ افرادِ انسانیہ کی مضمر صلاحیتیں نشو و نما پاکر تکمیل تک پہنچتی جائیں اور اس طرح اپنے ہبوط کے بعد صعود و عروج کی تمام منازل طے کر کے پھر وہ مقامِ رفعت و بلندی حاصل کرلے جو اسے شروع میں بطور اس کے منتہیٰ کے دکھایا گیا تھا۔

پھر ملتِ اسلامیہ کی تاریخ بھی قصۂ آدم کی سی داستان ہے۔ حضور ختمی مرتبت نے دنیا میں حکومتِ قرآنی کے قیام سے دکھا دیا کہ اس دنیا میں انسان کا نصب العینِ حیات کس قسم کی جنت کی زندگی ہے۔ اس کے بعد ہبوط ہوا۔ اور سخت ترین قسم کا ہبوط ہوا۔ ابھی تک یہ اس ہبوط کے زخموں کی مرہم پٹی میں مصروف ہے۔ جب اس کے زخم مندمل ہوں گے تو پھر آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو گی اور اس طرح اس کے اعمال کی بدولت وہ جنتِ ارضی حاصل ہو گی جس کی جھلک چودہ سو سال پیشتر دکھائی گئی تھی۔ وہ جنتِ ارضی جس کی حدیں اُخروی جنت سے جا کر مل جاتی ہیں کیونکہ زندگی جوئے رواں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش کے سوال کی طرح تخلیقِ انسانی کے آغاز کا مسئلہ بھی اربابِ مذاہب اور اہلِ فکر کے لئے ہمیشہ وجۂ کاوش رہا ہے۔ (وحی کو چھوڑ کر) مذاہبِ عالم کے پاس چونکہ سرمایۂ علم محض توہم پرستی ہے اس لئے ان میں انسانی تخلیق کے مسئلہ نے بھی عجیب و غریب شکلیں اختیار کر رکھی ہیں۔ لیکن ان میں "آدم" کا تصور کسی نہ کسی انداز میں ضرور ملتا ہے۔ عیسائیت نے اس تصور کی بنیاد پر عقائد و فلسفہ کی ایک عجیب و غریب عمارت قائم کر رکھی ہے۔ اس نے انسانی فطرت کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک حصہ وہ جو "ہبوطِ آدم" سے پیشتر کا ہے اور دوسرا حصہ وہ جو اس تنزل کے بعد کا ہے۔ اس تصور کے مطابق ہبوطِ آدم سے پہلے انسان فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتا تھا۔ اس زندگی میں گناہ کا تصور کہیں نہیں تھا۔ انسان معصوم تھا اور اس کی فطرت پاکیزہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ باہمی معاملات میں کوئی خرابی اور کسی قسم کا فساد نہیں تھا۔ اس کے بعد زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا جو ہبوط (FALL) کے بعد کا دور ہے۔ اس میں ہر انسانی بچہ پیدائش ہی سے گنہگار پیدا ہوتا ہے

اور گناہ کے اثرات کا الگ کر دینا کسی کے بس میں نہیں۔ لہٰذا اب انسان کی زندگی غیر فطری خطوط پر بسر ہوتی ہے جس کا نتیجہ وہ جہنم خیز فتنہ و فساد ہے جس میں انسانیت مبتلا چلی آرہی ہے۔ یہ دور اسی طرح چلا جائے گا تا آنکہ انسانوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس میں انسان کی نجات کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انسان حضرت مسیحؑ کے صلیب دیئے جانے پر ایمان لاتے اور ان کے خونِ ناحق کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھے۔ زمانہ کی اسی قسم کی تقسیم ہندوؤں کے ہاں ہے۔ ان کے تصوّر کی رُو سے ابتدا کا زمانہ ست جگ تھا جس میں راست بازی کا دور دورہ تھا۔ لیکن اس کے بعد اب کلجگ ہے جس میں باطل کو فروغ ہے۔ اب ست جگ پھر واپس نہیں آسکتا۔ لہٰذا جوں جوں انسانیت آگے بڑھتی ہے فتنہ و فساد کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

لیکن قرآن نے اس قسم کا کوئی تصوّر نہیں دیا۔ اس نے بتایا کہ انسان کے لئے تمثیلی (آئیڈیل) معاشرہ وہ ہے جس میں افراد کو اپنی پرورش اور نشو و نما کے لئے جگر سوز مشقتوں سے نہ گزرنا پڑے اور ایک فرد دوسرے فرد کی صلاحیتوں کے نشو و ارتقاء کا ذریعہ بنتا رہے اس کے بعد اس نے بتایا کہ یہ معاشرہ اس صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے قائم ہو سکے گا جو وحی کے ذریعے عطا کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ معاشرہ انسانوں کی اپنی سعی و کاوش کا ثمرہ ہوگا۔ اسے جنتِ ارضی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایسے معاشرہ کا قیام ہر وقت ممکن ہے اور ہر دَور کا انسان اسے سعی و عمل سے متشکّل کر سکتا ہے۔ نہ آدم کی فطرت گناہوں سے آلودہ ہے اور نہ ہی کوئی ست جگ ایسا ہے جو دوبارہ نہ آسکے۔ ہر انسانی بچّہ ایک سادہ لوح لے کر دنیا میں آتا ہے اس کے پاس انسانی ممکنات کی مضمر قوتیں ہوتی ہیں جن کی مناسب نشو و نما سے یہ خود اپنی ذات اور معاشرہ کے اندر حُسن پیدا کر سکتا ہے۔ جب یہ قوتیں وحیِ الٰہی کے تابع سرگرمِ عمل ہوتی ہیں تو ان کا نتیجہ خوشگواریوں کی جنت ہوتا ہے۔ مفاد پرست قوتیں اس معاشرہ کی تشکیل میں حائل ہوتی ہیں۔ انہی کو ابلیسی قوتیں کہا جاتا ہے جن کا ذکر آئندہ باب میں آئے گا۔ ان ابلیسی قوتوں کے مقابلہ سے انسانی قوتوں میں مزید جلا پیدا ہوتی ہے۔ یہی وہ کش مکش ہے جس میں زندگی کا راز اور ارتقاء کا سراغ پوشیدہ ہے۔ لہٰذا "آدم" انسانی زندگی کے اس نقطۂ آغاز کا نام ہے جہاں سے اس کی مضمر صلاحیتوں کے نشو و نما کے مواقع شروع ہوتے ہیں۔ آدم کا ہبوط، کسی بلند زندگی سے اسفل زندگی کی طرف تنزّل نہیں۔ یہ انسانی نصب العین کے حصول کی داستان کا نقطۂ آغاز ہے۔

اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ○ (۲/۳۴)

اِبلیس

قِصّۂ آدم کو رنگیں کر گیا جِس کا لہو!

قانونِ ارتقاء کی رُو سے استحکام و عروج اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ متصادم و متحارب قوّتوں سے نبرد آزما ہُوا جائے۔ جن انواع کو نامساعد احوال و ظروف سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا وہ آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے لیکن اگر اس کی راہ میں پتھروں کی (FALLS) نہ آئیں تو اس کی پُر سکوت روانی آہستہ آہستہ مبدّل بہ سکون ہو جائے اور یہ جوئے رواں جمود و تعطل کا ایک جوہڑ یا تالاب بن کر رہ جائے۔ بربط کے تاروں میں خوابیدہ نغمے بلا مضراب کبھی بیدار نہیں ہو سکتے۔ آئینۂ شمشیر میں کبھی آب و تاب پیدا نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ اسے سنگِ فساں پر صیقل نہ کیا جائے۔ چقماق کی شعلہ فشانی پتھر کی رگڑ کے بغیر ممکن نہیں۔ شیشہ میں کبھی جوہرِ آئینہ پیدا نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس کے پیچھے زنگار کی کثافت نہ ہو۔ اسی طرح خودی بھی اپنی نمود، استحکام اور عروج کے لئے اپنے سے غیر کو چاہتی ہے۔ اگر خودی اپنے غیر سے متقابل و متصادم نہ ہو تو ہنگامۂ کائنات سرد پڑ جائے۔ بزمِ ہستی کی رنگینیاں بے کیف ہو جائیں۔ یہ جہانِ رنگ و بو پھر سے مٹی کا گھروندا بن کے رہ جائے۔ خونِ رگِ کائنات کی تپش صرف خودی کے ولولۂ نمود کی مظہر اور اس کی لذتِ کشمکش کی رہینِ منت ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ:۔

صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او	غیرِ او پیداست از اثباتِ او
سازد از خود پیکرِ اغیار را!	تا فزاید لذتِ پیکار را

انسان پیدا ہُوا تو عالمِ آفاق کی تمام اشیاء اس کے لئے مسخر کر دی گئیں۔ وَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی

السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَمِیْعًا.

انسانی خودی کا اِستحکام

ان قوتوں سے کام لینے کے لئے اسے زیادہ سے زیادہ اپنی طبیعی اور دماغی قوتوں کو بروئے کار لانا تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، انسان فقط ان طبیعی اور دماغی قوتوں ہی کا نام نہیں۔ اس کے علاوہ اس کے اندر ایک اور شے بھی ہے جسے روحِ خداوندی کہا گیا ہے۔ یہی انسان کی انا ہے۔ یعنی جب انسان "میں" کہتا ہے تو اس سے مفہوم اس کا طبیعی پیکر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے ماورا کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ انا یا (EGO) اس کی خودی ہے اور اس خودی کا استحکام وارتقاء تکمیلِ شرفِ انسانیت۔ خودی کے استحکام وعروج کا تقاضا تھا کہ اس کے مدِ مقابل بھی کوئی قوت ہوتی جس سے تصادم اور کش مکش اس کے جوہر میں جِلا پیدا کرتا۔ اسی قوت کا نام ابلیس ہے، جس کے متعلق علامہ اقبالؒ کہتے ہیں؛

جہاں تا از عدم بیروں کشیدند ضمیرش سرد و بے ہنگام دیدند
بغیر از جان ما سوزے کجا بود ترا از آتشِ ما آفریدند

خوئے ابلیسی

ملائکہ انسان کے سامنے جُھک گئے اِبلیس مقابلہ کے لئے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اطاعت، انقیاد، تعمیلِ ارشاد۔ یہ ملائکہ کی خصوصیات ہیں۔ بغاوت، سرکشی، معصیت، انکار۔ یہ خوئے ابلیسی ہے۔ قصۂ آدم کی آیات پر غور کیجئے۔ یہ فرق نمایاں طور پر سامنے آجائیگا۔ تخلیقِ آدم کے وقت ملائکہ نے بھی ایک "اعتراض" پیش کیا تھا۔

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ (۲/۳۰)

بارِ الٰہا! کیا تو ایسا خلیفہ بنا رہا ہے جو زمین میں خونریزی اور فساد انگیزی سے ہنگامے برپا کر دے گا اور ایک ہم ہیں کہ ہمیشہ تیری تسبیح و تقدیس میں منہمک رہتے ہیں۔ (سو ایک ایسی ہنگامہ خیز ہستی کو ہم پر فوقیت دینا ہماری ناقص سمجھ میں نہیں آتا)۔

اسی قسم کا "اعتراض" ابلیس نے بھی پیش کیا۔

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ (۷/۱۲)

میں اس پیکرِ خاکی سے کہیں بہتر ہوں۔ اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا۔ میری تخلیق آتشیں

ہے (میں اس کے سامنے کیوں جھکوں!)۔

ملائکہ کے سامنے جب حقیقت واضح کی گئی تو ان کی فطرتِ سلیم نے سر جھکا دیا۔ عرض کیا۔ اے الٰہ العالمین! ہمارا شبہ ہماری کوتاہ علمی پر مبنی تھا۔

سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ۝ (۲/۳۲)

تیری ذات (تمام نقائص و عیوب سے) بلند ہے۔ ہمیں تو فقط اتنا ہی علم تھا جو تو نے عطا کر رکھا ہے۔ علیم و حکیم تو فقط تیری ہی ذات ہے۔

لیکن جب ابلیس کے سامنے حقیقت بے نقاب ہوئی تو اُس نے کیا کیا؟ جُھکا نہیں۔

اَبٰى وَ اسۡتَكۡبَرَ ٭ۖ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝ (۲/۳۴)

اس نے سرکشی اور تکبر اختیار کیا اور وہ نہ ماننے والوں میں سے تھا۔

اس کے بعد:

قَالَ اَرَءَيۡتَكَ هٰذَا الَّذِىۡ كَرَّمۡتَ عَلَىَّ (۱۷/۶۲)

اس نے کہا "دیکھ تو یہی وہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے؟

اگر یہی فیصلہ ہے تو میں اسے ماننے کے لئے تیار نہیں۔

قرآنِ کریم نے جہاں سجودِ ملائکہ کی داستانِ اطاعتِ انقیاد کو متعدد مقامات میں دہرایا ہے وہاں استکبارِ ابلیس کے قصۂ سرکشی و عدوان کو بھی کئی جگہ بیان کیا ہے۔ (مثلاً ۳۰-۱۵/۳۳؛ ۲۰ : ۷۳ - ۳۸/۷۶)۔ اس

ابلیس کیا ہے؟

حقیقت کو اسی مقام پر سمجھ لینا چاہیئے کہ ابلیس، انسان سے الگ، خارج میں موجود ہستی نہیں۔ یہ خود انسان ہی کی ایک خصلت کا نام ہے۔ انسان میں تین عناصر بنیادی ہیں۔ (۱) جذبات۔ (۲) عقل اور (۳) انسانی ذات یا خودی۔ عقل اس قوت کا نام ہے جو انسان کی ہر خواہش ہر ارادے اور ہر فیصلے کو بروئے کار لانے کے لئے اسباب و ذرائع بہم پہنچاتی، اور ان فیصلوں کو حق بجانب قرار دینے کے لئے دلائل تراشتی ہے۔ لہٰذا عقل فی ذاتہٖ نہ خیر ہوتی ہے نہ شر۔

انسانی جذبات وہ قوتِ محرکہ ہے جن سے انسانی خواہشات پیدا بھی ہوتی ہیں اور اس کے اندر اس قوت کو بھی ابھارتی ہے جس سے اس کے فیصلے بروئے کار آتے ہیں۔ لہٰذا جذبات بھی فی ذاتہٖ نہ خیر ہوتے

ہیں نہ شر۔

عقل اور جذبات کو کنٹرول کرنے والی قوت انسانی ذات کہلاتی ہے۔ اگر انسانی ذات کمزور رہے تو اس کے جذبات اس کی حیوانی سطح کی خواہشات پورا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں اور اس کی عقل ان جذبات کی لونڈی بن جاتی ہے۔ لیکن اگر انسانی ذات مستحکم ہو تو پھر جذبات اور عقل دونوں اس کے تابع رہتے ہیں۔

اور انسانی ذات، وحی کی رُو سے عطا کردہ مستقل اقدار کے اتباع سے مستحکم ہوتی ہے۔

لہٰذا بات یوں ہوئی کہ جب انسانی جذبات عقل کے تابع رہیں اور عقل وحی کے احکام کی اطاعت کرے، تو جذبات اور عقل دونوں کا نتیجہ خیر ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ وحی کی تعلیم سے سرکشی اختیار کر لیں تو اس کا نتیجہ شر ہوتا ہے۔ اس کے سرکش جذبات اور عقلِ بے باک کو شیطان یا ابلیس کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ابلیس خود انسان کے اندر ہوتا ہے۔ باہر کہیں نہیں ہوتا۔

چونکہ یہ نکتہ بڑا اہم اور بنیادی ہے اس لئے اسے ذرا اور تفصیل سے دہرایا جاتا ہے۔ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) انسانی زندگی کی ایک سطح وہ ہے جسے حیوانی زندگی (یا اس کی طبعی زندگی) کہتے ہیں۔ اس سطح پر اس کے تقاضے وہی ہوتے ہیں جو جبلّی طور پر (INSTINCTIVELY) حیوانات کے تقاضے ہوتے ہیں۔ یعنی تحفّظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) اور افزائشِ نسل کے تقاضے اور ان کے متعلقات۔ یہ تقاضے انسان کے اندر از خود کارفرما رہتے ہیں۔

انسان کے اندر دوسری چیز ہے عقل (INTELLECT) عقل کا ایک کام تو یہ ہے کہ حواس (SENSES) جو اطلاعات اس تک پہنچائیں ان میں ربط پیدا کر کے نتائج مستنبط کرے: دراس طرح ہر معاملہ کی (OBJECTIVE STUDY) کرے لیکن اس کا دوسرا کام یہ ہے کہ انسانی جذبات جو کچھ طلب کریں یہ اس کے فراہم کرنے کا انتظام سوچے۔ اس اعتبار سے عقل جذبات کی خادم ہوتی ہے۔ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ جذبات اس سے کہیں وہ کچھ کرتی جائے اور اس کے جواز (بلکہ حق بجانب ہونے) کے لئے دلائل بھی بہم پہنچاتی رہے۔

تیسری چیز انسان کے اندر وہ میں (I) ہے جس سے درحقیقت انسانی زندگی عبارت ہے۔ اس "میں" کا کام یہ ہے کہ وہ صحیح صحیح فیصلے کرے اور عقل سے ان فیصلوں کے مطابق کام کرائے۔ اگر

یہ "ہیں" کمزور ہے تو انسان کے سارے فیصلے جذبات کی رُو سے ہوں گے اور اس کی زندگی کی سطح حیوانی زندگی سے آگے نہیں بڑھے گی لیکن اگر اس کی "ہیں" کمزور نہیں تو اس کے فیصلے جذبات سے الگ ہٹ کر ہوں گے اور انہی فیصلوں کو انسانی فیصلے کہا جائے گا۔

یہ "ہیں" (I) ایک خاص نظام کے ماتحت (جو وحی کی روشنی میں متشکل ہوتا ہے) اس قدر استحکام حاصل کر لیتی ہے کہ ہر معاملے میں، خود فیصلے کر سکتی ہے۔ یہ فیصلے ایسے ہوتے ہیں جن سے ایک طرف زندگی کے طبعی تقاضے بھی کماحقہٗ، پورے ہوتے جاتے ہیں اور دوسری طرف استحکام ذات بھی زیادہ سے زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

جب عقل، انسانی جذبات کے تابع چلتی ہے تو اسے عقلِ سرکش یا علمِ بے باک کہا جاتا ہے۔ اس کا نام ابلیس ہے۔ جب یہی عقل وحیٔ کے تابع چلتی ہے تو عین انسانیت بن جاتی ہے۔ عقلِ بے باک اور انسانیت کے تقاضوں میں جو کشمکش ہوتی ہے، اسے ابلیسی کشمکش کہا جاتا ہے۔ یہی خیر و شر کی کشمکش ہے۔ اس کشمکش سے انسانی خودی مستحکم ہوتی چلی جاتی اور عقلِ بے باک پر غالب آتی چلی جاتی ہے۔ اپنی عقلِ بے باک کے بعد، دوسرے افراد کی عقلِ بے باک سے بھی تصادم ہوتا ہے۔ یہ وہ موانعات ہیں جو انسانی خودی کی راہ میں حائل ہوتے ہیں لیکن ان کی سختی اور سنگینی ہی سے خودی میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ بم کا فولادی خول (جو اس کے اندر کے بارود کے راستے میں سدِّ سکندری بن کر حائل ہوتا ہے) جس قدر زیادہ مضبوط ہوگا اتنی ہی زیادہ اس کے بارود کی قوّت ہوگی۔

جہاں تک عقل کے اس شعبے کا تعلق ہے جس میں یہ حواس کے ذریعے ہم پہنچائے ہوئے مواد (SENSE DATA) سے استنباطِ نتائج کرتی ہے اور کسی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے دلائل و براہین فراہم کرتی ہے، قرآن نے اس علم اور عقل کو بڑا بلند مقام عطا کیا ہے۔

علم و عقل کی فضیلت

قصۂ آدم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ علم ہی وہ جوہر تھا جس کی بنا پر آدم مسجودِ ملائک قرار پایا۔ قرآنِ کریم کے درخشندہ اوراق کو اُلٹتے جائیے شروع سے اخیر تک آپ دیکھیں گے کہ عقل و بصیرت، فہم و فراست، علم و دانش کو کس طرح وجۂ افتخار اور باعثِ عزّت و تکریم قرار دیا گیا ہے، قرآنِ حکیم درحقیقت مخاطب ہی عقل کو کرتا ہے۔ صاحبانِ دانش و بینش، اولی الابصار و اولی الارباب اس کے نزدیک انسانیت کے بلند ترین مدارج کے اہل ہیں۔

اس کے برعکس عقل وفکر سے کام نہ لینے والے بدترین خلائق.

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ
(۸/۲۲)

یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے بدتر حیوان وہ (انسان) ہیں جو بہرے گونگے ہو گئے جو عقل وفکر سے کام ہی نہیں لیتے۔

قرآن کریم میں اس قسم کی بے شمار آیات ہیں جن میں عقل وبصیرت کو وجہِ شرفِ انسانیت قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ جب علم وعقل، انسانی جذبات کے تابع کام کریں تو اس کا نتیجہ تباہی بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا. وہ، نبی اکرمؐ کی دعوت کی مخالفت کرنے والوں کا ذکر کرنے کے بعد، ان کا مقابلہ اسی قسم کی اقوامِ سابقہ سے کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (۴۶/۲۶)

ہم نے ان (اقوامِ سابقہ) کو تم سے بھی زیادہ تمکّن (غلبہ واستحکام) عطا کیا تھا اور نہیں سماعت وبصارت اور قلب (سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں وافر) عطا کی تھیں. لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے انکار کر دیا تو ان کا علم وعقل ان کے کسی کام نہ آیا اور جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔

آپ غور کیجئے دنیا میں جس قدر فساد اور خونریزیاں اور ظلم واستبداد ہے سب کی علت یہ ہے کہ انسان نے

علمِ بیباک کی تباہ کاریاں

اپنے علم وعقل کو سرکش وبے باک چھوڑ رکھا ہے. اور اسے اپنے سے بلند وبالا ہستی کے قوانین کے تابع نہیں رکھا۔ اسی کا نام ابلیسی نظام ہے جس میں ہر شخص، جماعت یا قوم جو دوسرے کو فریب دے سکے (یعنی وہ جو دوسرے کے علم وعقل سے زیادہ علم وعقل رکھے اور اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کئے جائے) نہایت کامیاب

ہے. علم کو جب وحیِ الٰہی کے ساحلوں میں محدود نہ رکھا جائے تو یہ ایک ایسا پُرشور دریا بن جاتا ہے جس کی طغیانیوں کے سامنے عدل، انصاف، اخلاق، تہذیب و تمدن جڑ سے اُکھڑ کر بہے چلے جاتے ہیں.

اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

یہی وہ ابلیس ہے جس نے (شعر کی زبان میں) روزِ ازل للکارا تھا کہ ؎

از زدِ من موجہ چرخ سکون پذیر
من بہ دو صرصرم. من بہ غوتندرم

ایک کفِ بدہاں سیلاب، ایک چرخ بہ آغوشِ طغیانی، ایک ہمہ تن رقص بگولہ، ایک جہاں سوز شعلہ جوالہ یعنی ابلیس!

ذرا غور فرمائیے. قرآن کریم نے اس قوتِ بےباک کی تندی و سرکشی کو کس شوکت و جلال کے انداز میں بیان فرمایا ہے تاکہ اس کی حقیقت چشمِ بصیرت کے سامنے واضح طور پر آ جائے. ابلیس سے کہا جاتا ہے کہ جاؤ! نکل جاؤ یہاں سے تم مردود، ملعون ہو. راندۂ درگاہ ہو تم ہمیشہ کے لئے سعادت و تکریم سے محروم ہو. بارگاہِ صمدیت کی طرف سے اس قسم کی سرزنش کچھ کم لرزہ فگن نہ تھی. لیکن اس کے جواب میں ابلیس کی طرف سے کسی رنج و تأسف یا شرم و ندامت کا اظہار نہیں ہوتا. وہ کہتا ہے کہ:

رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۝ (۱۵/۳۶)

اے میرے پروردگار! مجھے یومِ بعثت تک مہلت دے دے.

اور جب یہ درخواست منظور کر لی جاتی ہے تو کہتا ہے کہ

چیلنج | رَبِّ بِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ (۱۵/۳۹)

اے میرے رب! جب تو نے مجھے گمراہ کیا ہے تو دیکھ کہ میں اس آدم کی اولاد کے ساتھ کیا کرتا ہوں. میں ان سب کو تیرے راستے سے بہکا دوں گا اور وہ اس طرح کہ جن امور سے تو انہیں باز رکھنا چاہتا ہے میں انہیں ان کی نظر دل میں بیحد جاذب اور خوشنما بنا دوں گا.

دوسری جگہ ہے کہ جب اُس سے کہا گیا کہ تُو نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا، تو اس نے جواب میں کہا.

قَالَ ءَ اَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۝ (۱۷/۶۱)

کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تُو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔

اس کے بعد:

قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَىَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (۱۷/۶۲)

کہا دیکھ تو یہی وہ ہے جس کو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے؟ اچھا اگر یہی فیصلہ ہے تو مجھے قیامت کے لئے مہلت دے دے اور پھر دیکھ میں تیرے اس منتخب کردہ کی ذُرّیت کی ناک میں نکیل ڈال کر انہیں کس طرح تگنی کا ناچ نچاتا ہوں بجز معدودے چند کے۔

سورۂ صٓ میں ہے کہ جب ابلیس کو مہلت دے دی گئی تو اس نے کہا:

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (۳۸/۸۲)

کہا! تیرے عزت و جلال کی قسم! میں ان سب کو ضرور (راہِ حق سے) گمراہ کردوں گا۔

یہاں ابلیس کی قسم پر غور کیجئے۔ اے ارض و سمٰوٰت کے مالک! تیری قوت و شوکت کی قسم! تیرے جبروت و جلال کی قسم۔ تیرے غلبہ و تسلط کی قسم۔ میں انہیں برباد کرکے چھوڑدوں گا۔ گمراہ کرکے چھوڑدوں گا۔ ابلیسؔ چونکہ قوتِ بیباک کا مظہر ہے اس لئے اُس نے قسم بھی اللہ کے جبروت و جلال اور قوت و سطوت کی کھائی۔

ابلیسیت کا ایک اور پہلو

پھر اسے بھی دیکھئے کہ آدمؔ کو جب اپنی لغزش کا احساس ہوا تو اس نے فوراً اعتراف کیا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۔۔۔ (۷/۲۳) "اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے"۔ یعنی اس نے اپنی لغزش کا ذمہ دار اپنے آپ کو ٹھہرایا ہے اور ندامت سے آنکھیں جھکالیں۔ اس لئے کہا گیا کہ تمہاری، اس روش کا نتیجہ یہ ہے کہ تم اپنی اصلاح کرسکوگے۔ اس لئے تم پر بازآفرینی کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں۔

لیکن اس کے برعکس، جب ابلیسؔ سے کہا گیا کہ تُو نے معصیت کیوں کی، تو اس نے کہا کہ میں نے

لغزش کب کی ہے اَغْوَیْتَنِیْ (۱۵/۳۹) "تُو نے مجھے گمراہ کیا ہے" میں اپنی لغزش کا ذمہ دار نہیں. میں تو مجبور ہوں. سب کچھ تُو ہی کراتا ہے. اس کے جواب میں کہا گیا کہ تیری اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہے کہ تو کبھی اپنی اصلاح نہیں کر سکے گا. جو شخص اپنی غلطی کے لئے اپنے آپ کو ذمہ دار ہی نہیں ٹھہراتا وہ اپنی اصلاح کیسے کر سکتا ہے! اس لئے تجھ پر بازآفرینی کے دروازے نہیں کُھل سکتے. تیرے حصے میں ابدی طور پر مایوسی ہے. (ابلیس کے لفظی معنی "مایوس" کے ہیں).

آپ نے دیکھا کہ اس تقابل میں کتنی عظیم حقیقت پوشیدہ ہے. اس میں ایک طرف تو "تقدیر" کے (بظاہر) لاینحل مسئلہ کو اس حسن وخوبی سے حل کر دیا. اور دوسری طرف ارتکابِ جرم کے بعد اصلاح کے امکان کی صورت بھی واضح کر دی. اصلاح کا امکان اس کے لئے ہے جو اپنی ذمہ داری قبول کرے اور پھر بازآفرینی کے لئے صحیح راستے پر چل نکلے. جو اپنی ذمہ داری ہی قبول نہ کرے اور اپنی ضد پر اَڑا رہے، وہ اپنی اصلاح کس طرح کر سکتا ہے؟

غور کیجئے دنیا میں کس قدر تباہیاں اور بربادیاں ہیں جو محض اس بنا پر آتی ہیں کہ اپنی غلطی کا احساس ہو جانے کے بعد انسان اس کا اعتراف نہیں کرتا بلکہ ضد اور سرکشی اور نفس کی جھوٹی عزت کے خیال سے اس پر جما رہتا ہے اور اکثر وبیشتر کوشش کرتا ہے کہ اپنی غلطی کا جواز پیش کر کے اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرے. یہ ضد اور سرکشی فطرتِ ابلیسی کی بنا پر ہے جس میں کہیں جُھکنا نہیں لکھا. لغزش اور غلطی کے احساس کے بعد جھک جانا ہی انسانیت ہے. ضد پر اڑے رہنا ابلیسیت ہے. یہ ضد اور سرکشی یوں تو ہر شعبۂ زندگی میں ہلاکت آفریں ہے. لیکن مذہب کی دنیا میں اس کے جراثیم بڑے تباہ کُن ہوتے ہیں. یہ تمام تحزب وتشیع، یہ تمام فرقہ بازیاں اور گروہ سازیاں اور یہ تمام اختلافات، محض باہمی ضد اور سرکشی کی

باہمی ضد!

بنا پر ہیں ورنہ جب علم (قرآن) موجود ہو تو پھر اختلاف کی گنجائش کہاں ہے؟ لیکن یہ فطرتِ ابلیسی ہے کہ بڑے بڑے مقدس نقاب اوڑھ کر فریب دیتی اور وحدتِ ملت کو پارہ پارہ کر دینے والی تخریبی کوششوں کو مزین بنا کر اس کا نام "خدمتِ دین" رکھتی ہے. سورۂ بقرہ میں فرمایا کہ وحیِ خداوندی کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کے اختلافات کو مٹائے لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ:-

وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ

الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۚ (۲/۲۱۳)؛ (نیز دیکھئے ۲/۱۸؛ ۴۲/۱۴؛ ۴۵/۱۷)۔

اور یہ لوگ جو باہمدگر مختلف ہوئے، تو اس لئے نہیں ہوئے کہ ہدایت سے محروم اور حقیقت سے بے خبر تھے۔ نہیں! وحیِ الٰہی کے واضح احکام ان کے سامنے تھے (اور ان میں تفرقہ و اختلاف کی کوئی گنجائش نہ تھی) مگر پھر بھی محض آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کرنے لگتے تھے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کا شیوہ یہ ہے کہ جب ایک مرتبہ مُنہ سے نہ نکل گئی تو پھر ہاں نہیں کہیں گے خواہ ہزار دلائل اور لاکھوں بیّنات پیش کر دیجئے۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۷/۱۰۱)

(اے پیغمبر!) یہ ہیں (دنیا کی پرانی) آبادیاں جن کے حالات ہم تمہیں سناتے ہیں۔ ان سب میں اُن کے پیغمبر (سچائی کی) روشن دلیلوں کے ساتھ آئے۔ مگر اُن کے بسنے والے ایسے نہ تھے کہ جو بات پہلے جھٹلا چکے تھے اُسے (سچائی کی دلیلوں کے ساتھ) مان لیں۔ سو دیکھو اس طرح خدا ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو (ہٹ دھرمی) سے انکار کرتے ہیں۔

واضح دلائل سامنے ہیں۔ دل مانتا ہے کہ بات سچی ہے۔ لیکن ضد، بات کی پچ اور جھوٹی عزت کا پاس ہے کہ اقرار پر آمادہ نہیں ہونے دیتا۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (۲۷/۱۳-۱۴)

پھر جب ایسا ہوا کہ ان لوگوں کے پاس ہمارے واضح قوانین پہنچ گئے تو وہ (پھر بھی ضد اور ہٹ دھرمی سے) کہنے لگے کہ یہ تو کھلا ہوا جھوٹ ہے اور اُن کا (محض) سرکشی اور غرور کی وجہ سے انکار کرنے لگے حالانکہ اُن کے دل اُن کا یقین کر چکے تھے۔ سو دیکھو ان مفسدوں کا انجام کیسا (عبرت انگیز) ہوا۔

یہ گروہ سازیاں

ذرا اپنے گردو پیش نظر دوڑائیے اور دیکھئے کہ ملتِ اسلامیہ جیسی امتِ واحدہ میں، جن کا خدا ایک، رسول ایک، ضابطۂ حیات (قرآن) ایک، مرکزِ محسوس (قبلہ) ایک۔ اس قدر فرقے اور گروہ کس علت کی بنا پر ہیں. بادنیٰ تعمق یہ حقیقت آپ پر روشن ہو جائے گی کہ اس تفریق و انتشار کی تہ میں باہمی ضد اور تعصب کے سوا اور کچھ نہیں' اس لئے کہ خود قرآن شاہد ہے کہ علم (یعنی علمِ کتاب) آچکنے کے بعد اختلافات محض ضد کی بنا پر ہوتے ہیں. قرآن کے من جانب اللہ ہونے کی تو سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس میں اختلاف نہیں.

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا (۴/۸۲)

پھر کیا یہ لوگ قرآن (کے مطالب پر) غور و فکر نہیں کرتے؟ اور خدا کی دی ہوئی بصیرت سے کام نہیں لیتے) اگر یہ خدا کے سوا کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا تو ضروری تھا کہ یہ اس کی بہت سی باتوں میں اختلاف پاتے' (حالانکہ وہ تو اپنی ساری باتوں میں اوّل سے آخر تک کامل طور پر ہم آہنگ اور یکساں ہے)۔

اور یہ فرقے بندیاں

پھر کیا یہ حقیقت دل خراش اور یہ حدیث الم انگیز نہیں کہ اس کتاب کے ماننے والے جس کے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہو کہ اس میں اختلاف نہیں، اس قدر اختلافات میں الجھے ہوتے ہوں اور ان اختلافات کو قائم رکھنے کی ہر کوشش کو جہاد فی سبیل اللہ اور خدمتِ دین قرار دے رہے ہوں؛ حالانکہ قرآن نے انہیں متنبہ کر دیا تھا کہ

وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (۳۱-۳۲/۳۰)

(اور دیکھو! کہیں (توحید پرست ہو جانے کے بعد) مشرکین میں سے نہ ہو جانا. یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفریق پیدا کر ڈالی اور الگ الگ گروہ بن بیٹھے. (پھر اس وقت حالت یہ ہو جایا کرتی ہے کہ) ہر فریق اپنے اپنے خیالات پر خوش ہوتا ہے اور اپنے آپ کو برسرِ حق اور دوسروں کو باطل پر سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے۔

جو ملت کی وحدت کو توڑ کر یوں فرقہ بندی کی لعنت میں گرفتار ہو جائے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝

(۶/۱۶۰)

(اے پیغمبر!) جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور الگ الگ گروہ بن گئے تمہیں ان سے کچھ سروکار نہیں ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ پھر وہی بتلائے گا کہ جو کچھ کرتے رہے ہیں اس کی حقیقت کیا تھی؟

سب اسی فطرتِ ابلیسی کے مظاہر ہیں

یہ اسی فطرتِ ابلیسی کے مظاہرے ہیں جو مختلف پردوں میں مختلف ادوار میں، گردش کرتی رہتی ہے۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات ومنات

ابلیس سے حفاظت

اب سوال یہ ہے کہ ابلیس کی یورش سے حفاظت کا سامان کیا ہو؟ اس سے چھٹکارا کس طرح حاصل کیا جائے؟ مشرق کی رہبانیت نے اس کا آسان علاج سوچ لیا کہ سر میں درد ہو تو سر کٹا دیا جائے۔ یعنی ابلیسی کشمکش سے تنگ آ کر ترکِ دنیا اور ترکِ علائق پر اُتر آئے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ تو شکست خوردہ ذہنیت (DEFEATEST MENTALITY) کا ثبوت اور ضعفِ خودی کی دلیل ہے۔ یہ انتہائی یاس اور نا اُمیدی کا مظاہرہ ہے، جو خود ابلیس کا مقصد و منشاء ہے۔ اگر منشاء خداوندی یہی ہوتا کہ انسان غاروں میں جا بیٹھیں تو کشمکش حیات کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس صورت میں تو خلافتِ ارضی کے لئے آدم سے بڑھ کر فرشتے زیادہ موزوں تھے۔ تصوف کی رہبانیت کا مسلک اس امر کا اعتراف ہے کہ اس باب میں (معاذ اللہ) خدا کا فیصلہ صحیح نہیں تھا۔

رہبانیت میں نہیں

یہ لوگ درحقیقت بہت سطح بین تھے۔ انہوں نے سوچا ہی نہیں کہ انسانی خودی (نفسِ انسانی) کے عروج وارتقاء کے لئے کشمکشِ زندگی

ابلیسی قوتوں سے مقابلہ کس قدر ضروری ہے۔ یہ تصادم و تزاحم عین تقاضائے فطرت ہے۔ لہٰذا رہبانیت کی زندگی غیر فطری اور سہل انگار ذہنِ انسانی کی ایجاد ہے۔ اسی لئے قرآن نے اعلان کردیا کہ رہبانیت کی زندگی خدا کی طرف سے عائد کردہ فریضہ نہیں۔ یہ لوگوں کے اپنے ذہن کی ایجاد ہے۔ اور ایجاد بھی ایسی کہ اسے یہ لوگ نباہ بھی نہیں سکتے۔ (دیکھئے ۵۷/۲۷)۔ خلافِ فطرت روش کو انسان نبھا کیسے سکتا ہے؟ یہ کشمکشِ حیات سے فرار (ESCAPISM) ہے جسے تقدس کے لباس میں چھپایا جاتا ہے۔ یہ فریبِ نفس ہے۔

نہ ہی مغرب کی مادیت میں

دوسری طرف مغرب کی مادہ پرستی ہے کہ اس نے نظامِ زندگی پر یکسر ابلیس کو مسلط کر رکھا ہے جس کا نتیجہ عدمِ سکون اور فقدانِ طمانیت کی وہ جہنم ہے جس میں آج یورپ ہی نہیں بلکہ ہر وہ سرزمین مبتلا ہے جس پر اس کے ابلیسی نظام کا کچھ بھی پرتو پڑ چکا ہے (اور آج دنیا کا کونسا گوشہ ایسا ہے جو اس نظام کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا ہے؟) مغرب کے نظام میں ہوا یہ کہ

عقل ناپید و خردمی گزوشس صورتِ مار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا

لہٰذا یہ مسلکِ زندگی کسی طور بھی انسانوں کے شایانِ شان نہیں۔ اس میں تو ابلیس کا چیلنج پوری قوتوں کے ساتھ فاتح و بالادست بن کر اُبھر کر سامنے آگیا ہے۔ اس نے یہی کہا تھا کہ

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ○

(۷/۱۶-۱۷)

اس پر ابلیس نے کہا "چونکہ تو نے مجھے اس طرح گمراہ کردیا ہے، تو اب میں بھی ضرور ایسا کروں گا کہ تیری سیدھی راہ سے بھٹکانے کے لئے بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں۔ پھر سامنے سے پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے (غرضیکہ ہر طرف سے) ان پر آؤں اور ان میں سے اکثروں کو شکرگزار نہ پائے گا۔

یہی وہ متبعینِ ابلیس ہیں جن کے متعلق اسی وقت کہہ دیا گیا تھا۔

مَنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ لَاَمۡلَـئَنَّ جَهَـنَّمَ مِنۡكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ○ (۷/۱۸؛ نیز ۱۵/۴۳؛ ۳۸/۸۵)

بنی آدم میں سے جو کوئی تیری پیروی کرے گا، تو (وہ تیرا ساتھی ہوگا، اور) میں ایسا کروں گا کہ (پاداشِ عمل میں) تم سب سے جہنم بھر دوں.

تیسرا گروہ اب تیسرا گروہ باقی رہ گیا. یہ وہ گروہ ہے جس کے متعلق ابلیس کے چیلنج کے جواب میں کہہ دیا گیا تھا کہ جاؤ اپنی ساری قوتیں صرف کر دو. اپنے سارے حربے آزما دیکھو. اپنا تمام لشکر دائیں بائیں سے یورش کر کے لے آؤ. لیکن:

اِنَّ عِبَادِیۡ لَيۡسَ لَكَ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡغٰوِيۡنَ ○ (۱۵/۴۲)

جو میرے (مخلص) بندے ہیں اُن پر تیرا کچھ زور نہیں چلے گا. صرف انہی پر چلے گا جو (صحیح) راہ سے بھٹک گئے.

دوسری جگہ ہے.

وَ اسۡتَفۡزِزۡ مَنِ اسۡتَطَعۡتَ مِنۡهُمۡ بِصَوۡتِكَ وَ اَجۡلِبۡ عَلَيۡهِمۡ بِخَيۡلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكۡهُمۡ فِى الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ وَ عِدۡهُمۡ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا ○ اِنَّ عِبَادِىۡ لَيۡسَ لَكَ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيۡلًا ○ (۱۷/۶۴)

ان میں سے جس کسی کو تو اپنی صدائیں سُنا کر بہکا سکتا ہے بہکانے کی کوشش کر لے، اپنے لشکر کے سواروں اور پیادوں سے حملہ کر، ان کے مال و اولاد میں شریک ہو جا، ان سے (طرح طرح کی باتوں کے) وعدے کر، اور شیطان کے وعدے تو اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ سرتا سر دھوکا ہیں. لیکن جو میرے (سچے) بندے ہیں اُن پر تو قابو پانے والا نہیں. تیرا پروردگار (اُن کی) کارسازی کے لئے بس کرتا ہے.

یعنی جو لوگ قانونِ خداوندی کے مطابق نظامِ معاشرہ قائم کریں گے اُن پر ابلیس کا تسلط نہیں جم سکے گا. وہ ابلیس پر غالب رہیں گے. ابلیسی قوتیں سب ان کے زیرِ فرمان ہوں گی. علم، عقل، دولت، قوت، افراد

کی کثرت۔ یہ تمام چیزیں سرکش و بیباک نہیں رہیں گی۔ یہ سب ان حدود کے اندر کارفرما رہیں گی جو قوانینِ خداوندی

ابلیس کو "مسلمان" کرلیا جائے

نے متعین کر رکھی ہیں۔ ابلیس کو ہلاک نہیں کیا جا سکتا (اُسے تو قیامت کے لئے مُہلت مل چکی ہے) اسے زیرِ تسخیر رکھا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر اُسے "مسلمان"[1] کرلیا جائے گا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

علم را بے سوزِ دل خوانی شر است ۔۔۔ نورِ اُو تاریکیِ بحر و بر است
کشتنِ ابلیس کارے مشکل است ۔۔۔ زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی ۔۔۔ کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی
خویش را براہرمن باید زدن ۔۔۔ تو ہمہ تیغ آں ہمہ سنگِ فسن

اپنے اندر اتنی قوت پیدا کی جائے جو تمام ابلیسی قوتوں کا مقابلہ کر سکے اور پھر اس قوت کے اجتماعی اثر سے ایسا نظام قائم کیا جائے جو قوانینِ الٰہیہ پر مشتمل ہو۔ یوں ابلیس پر لگام دے کر تابع فرمان بنا لیا جائے۔ غور

یہ کیسے؟

فرمایئے کہ وہ قوت کس قدر عظیم الشان اور کوہ شکن ہوگی جو ابلیس کے اشہبِ عنان گسیختہ کو زیرِ پالان لے آئے؛ یہ قوت سوائے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے اور کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی اور قوانینِ خداوندی کی اطاعت اس معاشرہ کے اندر کی جا سکتی ہے جو وحی کی رُو سے متشکل ہوتا ہے۔ افراد کے اندر وہ قوت جو ابلیسی کششوں کا مقابلہ کر سکے اسی معاشرہ کے اندر پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے جب آدم کے ساتھ ابلیس کو دنیا میں بھیجا گیا ہے تو بنی آدم سے کہہ دیا گیا تھا کہ:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ (۲/۳۸)

لیکن (یاد رکھو) جب کبھی ایسا ہوگا کہ ہمارا ضابطۂ ہدایت تم تک پہنچے گا تو تم میں سے جو کوئی اس کی پیروی کرے گا اس کے لئے کسی طرح کا کھٹکا نہیں کسی طرح کی غمگینی نہیں ہوگی۔

ابنِ آدم سے کہہ دیا گیا تھا کہ مت گھبراؤ اگرچہ ابلیسی لشکر کا ساز و سامان بڑا خوفناک اور ہراس انگیز ہے۔

---

[1] ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "میں نے اپنے شیطان کو مسلمان کر لیا ہے۔"

لیکن تمہیں ہم نے اکیلا نہیں چھوڑا، تمہیں ایک ایسی شمشیر سے مسلح کر دیا گیا ہے کہ طاغوتی قوتیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں ؎

اگرچہ عقل فسوں پیشہ لشکرے انگیخت
تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست

یہ ہے وہ قوت جس کی بنا پر ایک عبدِ مومن ابلیس سے بھی سجدہ کرا لیتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں پہنچ کر وہ علی وجہ البصیرت کہہ سکتا ہے کہ کس قدر صحیح ہے یہ فرمان کہ وَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ایسی تسخیرِ فطرت جس میں ابلیس انسان سے قدم قدم پر سجدے کرائے حکومت نہیں محکومیت ہے۔ اصل حکومت تو اس میں ہے کہ تمام ابلیسی قوتیں سر جھکائے منتظرِ فرامین کھڑی ہوں۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان "اِنَّ عِبَادِیۡ" کے گروہ میں شامل ہو جائے۔ اللہ کا محکوم اور ساری کائنات کا حاکم! یعنی جب انسان ایسا معاشرہ قائم کر لے جس میں قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر ہو۔

اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آ گئی کہ شر کتنا ہی عالمگیر نہ ہو جائے، انسان کو ایسی صلاحیت عطا کر دی گئی ہے جس سے یہ اُس پر غالب آ سکے۔ لہٰذا وہ نظریات جن کی رُو سے کہیں یہ کہا جاتا ہے کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کی رُو سے گنہگار ہوتا ہے اور اس گناہ کے دھبے کو وہ کسی صورت میں دھو ہی نہیں سکتا۔ یا یہ کہ انسانی سیرت اس کے موروثی اثرات یا ابتدائی تعلیم و تربیت سے مرتب ہوتی ہے اور جس قسم کی یہ سیرت بن جاتی ہے اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا، سب باطل ہیں۔ انسان کے اندر ایسی قوت موجود ہے جس سے یہ ان تمام اثرات کو زائل کر سکتا ہے۔ لیکن یہ قوت بیدار ہوتی ہے قوانینِ خداوندی کے اتباع سے۔

قصۂ آدم کے علاوہ قرآن کریم میں دو جگہ اور بھی ابلیس کا ذکر آیا ہے۔ ایک سورۂ شعراء میں جہاں کہا:

وَ جُنُوۡدُ اِبۡلِیۡسَ اَجۡمَعُوۡنَ ؈ (۲۶/۹۵)
اور ابلیس کے لشکر سب کے سب۔

دوسرے سورۂ سبا میں۔ جہاں کہا اہلِ سبا نے اپنے آپ پر ظلم کیا جس کی بنا پر اللہ تعالےٰ نے انہیں مٹا کر ان کی فقط داستانوں کو باقی رکھا۔ اس طرح ابلیس کا خیال اُن کے متعلق پورا ہو کر رہا۔

وَ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۳۴/۲۰)

اور واقعی ابلیس نے ان لوگوں کے بارہ میں اپنا گمان صحیح پایا کہ یہ سب اسی کی راہ پر ہو لیے۔ مگر ایمان والوں کا گروہ۔

ابلیس جنات میں سے

سورۂ کہف میں ابلیس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ (۱۸/۵۰)

اور جب ہم نے ملائکہ کو حکم دیا "آدم کے سامنے جُھک جاؤ" اور سب جُھک گئے مگر ابلیس نہیں جھکا۔ وہ جنّ میں سے تھا۔

"جنّات" کی تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی۔ اس مقام پر صرف اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ

(۱) ہر وہ قوت جو انسانی نگاہوں سے اوجھل ہو (نظر نہ آسکتی ہو) جنّ کہلاتی ہے۔ اور انسانی جذبات چونکہ آنکھوں سے دیکھے نہیں جاسکتے اس لئے انہیں اس اعتبار سے جنّ کہا گیا ہے۔ اور

(۲) ابلیس نے اپنے متعلق جو کہا تھا کہ مجھے آگ سے پیدا کیا گیا ہے، تو یہ اس سے اس کی خوئے سرکشی (آتش مزاجی۔ اشتعال انگیزی) کی طرف اشارہ تھا۔

ہمارے ہاں ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ ابلیس، ملائکہ میں سے (بلکہ ان کا استاد۔ معلّم الملکوت) تھا۔ یہ بھی غلط ہے۔ ابلیس نہ ملائکہ میں سے تھا، نہ وہ ایسا ہو سکتا تھا۔ سورۂ اعراف میں جہاں کہا گیا ہے:

ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ (۷/۱۱)

پھر ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ "آدم کے آگے جُھک جاؤ"۔ اس پر سب جُھک گئے۔ مگر ابلیس نہ جھکا۔ کہ وہ جُھکنے والوں میں سے نہ تھا۔

تو اس کے یہ معنی نہیں کہ " ابلیس کے سوائے اور ملائکہ نے سجدہ کر دیا"۔ عربی زبان میں اس قسم کے اِلّا (سوا) کو استثنائے منقطع کہتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ (مثلاً) پھل تو سب آگئے ہیں لیکن مٹھائی ابھی تک نہیں آئی۔ لہٰذا اس کے معنی ہیں کہ ملائکہ نے تو سب کے سب نے سجدہ کر دیا۔ لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ واضح رہے کہ ابلیس کو بھی سجدہ کا حکم اسی طرح دیا گیا تھا جس طرح ملائکہ کو دیا تھا۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۚ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ (۷/۱۲)۔

خدا نے کہا "کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟ اُس نے کہا۔ اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اسے مٹی سے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ملائکہ اور ابلیس درحقیقت ان قوتوں کے مظاہر ہیں جو عالمِ انفس و آفاق میں عمل پیرا ہیں۔ عالمِ آفاق کی تمام قوتیں انسان کے لئے مسخر کر دی گئیں۔ لیکن عالمِ انفس (انسان کی داخلی دنیا) میں ایسی قوت بھی ہے جو خود اس کے ارتقائے ذات کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ اسے ابلیسی قوت کہا جاتا ہے۔ اور چونکہ اس قوت کو مجبور نہیں پیدا کیا گیا (جس طرح خارجی کائنات کی قوتیں خاص قوانین کے مطابق کام کرنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں) اس لئے اس کے متعلق کہا گیا کہ اس نے انسان کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اب انسان کا کام یہ ہے کہ اس سرکش قوت کو اپنے سامنے جھکا لے۔ یہ ہے منصبِ انسانیت۔ جس نے ایسا کر لیا اس کی خودی میں استحکام اور شرفِ انسانیت میں بالیدگی پیدا ہو گئی۔ جو اس قوت سے دب گیا۔ اس کے جوہرِ انسانیت فنا ہو گئے۔ [باقی رہا یہ کہ ابلیس جنوں میں سے کس طرح تھا؟ سو اس کے لئے جنات کی تفصیل دیکھئے جو ذرا آگے چل کر سامنے آجائے گی]۔

ابلیس مایوسی کا مظہر ہے

لفظ ابلیس کو پھر دیکھئے۔ اس کے مادہ (ابلس) سے ظاہر ہے کہ یہ انتہائی مایوسی کا مظہر ہے۔ سب سے بڑی ابلیسیت

جس کا مقابلہ انسان کو کرنا ہے یاس اور ناامیدی ہے. حقیقت یہ ہے کہ زندگی نام ہی اُمید و آرزو کا ہے۔ جب تک کسی سینہ میں آرزو کی کرن موجود ہے زندگی کی رمق باقی ہے. آرزوؤں کے فنا ہو جانے کا نام موت ہے۔ زندہ رہنے کی اُمید اور آگے بڑھنے کی آرزو ہی ہے جس سے انسان کی خودی میں ارتقاء اور اس کے جوہرِ خفتہ میں بیداری پیدا ہوتی ہے.

زندگانی را بقا از مدّعا است　　کاروانش را درا از مُدّعا است
زندگی در جستجو پوشیدہ است　　اصلِ اُو در آرزو پوشیدہ است
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بو است　　فطرتِ ہر شے امینِ آرزُو است

زندگی یہ ہے کہ انسان کے سامنے ایک درخشندہ نصب العین ہو اور اس نصب العین کے حصول کی تڑپ برقِ تپاں کی صورت میں رگ و پے میں جاری و ساری. کائنات کی تمام رنگینیاں نقطۂ آرزو کے اندر پوشیدہ ہیں، سفرِ حیات میں جہاں یاس و نااُمیدی نے غلبہ پا لیا انسان پر عملاً موت طاری ہو گئی. ابلیس کا سب سے بڑا حربہ یہ ہے کہ انسان پر یاس و نااُمیدی طاری کر دے. اس کے جنود و عساکر (الواع و اقسام کے شیاطین) ایسے اسباب پیدا کرتے رہتے ہیں، جن سے اس پر خوف مسلّط ہو جاتے. اس کے حوصلے پست اور ولولے سرد پڑ جائیں. اس پر خوف و حزن طاری ہو جائے اور یہ جی چھوڑ کر کشمکشِ حیات سے کنارہ کش ہو جائے. مایوسیوں کی ان ظلمت خیز گھٹاؤں میں یا تو انسان چپ چاپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کسی گوشۂ تنگ و تاریک میں سر بزانو بیٹھ جاتا ہے. اور یا (بعض اوقات) شدّتِ یاس و غم سے مغلوب ہو کر تخریب پر اُتر آتا ہے اور اپنے مقاصد کی جو عمارت برسوں کے پسینہ اور خون سے بہزار مشقت تیار کی تھی اُسے خود اپنے ہاتھوں سے توڑ پھوڑ کر خاک میں ملا دیتا ہے. کسی گوشۂ تیرہ تار میں سر بزیری ہو یا اس قسم کی حرکتِ مذبوحی، بہرحال دونوں شدّتِ یاس اور فرطِ نااُمیدی کے مظاہر ہیں. یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ابلیس اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر انسان پر ہنستا ہے. مایوسیوں کی اس تاریکی میں اگر کہیں سے شعاعِ اُمید نظر آسکتی ہے تو وہ ایمان کی شمعِ فروزاں ہے جو ان بھیانک اور سیاہ بادلوں پر جگمگاتے، نقرئی حروف میں لکھ دیتی ہے کہ

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝

اور دیکھو، نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو، تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو. بشرطیکہ تم مومن ہو. (۳/۱۳۹)

ایمان کے معنی ہیں اپنے نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم. اور مومن اسے کہتے ہیں جس کے اس یقین میں دنیا کی بڑی سے بڑی مشکل، ذرا سی لغزش نہ پیدا ہونے دے. ایمان کی روشنی میں ہی وہ شمعِ تابندہ تھی جس کا وعدہ آدم سے کیا گیا تھا. جب اس سے کہا گیا تھا کہ دنیا میں جاؤ اور پوری قوت سے ابلیس کے حربوں کا مقابلہ کرو. یاد رکھو تم تنہا نہیں ہو.

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ (۲/۳۸)

لیکن (یاد رکھو) جب ہماری طرف سے تمہارے پاس ضابطۂ حیات آئے گا تو تم میں سے جو کوئی اس ضابطہ کی پیروی کرے گا اس کے لئے نہ کسی طرح کا کھٹکا ہو گا نہ کسی طرح کی غمگینی.

اس کا علاج

ابلیس کے جنود و عساکر سے خوف اور اپنی اُمیدوں کی موت سے حزن دونوں ایمان کی کمزوری کی دلیل اور ضعفِ خودی کا مظاہرہ ہیں. ایمان کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ خوف اور حزن پاس نہ پھٹکنے پائیں. یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق ابلیس سے کہہ دیا گیا تھا کہ جاؤ، اپنا سارا زور لگا کر دیکھ لو.

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۷/۶۵)

میرے بندوں پر تیرا قبضہ نہیں ہو سکے گا.

شمعِ ایمانی کا ایک لمعہ

ذرا تصور میں لائیے وہ وقت کہ چاروں طرف سے مخالفتوں کے ہجوم نے گھیر رکھا ہے. گھر بار چھوڑ کر ایک ویرانے پہاڑ کے مہیب غار میں چھپے بیٹھے ہیں. تعاقب کرنے والے گھوڑوں کی ٹاپ کی آوازیں کانوں میں آ رہی ہیں. دشمن اپنے پورے سامانِ ہلاکت کے ساتھ قریب سے قریب تر ہوتے چلے آ رہے ہیں. یہ بالکل بے ساز و سامان دشمن کی عین زد میں آ چکے ہیں. بظاہر حفاظت کا کوئی سامان اور مدافعت کا کوئی ذریعہ موجود نہیں. گویا ابلیس کا پورا لشکر اپنی ساری قوتوں کے ساتھ طوفانِ بلا کی طرح اُمنڈے چلا آ رہا ہے. ایک دوست دوسرے کی پیشانی پر کچھ تردد کے آثار محسوس کرتا ہے اس کا یہ تردد اپنی خاطر نہیں بلکہ اس ذاتِ اقدس ؐ و اعظم کی خاطر ہے جو دنیا کی ہر شے سے محبوب ہے کہ ایسے میں ایمان کی پوری پوری قوتوں کے ساتھ،

زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ایک دُنیا جلو میں لئے اس رفیقِ مشفق ؐ کے قلبِ مطمئنہ سے یہ جان بخش آواز آتی ہے کہ

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ۚ (۹/۴۰)

غمگین نہ ہو یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

یہ ہے وہ "مقامِ عبدیت" جس کا ذکر اوپر کی آیت میں کیا گیا ہے اور جہاں انسان ابلیس سے مغلوب نہیں ہو سکتا۔

دوسری طرف ابلیس کی سرکشی پر غور کیجئے۔ جس انداز سے قرآنِ کریم میں اس کا قصہ مذکور ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسے اپنے غلبہ و استیلاء پر کس قدر ناز ہے۔ اس کے بعد سوچئے کہ انسان (جس کا منصبِ حیات یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں، کشمکشِ حیات کے ہر معرکہ میں، ابلیس کی ہر قوت کو اس طرح شکست دے کہ اس کی ہڈیاں چٹخنے لگ جائیں) کتنی بڑی قوتوں کا مالک بنایا گیا ہے لیکن یہ قوتیں صرف ایمان اور اعمالِ صالحہ سے بیدار ہوتی ہیں۔ وہ اعمال جو اس میں یہ صلاحیت پیدا کر دیں، کہ دنیا کی بڑی سے بڑی ابلیسی قوت اس کے سامنے آئے لیکن جب یہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی طرف ہاتھ بڑھائے تو اس پر لرزہ طاری ہو جائے، اس کا کلیجہ کانپ اُٹھے، آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہو، وہ میدان چھوڑ کر پہاڑوں کے غاروں میں مُنہ چھپاتا پھرے۔ یہ ہے ابلیس کے مقابلہ میں ایک مردِ مومن کا مقام لیکن کیا آج کا مسلمان بھی اس مقام کا دعویدار ہو سکتا ہے۔ وہ

ابلیس اور ہم!

مسلمان جس کی حالت یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی طاغوتی قوتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ ابلیس کی قوت کے تصوّر سے اس کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ ابلیسی نظام اپنے پورے دبدبہ و جلال سے دنیا پر چھا رہا ہے اور یہ اس کے ماتحت نہایت اطمینان سے زندگی بسر کئے جا رہا ہے۔ قرآن نے کہا تھا کہ جب ابلیس کا مقابلہ ہو تو فوراً اپنے آپ کو تائید و نصرتِ خداوندی کی پناہ میں لے آیا کرو جو اس کے قوانین کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن پناہ آج (اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ) کے الفاظ دُہرانے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ نتیجہ یہ کہ آج ابلیس کو کسی تردّد کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم خود لپک کر اس کے دامِ میں گرفتار ہونے کے لئے چلے جاتے ہیں۔

صید خود صیّاد را گوید بگیر
الاماں از بندۂ فرماں پذیر

ہم تو ابلیسانہ کشش و جاذبیت کے ذرا سے فریب اور اس کی تخویف و ترہیب کی چھوٹی سی دھمکی کے بھی حریف نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ اس کی قہرمانی قوّتوں کو استحقار کی ہنسی سے ٹھکرا کر رکھ دیں۔ ابلیس کی فرعونی قوّتوں کا تو تقاضا ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی فولادی پنجے والا مردِ مومن آئے جس سے دو ہاتھ کرنے میں اسے بھی لذّتِ پیکار ملے۔ ان مٹی کے پتلوں سے زور آزمائی میں اسے کیا لذّت مل سکتی ہے؟ اسی لئے اُس نے (بالفاظ علّامہ اقبالؒ) بحضور ربّ العزّت "فریاد" کی ہے کہ ؎

آں چناں تنگ از فتوحاتِ آدم　　پیشِ تو بہرِ مکافاتِ آدم
منکرِ خود از تو می خواہم بدہ　　سوئے آں مردِ خدا راہم بدہ
بندۂ باید کہ پیچد گردنم　　لرزہ انداز د نگاہش در تنم
اے خدا! یک زندہ مردِ حق پرست　　لذّتے شاید کہ یابم در شکست

لیکن آج ایسا بندۂ حق پرست کہاں سے ملے؟ اس قسم کے مردانِ خود آگاہ و خدامست صرف اُس معاشرے میں پیدا ہو سکتے ہیں جو قوانینِ خداوندی کی رُو سے تشکّل کیا جائے اور ایسا معاشرہ آج اس وسیع و عریض زمین کے کسی چپّہ بھر گوشے میں بھی موجود نہیں ہے۔ اس لئے آج ساری دنیا پر ابلیسی نظام ہی مسلّط ہے۔ یعنی وہ نظام جس میں عقلِ انسانی اس کے جذبات کی لونڈی بن کر رہ گئی ہے اور زندگی کا مقصد رہ گیا ہے ان حیوانی جذبات کی تسکین۔ انسانیت اور اس کے شرف کا دنیا میں کہیں نام نہیں اسی لئے دنیا میں کہیں احترامِ آدمیت نہیں۔

لیکن اس کے باوجود، ہمارے لئے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لئے کہ ابلیسؔ پر غالب آنے کا طریق بتایا گیا تھا "وحیِ خداوندی کا اتّباع۔" اور وحیِ خداوندی ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ ہم اب بھی جی چاہے ایسا معاشرہ تشکّل کر سکتے ہیں جس میں یہ قوانینِ خداوندی عملاً نافذ ہوں۔ یہی معاشرہ ابلیسؔ کے چیلنج کا جواب اور ہماری ناامیدیوں کا علاج ہو گا۔

"ابلیس اور شیطان" میں کیا ربطِ باہمی ہے، اسے "شیطان" کے عنوان میں واضح کیا

جائے گا۔

جن

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، ابلیس کے متعلق کہا ہے کہ

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ (۱۸/۵۰)

اور جب ہم نے ملائکہ کو حکم دیا آدم کے آگے جُھک جاؤ تو وہ سب جُھک گئے تھے۔ مگر ابلیس نہیں جھکا۔ وہ جن میں سے تھا۔

اور یہ بھی کہ اس کی پیدائش آگ سے ہوئی تھی۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ○ (۷/۱۲)

خدا نے فرمایا "کس بات نے تجھے جُھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟" کہا "اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ تُو نے مجھے آگ سے پیدا کیا۔ اسے مٹی سے۔"

دوسرے مقام پر ہے کہ اللہ نے جانّ (جن) کو آگ سے پیدا کیا۔

وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۚ (۵۵/۱۵)

اور جنات کو آگ سے شعلے سے پیدا کیا۔

اور انسان کو اُن کے بعد پیدا کیا۔

وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (۱۵/۲۷)

اور ہم نے جانّ کو اس سے پہلے تیز آگ سے پیدا کیا۔

جن۔ ایک آتشیں مخلوق

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ جن ایک آتشیں مخلوق تھی جسے اللہ نے انسان سے پہلے پیدا کیا تھا۔ یعنی ایسی مخلوق جس میں انسان کی نسبت حرارت زیادہ تھی۔ اسی اعتبار سے اس مخلوق کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ آگ سے پیدا ہوئی تھی۔ جس طرح انسان کے متعلق کہا ہے کہ وہ مٹی سے پیدا ہوا ہے۔ ابلیس کے متعلق اس کی خوئے سرکشی کی وجہ ہی سے کہا گیا ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا۔ (مزید تفصیل شیطان کے عنوان میں ملیگی)

لفظ جن کے معنی ہیں پوشیدہ، مستور، نگاہوں سے اوجھل، غیر مرئی۔ جب یہ کرۂ ارض سورج سے الگ ہوا ہے تو ایک پگھلا ہوا آتشیں مادہ تھا۔ قرنہا قرن کے بعد فضا کی برودت سے اس کا اوپر کا حصہ سخت ہونا شروع ہوا۔ جیسے دودھ پر بالائی جم جاتی ہے۔ لیکن نامعلوم اس کرۂ نار کو کس قدر طویل المیعاد مراحل سے گزرنا پڑا کہ بالآخر یہ ذی حیات آبادی کے قابل ہوا۔ تبدل و تحوّل کے ان ابتدائی ادوار میں یہاں کس قسم کی مخلوق تھی جسے اس کی آتشیں فضا سازگار تھی، اس کا ہمیں علم نہیں لیکن وہ مخلوق اب قصۂ پارینہ ہو چکی ہے۔ اس کی جگہ انسانی آبادی نے لے لی۔ علم الانسان کے ماہرین اسے سلسلۂ ارتقاء کی گم گشتہ کڑی (MISSING LINK) سے تعبیر کرتے ہیں جس کا اب تک حتمی طور پر سراغ نہیں لگ سکا۔ اس مخلوق سے آج ہمارا تعلق اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ قرآنِ کریم نے اس کا ذکر کیا ہے جس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن ذہنِ انسانی جب اپنے عہدِ طفولیت میں تھا تو اس کی حالت عجیب تھی۔ وہ ہر اُس قوت کو جو نگاہوں سے اوجھل ہوا اور ہر اُس مافوق الفطرت واقعہ کو جس کا سبب بظاہر معلوم نہ ہو سکے، خارقِ عادت سمجھ کر اس سے خوف کھانے لگتا اور اُس کے مُضر اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے اس کی خوشامدیں کرتا۔ جس کا اظہار پرستش کی صورت میں کیا جاتا۔ بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، بارش، زلزلے اور اسی قسم کے دیگر حوادث و واقعات جن کی علت و حقیقت اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اس کی عقل و ہوش کو چکر میں ڈالنے کے لئے کافی تھے۔ وہ ان غیر مرئی حوادث کو مافوق الفطرت قرار دیتا۔ انہیں دیوتا (دیو) سمجھتا اور ان کی پرستش کرتا۔ اسی طرح ایسے اعصابی امراض (مثلاً مرگی، ہسٹیریا وغیرہ) جن میں مریض بے ہوش ہو کر طرح طرح کی حرکتیں یا باتیں کرنے لگتا اس کے لئے سامانِ خوف و ہراس پیدا کر دیتے۔ وہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ (وہ تو خیر پھر بھی ذہنِ انسانی کا بچپن کا زمانہ تھا۔ آج بھی ہسٹیریا کا دورہ دیکھنے والوں کے

لیۓ خوف اور حیرت کے عجیب وغریب سامان پیدا کر دیتا ہے) لامحالہ وہ یہی سمجھتا کہ یہ بھی کسی دیوی، دیوتا (چھپی ہوئی قوت) کا کارنامہ ہے۔ یہ تھی اس توہم پرستی کی ابتدا۔ رفتہ رفتہ ذہنِ انسانی کے

بھوت پریت!

توہم پرستانہ کارخانے میں ان پوشیدہ قوتوں کے مجسمے ڈھلنے شروع ہوئے اور آہستہ آہستہ اُن کے جداگانہ نام تجویز ہوئے اور الگ الگ کام ان کی طرف منسوب کیۓ گئے۔ جن، بھوت، دیو، چڑیل، پری، ارواحِ خبیثہ اور نہ معلوم کیا کیا خرافات۔ چونکہ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) ان کی طرف مافوق الفطرت قوتیں منسوب کی گئیں، اس لیۓ ان کی پرستش بھی شروع ہو گئی۔ اس کی ابتدا تو انسان کے ابتدائی مراحلِ زندگی میں ہوئی۔ لیکن، جیسا کہ ہر مسلک کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے، چونکہ یہ سلسلہ بھی مختلف اقوام میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلا آیا اس لیۓ جہالت آمیز ملکوں اور قوموں میں یہ باتیں آج تک اسی طرح چلی آ رہی ہیں۔ نزولِ قرآنِ کریم کے وقت عربوں کے ہاں بھی یہی حالت تھی۔ قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں اس کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورۂ انعام میں ہے:

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ...(۶/۱۰۱) (نیز ۳۴/۴۱)

اور (دیکھو) ان لوگوں نے خدا کے ساتھ جنوں کو (طاقت و تصرف میں) شریک ٹھہرا لیا ہے۔

یہ تو دورِ جاہلیت کی باتیں تھیں۔ لیکن خود مسلمانوں نے ان خرافات سے کس قدر اثر قبول کیا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا ہو تو ایک نظر جھانکیۓ کسی خانقاہ کے گوشے، کسی اونچی قبر کے سرہانے، کسی "صاحبِ مجاز" کے تعویذ خانے یا کسی "عاملِ قرآن" کے عمل میں۔ اور پھر دیکھیۓ کہ یہ قوم جسے اللہ تعالیٰ نے ایسی عالمتاب روشنی عطا فرمائی تھی توہم پرستیوں کے کن کن ظلمت کدوں میں ٹھوکریں کھا رہی ہے۔

لے یہیں تک ہی نہیں بلکہ قیامت تو یہ ہے کہ بڑے بڑے اربابِ علم بھی اسی اوہام پرستی کے چکر میں مبتلا ہیں۔ "فلاں مکتب میں ایک جن پڑھتا تھا۔ ایک دن وہ بچوں کے ساتھ کھیلتا کھیلتا مسجد کی بدھنی میں جا چھپا۔ جب اس کا راز یوں فاش ہو گیا تو حضرت صاحب نے فرمایا کہ اب تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیئے"۔ یہ اور اسی قسم کے واقعات بڑے بڑے اربابِ علم و فضل کی طرف منسوب ہیں اور ان سے ان کی بزرگی اور عظمت کی دلیل لائی جاتی ہے۔

(باقی اگلے صفحے پر دیکھیۓ)

ہے۔ یورپ نے تنہا عقل کے جگنو کی روشنی سے ان اوہام واباطیل سے نجات حاصل کرلی لیکن جن کے صحنِ خانہ میں آفتاب ضوفشاں ہے وہ چمگادڑ کی طرح اپنی آنکھیں بند کئے اندھوں کی دنیا میں بس رہے ہیں۔

چونکہ جن کے معنی تھے پوشیدہ اور اس کا تصور ذہن کو بڑی قد آور، دیو ہیکل، شعلہ صفت مخلوق کی طرف منتقل کرتا تھا۔ اس لئے عربی زبان میں ایسے وحشی قبائل پر جو آبادیوں سے دُور صحراؤں اور جنگلوں میں رہتے تھے اور شہری لوگوں سے زیادہ طاقتور اور ڈیل ڈول میں زیادہ قوی اور مضبوط تھے

انسانی جنّات

لفظِ جن کا اطلاق کیا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے مہذب اور غیر مہذب حضری اور بدوی (شہری اور جنگلی) کی تمیز کے لئے انس (باہمی موانست سے رہنے والے) اور جن کے الفاظ استعمال ہونے لگے۔ آج جبکہ ذرائع رسل و رسائل کی عام فراوانی کی وجہ سے شہری تمدن کے اثرات دور دراز دیہات حتّٰی کہ خانہ بدوش قبائل (NOMADICTRIBES) تک جا پہنچے ہیں شہری اور بدوی آبادیوں کے طرزِ تمدن، نفسیاتی کیفیات، سیاسی احوال و ظروف، رجحانات قلبی و ذہنی وغیرہ میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہا۔ لیکن اُس زمانہ میں یہ فرق ایسا گہرا اور دونوں کی درمیانی خلیج اتنی وسیع تھی کہ یہ امتیازی خط ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ قرآنِ کریم میں جن و انس کے الفاظ ان ہی معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ قصہ حضرت سلیمانؑ کے ضمن میں فرمایا:

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ○ (۲۷/۱۷)

اور سلیمان کے لئے اس کے لشکر جنوں، انسانوں اور قومِ طیر سے اکٹھے کئے گئے اور انہیں (حاضری کے لئے) ایک جا کھڑا کیا جاتا تھا۔

جیسا کہ حضرت سلیمانؑ کے تذکرہ میں تفصیلی طور پر لکھا جائے گا۔ یہ جنّات پہاڑی اور جنگلی علاقوں کے دیو ہیکل

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) ؎ ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہیے

قرآنِ کریم سے جنات کے متعلق ایسی باتوں کی کوئی سند نہیں ملتی۔

مضبوط اور توانا سرکش قبائل تھے جنہیں حضرت سلیمانؑ نے اپنے محلات (اور بالخصوص ہیکل) کی تعمیر کے کاموں پر لگا رکھا تھا۔ بنی اسرائیل، حاکم قوم کے افراد تھے، اس لئے انہیں اس قسم کے مزدورانہ کاموں پر نہیں لگایا جاتا تھا۔ ان کاموں کے لئے غیر اسرائیلی اجنبی لوگ منگائے جاتے تھے۔ یہ قوی، سرکش، اجنبی لوگ جن کے نام سے پکارے گئے ہیں۔ (دیکھئے ۲۷/۳۹؛ ۱۲-۳۴/۱۳؛ ۲۱/۸۲)۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ان تمام امور کی تشریح حضرت "سلیمان" کے عنوان میں ملے گی۔

جنّ وانس سورۃ انعام میں ہے کہ جن وانس (شہری اور بدوی آبادیوں) کے سرکش و شریر انسان حضرات انبیائے کرامؑ کی دعوت الی الحق کے دشمن ہوا کرتے تھے۔ (دیکھئے ۶/۱۱۲)۔ اس سے ذرا آگے (۶/۱۳۱ میں) "جن وانس" کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ خدا نے تمہاری طرف، تم میں سے، رسول بھیجے تھے۔ مزعومہ "جنوں" کی طرف بھیجے گئے کسی رسول کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے۔ تمام رسول انسانوں کی طرف ہی آتے تھے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ "جن وانس" دونوں انسانوں ہی کی دو جماعتیں ہیں —— انس، شہروں کی مہذب آبادی اور جن صحراؤں کے بادیہ نشین، جو شہری آبادی کی نگاہوں سے اوجھل، اور بیابانوں میں رہتے تھے۔ لہٰذا، قرآن کریم میں جہاں جہاں "جن وانس" کا ذکر ہوگا، اس سے مراد انسانوں کی یہی دو جماعتیں ہوں گی۔

جنّات کا قرآن سُننا جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے نزولِ قرآن کے زمانے میں عرب کی آبادی کے دو مخصوص طبقے تھے۔ ایک طبقہ حضریت کی (شہری) زندگی بسر کرتا تھا اور دوسرا طبقہ صحرانشین بدوؤں کا تھا جو آبادیوں سے دور نگاہوں سے اوجھل رہا کرتے تھے جس طرح ہمارے ہاں خانہ بدوش قبائل رہتے ہیں۔ ان دونوں کی نفسیاتی کیفیات تمدنی ضروریات اور طبعی خصائل و عادات میں بڑا فرق تھا۔ قرآن کی دعوت ان دونوں گروہوں کے لئے تھی لیکن ظاہر ہے کہ ان دونوں سے اندازِ تخاطب اور طریقِ تبلیغ یکساں نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے ان صحرانشین قبائل کا ذکر الگ بھی کیا ہے۔ ان تمہیدی اشارات کی روشنی میں قرآن کریم کی ان آیات کا مفہوم بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ "جنّات" (حضورؐ سے) قرآن سننے کے لئے آئے تھے۔ (دیکھئے ۲۹ — ۴۶/۳۲)۔ وہ حضرت موسیٰؑ کا ذکر کرتے تھے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ یہودیوں کے سے عقائد رکھتے تھے یا خود یہودی ہی تھے۔ ان کی مزید تفصیل (آیات ۱ — ۷۲/۷) میں بھی دی گئی ہے۔

سلسلۂ رُشد و ہدایت صرف انسانوں کیلئے ہے

جیساکہ اوپر لکھا جاچکا ہے، دنیا میں سلسلۂ رشد و ہدایت انسانوں ہی کے لئے قائم کیا گیا ہے. قصۂ آدم پر ایک بار پھر نگاہ ڈالئے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ رسولوں کی بعثت. ہدایتِ خداوندی کا نزول. سب بنی آدم کے لئے تھی. یہ سلسلۂ ہدایت بنی آدم کے علاوہ کسی اور مخلوق کے لئے نہیں ہے. (دیکھئے ۹۴-۹۵/۱۷). ان آیات میں کہا گیا ہے کہ چونکہ زمین پر انسان بستے ہیں اس لئے ایک انسان ہی کا رسول بناکر بھیجا جانا ضروری تھا. اگر فرشتے بسنے تو فرشتوں کو رسول بناکر بھیجا جاتا. اور علیٰ ہٰذالقیاس، اگر یہاں آتشیں مخلوق کے جنات آباد ہوتے تو ان ہی میں سے رسول بھیجا جاتا. یہی وجہ ہے کہ نبیٔ اکرمؐ کی رسالت نوعِ انسانی ہی کے لئے ہے.

قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (۷/۱۵۸)

نیز (۳۴/۲۸)؛ (۱۰/۵۷).

(اے پیغمبر! تم لوگوں سے) کہو "اے افرادِ نسلِ انسانی! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں.

ان حقائق کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ انسانوں کو چمٹ جانے والے جنات. بھوت. پریت. سایہ چڑیل ارواحِ خبیثہ وغیرہ قسم کے خرافات واباطیل کا ایک مسلمان کے دماغ میں کبھی گذر بھی ہوسکتا ہے؟ وہ جس کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارض وسمٰوٰت کی ہر چیز کو تابع فرمان بنادیا. اس قسم کی توہم پرستی کسی طرح اس کے قریب بھی پھٹک سکتی ہے؟ جنہیں جنات اور بھوتوں کا سایہ سمجھا جاتا ہے. اُن کی حقیقت اعصابی امراض کے سوا اور کچھ نہیں. جب تک دنیا دورِ جہالت سے گزر رہی تھی

بھوت اور جنات دراصل کیا ہوتے ہیں؟

ان امراض کو جن کے اسباب و علل سمجھ میں نہیں آتے تھے، مافوق الفطرت قوتوں کے اثرات پر محمول کیا جاتا تھا. ابھی کل تک یورپ کی بھی یہی حالت تھی. لیکن انہوں نے ان چیزوں کی تحقیق کی اور رفتہ رفتہ علم وعقل کی روشنی سے توہم پرستی کی ان سیاہ چادروں کو ایک ایک کرکے الگ کردیا. لیکن جہاں ابھی جہالت کا تسلط ہے وہاں اس قسم کی توہم پرستی اچھے بھلے لوگوں کے سر پر سوار ہے. دنیا کی اور تو میں اس قسم کے خرافات میں اُلجھ کر رہ گئی تھیں تو یہ

امر کچھ ایسا تعجب خیز نہ تھا اس لئے کہ ان کے ہاں علم و بصیرت تھا کہاں؟ لیکن سب سے بڑی بدقسمتی تو مسلمانوں کی ہے کہ قرآن جیسی روشنی رکھتے ہوئے اس قسم کے خرافات کے طلسمِ ہوش رُبا میں جکڑے چلے آ رہے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ اس قسم کے امراض کا علاج عملیات سے ہو جاتا ہے' سو اس کی تشریح سحر کے عنوان میں ملے گی۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اعصابی امراض کا گہرا تعلق انسانی اعصاب سے ہوتا ہے (انہیں اس لئے اعصابی امراض کہا جاتا ہے) اور انسانی اعصاب پر قوتِ خیال کا اثر نفسیات کا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے۔ عملیات و شعبدات سب قوتِ ارادی کے کرشمے ہیں۔ علم تجزیۂ نفس کا مشہور امام (ڈاکٹر فرائڈ) اسی حقیقتِ مستور کی تحقیق میں نکلا اور ایک ایسے عامل کے ہاں پہنچا جو مسمریزم (قوتِ ارادی) سے اس قسم کے اعصابی امراض کا علاج کیا کرتا تھا' فرائڈ نے مسمریزم سیکھا۔ اس پر عمل بھی کیا۔ لیکن اس کے بعد اور آگے بڑھا' اس پر یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ ان امراض کا تعلق یکسر اعصاب سے ہے۔ اور ان کا علاج نفسیاتی اثرات سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ توہم پرستی کے اس طومار کی سائنٹفک توجیہات سامنے آتی گئیں۔ یورپ اور امریکہ میں آج اس فن کے "عامل" ہر جگہ موجود ہیں۔ لیکن وہ ڈاکٹر ہی کہلاتے اور سمجھے جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ قرار نہیں دیئے جاتے ۔ اس لئے اُن کی پرستش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اس قسم کے توہمات کی پرستش تو "مسلمان" ہی کے حصہ میں آئی ہے جو دنیا کے ہر پتھر اور ہر بڑی دہلیز پر جُھک جاتا ہے اور اسے قربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اسی قسم کی توہم پرستی میں ایسے واقعات بھی شامل ہیں جو آئے دن کہیں نہ کہیں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کہیں کسی مکان میں پتھر آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ کہیں خود بخود کپڑے جل اٹھتے ہیں۔ کہیں چیزیں غائب ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر محنت اور کاوش سے تحقیق کی جائے تو ان تمام حوادث کے اسباب کا سراغ لگایا جا سکتا ہے لیکن اگر کسی وجہ سے سراغ نہ بھی لگے تو کوئی بھی قرینہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی غیر مرئی آتشیں مخلوق ہے جو اس طرح انسانی معاشرے میں فساد انگیزیاں کرتی رہتی ہے۔ یاد رکھیے! قرآن کی رُو سے اس قسم کے عقیدے یا تصور کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن کی رُو سے انسانوں کی پیدائش سے پہلے یہاں کوئی مخلوق آباد تھی جس کا اب انسانوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسے آتشیں مخلوق کہا گیا ہے اس کے علاوہ قرآن میں "جنّ و انس" کے ضمن میں جن جنّات کا ذکر ہے ان سے مراد عرب کے صحرا نشین' خانہ بدوش قبائل ہیں۔ اور بس!

جَان بمعنی سانپ

عربی زبان میں جان بمعنی سانپ بھی مستعمل ہوا ہے. غالباً اس کی شعلہ نفسی اور آتش مزاجی کے اعتبار سے. قصۂ حضرت موسیٰ کے ضمن میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے. (دیکھئے ۲۷/۱۰؛ ۲۸/۳۱).

خلاصۂ مبحث

نفسِ انسانی اپنی مستور قوتوں اور خوابیدہ جوہروں کی نمود کے لئے متصادم عناصر سے مزاحمت و کشمکش کا محتاج ہے. دنیا کے میدانِ سعی و عمل میں ان متخاصم قوتوں کا نام ابلیس ہے. ابلیس کی فطرت میں سرکشی وطغیان ہے. یہ عقلِ بیباک اور علمِ سرکش کا مظہر ہے. یا یوں سمجھئے کہ انسان کے ان جذبات کا نام جو وحیؔ کے تابع نہیں رہتے. اس کی تخلیق شعورِ آدم کے ساتھ ہوئی اور جب تک اس دنیا میں بنی آدم کا وجود ہے یہ اس کے ساتھ موجود رہے گا. لہٰذا یہ ابلیسی قوتیں فنا نہیں ہوسکتیں. مومن کا شیوہ یہ ہے کہ انہیں مسخر کرے اور قوانینِ الٰہیہ کے تابع لے آئے. واضح رہے کہ یہ عقیدہ مجوسیوں کے عقیدۂ ثنویت سے اساسی طور پر مختلف ہے. جس کی رُو سے نیکی کا خدا الگ اور برائی کا خدا الگ مانا جاتا ہے.

حقیقت یہ ہے کہ جس بنیادی مسئلہ نے ذہنِ انسانی کو آج تک طلسمِ پیچ وتاب بنائے رکھا ہے وہ خیر و شر کا مسئلہ ہے. یہ ایک ایسی اُلجھی ہوئی ڈور ہے کہ ذہنِ انسانی نے اُسے جس قدر سلجھانے کی کوشش کی ہے یہ اور زیادہ اُلجھتی گئی ہے. دنیا میں جہاں جہاں نیکی کا تصوّر ہے اس کے مقابلے میں بدی کا تصوّر موجود ہے. جہاں خدا کا تصوّر ہے اس کے مقابل میں ابلیس یا شیطان کا تصوّر ہے. یہ دونوں ایک دوسرے کے حریف کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں. انسانی تاریخ میں ہر "رام" کے ساتھ "راون" مصروفِ پیکار دکھائی دیتا ہے. ہر "یزداں" کے مقابلہ میں "اہرمن" ستیزہ کار نظر آتا ہے. اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں متضاد "قوتیں" شروع سے آج تک ایک دوسرے کے مدِمقابل صف آرا نظر آتی چلی آرہی ہیں لیکن قرآن نے ابلیس کا جو تصوّر پیش کیا ہے وہ اس سے مختلف ہے. اس نے ابلیس کو ایک ایسی قوت کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جو خدا کی حریف اور اس کے ساتھ پنجہ فگن ہو. کائنات میں کونسی قوت ایسی ہوسکتی ہے جسے خدا کی شریک سمجھا جائے اور شریک بھی ایسی کہ وہ خدا کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑی ہوجائے؟ قرآن نے بتایا ہے کہ اختیار و ارادہ صرف خدا کو حاصل ہے. کائنات کی کسی چیز کو یہ قوت حاصل نہیں. خدا نے

اپنی اس قوت کا ایک شمہ انسان کو عطا کیا ہے. جس کی رُو سے یہ اپنے محدود دائرے کے اندر صاحبِ اختیار و ارادہ ہو گیا ہے. اس قوّت کے ماتحت وہ اپنے لئے آپ فیصلے کرتا ہے. کائنات میں خدا کا قانون جاری و ساری ہے. انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ایسی روش اختیار کرے جو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو اور چاہے تو اس کے خلاف راستہ اختیار کرلے. یعنی وہ چاہے تو اپنی قوتوں کو ایک طرف لے جائے اور چاہے تو ان کا رُخ دوسری طرف موڑ دے. جب انسان اپنی قوّتوں کو قانونِ خداوندی کی مطابقت میں صرف کرے تو اسے وحی کی اطاعت کہتے ہیں اس لئے کہ انسانی معاشرہ کے لئے خدائی قوانین صرف وحی کی رُو سے ملتے ہیں. اور جب وہ اپنی قوّتوں کو اس راستے کے خلاف استعمال کرے تو اس کا نام قانونِ خداوندی سے سرکشی ہے. اس کو قرآنی اصطلاح میں ابلیسؔ سے تعبیر کیا جاتا ہے. اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ ابلیس کسی خارجی قوّت کا نام نہیں جو خدا کے مدِّمقابل کھڑی ہے. یہ محض انسانی قوّتوں کے استعمال اور مصرف کی ایک شکل کا نام ہے. یعنی وہ شکل جس میں انسانی قوّتیں وحی کے مقرّر کردہ قاعدے کے خلاف صرف ہوتی ہیں. جب انسان اپنی قوّتوں کو وحی کے مطابق صرف کرنے لگ جاتا ہے تو اس کے لئے کہا جاتا ہے کہ اس پر ابلیس کا غلبہ و تسلّط نہیں رہا. درحقیقت اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ انسان نے اپنے اختیار و ارادہ کو صحیح طور پر استعمال کیا ہے اور اپنے لئے وہ راستہ چُنا ہے جو وحی نے اس کے لئے مقرّر کیا تھا اور جس سے وہ منزلِ انسانیت تک بآسانی پہنچ جائے گا. ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ ابلیسؔ کسی ایسی قوّت کا نام نہیں جو خدا کے مدِمقابل صف آرا ہو. ایسی قوّت کا دنیا میں وجود ہی نہیں. لہٰذا اہرمن و یزداں کو دو مستقل قوّتیں تسلیم کرنا مجوسیّت کی ثنویّت ہے جس نے انسانی فکر کو بُری طرح سے متاثر کیا ہے. یہی ثنویت مختلف زمانوں میں مختلف لباس پہن کر سامنے آتی رہی ہے. روح اور مادہ کی ثنویّت (اس کو ہندی فلسفہ میں آتما اور پراکرتی کا بیر کہتے ہیں) لیکن ابلیسؔ کے قرآنی تصور میں یہ ثنویّت خود بخود ختم ہو جاتی ہے. ابلیس نام ہے اس فیصلہ کا جو انسان کو وحی کے خلاف چلنے پر آمادہ کر دے. اسی کو عقلِ بیباک اور علمِ سرکش کہتے ہیں. اگرچہ اس فیصلہ کے نتائج شروع میں بڑے دیدہ زیب اور خوش آیند دکھائی دیتے ہیں لیکن مستقبل میں ان کا ثمر ہمیشہ تلخ ہوتا ہے جس سے انسان پر سخت ناامیدی طاری ہو جاتی ہے. ناامیدی کو عربی زبان میں بلس کہتے ہیں اور یہیں سے ابلیسؔ کا لفظ نکلا ہے.

○

اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ [۲/۱۶۸]

شیطان

(ابلیس کا پیکرِ آتشیں)

بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

شیطان

قصۂ آدم میں ایک چیز بڑی نمایاں طور پر سامنے آتی ہے۔ سجدہ سے انکار، قیامت تک کے لئے مہلت۔ ذرّیتِ آدم کو بہکانے کا چیلنج۔ سب ابلیس کی طرف سے ہے۔ لیکن جب اس کے بعد آدم کی لغزش کا ذکر ہے تو وہاں اُسے شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ عنوانِ آدم کے تحت اس ضمن میں مختلف آیات کو ایک مرتبہ پھر دیکھئے۔ سورۂ بقرہ میں انکارِ سجدہ اور آدم کو شجرِ ممنوعہ سے احتراز کے حکم کے بعد فرمایا:

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا (۲/۳۶)

پھر شیطان کی وسوسہ اندازی نے ان دونوں کے قدم ڈگمگا دیئے۔

سورہ اعراف میں فرمایا:

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (۷/۲۰)

لیکن پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے ان کی طرف وسوسہ ڈالا۔

سورۂ طٰہٰ میں ہے:

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ (۲۰/۱۲۰)

لیکن پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے اس کی طرف وسوسہ ڈالا۔

ان مقامات سے ایسا مترشح ہوتا ہے گویا ابلیس اور شیطان دو الگ الگ ہستیاں ہیں

ابلیس اور شیطان

لیکن انہی آیات میں ایسی چیزیں بھی ہیں جن میں ایک ہی فعل کو کبھی ابلیس کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور کبھی شیطان کی طرف. مثلاً ایک مقام پر ابلیس کے متعلق کہا ہے کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے (۱۸/۵۰).

تو دوسری جگہ شیطان کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے (۷/۲۲). سب سے بڑا واقعہ آدم کو جنت سے نکلوانے کا ہے. سورۂ طٰہٰ میں کہا گیا ہے کہ اس کا موجب ابلیس ہے (۱۱۶ — ۲۰/۱۱۷). لیکن سورۂ بقرہ میں اسے شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے (۲/۳۶).

ایک ہی سکہ کے دو رُخ

ان مقامات سے ظاہر ہے کہ ابلیس اور شیطان ایک ہی سکّہ کے دو رُخ ہیں یہ حقیقت سورۂ بنی اسرائیل میں اور بھی اُبھر کر سامنے آگئی ہے جہاں پہلے ذکر ابلیس کا چلا آرہا ہے لیکن آخر میں کہا گیا ہے کہ

وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ إِلَّا غُرُوْرًا ○ (۱۷/۶۴)

شیطان ان سے جو وعدے بھی کرتا ہے سب فریب پر مبنی ہوتے ہیں. اس سے اگلی آیت میں ہے إِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ط (۱۷/۶۵) "میرے بندوں پر تجھے غلبہ حاصل نہیں ہو سکے گا." اور سورۂ حجر میں یہی الفاظ ابلیس کے متعلق کہے گئے ہیں (۱۵/۴۲).

لفظ شیطان یا تو شطن سے مشتق ہے جس کے معنی دُوری کے ہیں. یعنی سعادت و رحمت سے محرومی. یا شاط یشیط سے. جس کے معنی شعلوں کا بھڑکنا یا آگ میں جلنا ہیں. یعنی شعلہ مزاجی کا مظاہرہ. بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ عبرانی لفظ ہے اور اصل کے اعتبار سے اس کے معنی (HINDERER) کے ہیں. یعنی انسانیت کی ارتقاء کے راستے میں مزاحمت کرنے والا.

ابلیس کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس کا مادہ (ب۔ ل۔ س) ہے جس کے معنی مایوسی کے ہیں.

اصل یہ ہے کہ جب انسانی جذبات اسے قانون شکنی پر اُبھارتے ہیں تو اس میں سرکشی کی نمود ہوتی ہے. یہ شیطانیت ہے (جس میں اشتعال کا پہلو نمایاں ہے). لیکن جب اس قانون شکنی کے نتائج سامنے آتے ہیں تو اس سے انسان پر افسردگی اور مایوسی چھا جاتی ہے. یہ ابلیسیت ہے۔ لہٰذا انسان کا سرکشی کا عمل اپنے آغاز کے اعتبار سے شیطنت ہے اور انجام کی رُو سے ابلیسیت. اس

لئے شیطان اور ابلیس دو الگ الگ عناصر نہیں. یہ ایک ہی عمل کی دو جداگانہ خاصیتیں ہیں. اور شیاطینؑ وہ مستبد قوتیں ہیں جو دوسروں کو قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے پر اکساتی ہیں.

اب یہ دیکھئے کہ شیطان کون کون سے بھیس بدل کر سامنے آتا ہے. سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ

وساوس

شیطان نے آدم کے دل میں وسوسہ ڈالا تھا.

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (۲۰/۷، نیز ۲۰/۱۲۰)

لیکن پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا۔

یعنی وسوسہ اندازی عملِ شیطان ہے. دل کے یقین کو غیر محسوس انداز سے متزلزل کر دینا. کسی کے عزمِ راسخ میں پھونک مار دینا (نَفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ) چپکے ہی چپکے سرگوشیوں سے قوانینِ خداوندی سے انحراف پر مائل کر دینا یہ سب شیطانی حربے ہیں. سورۃ الناس میں ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۙ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ۧ (۱—۶/۱۱۴)

(اے پیغمبر! ان سے) کہہ دو کہ میں نوعِ انسانی کے پروردگار، مالک اور ان کے الٰہ کی پناہ میں آتا ہوں. وسوسہ انداز (دبے پاؤں پیچھے ہٹ جانے والے شیطان) کے شر سے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالا کرتا ہے (خواہ وہ) جنّ میں سے ہو، اور (خواہ) انس میں سے.

خنّاس کے معنی ہیں چپکے ہی چپکے سمٹ کر، سکڑ کر، دبے پاؤں پیچھے ہٹ جانے والا. کسی کے کان میں سرگوشی کی، دل میں وسوسہ ڈالا، اور چپکے سے پیچھے ہٹ کر چھُپ گئے. گویا انہیں علم ہی نہیں کہ تخریب کے اس فعلِ شیطانی کا ذمہ دار کون ہے؟ اور یہ خنّاس کون ہیں؟ "مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ" جن کی تشریح سابقہ عنوان میں گزر چکی ہے. اس سے ظاہر ہے کہ یہ شیاطین، وہ انسان ہی ہیں جو دوسروں کے عزمِ راسخ میں وسوسہ اندازیوں سے لغزش پیدا کرتے ہیں. دوسرے مقام پر ہے کہ

خود انسان کا نفس بھی وسوسہ اندازیاں کرتا رہتا ہے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ (۵۰/۱۶)

اور بلا شبہ انسان کو ہم نے پیدا کیا ہے۔ اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کا نفس اس کے (دل) میں کیا کچھ وسوسے ڈالتا ہے اور ہم اس کی شہ رگ (رگِ جان) سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

یہ نفس (جو اس طرح وسوسہ اندازی کرتا ہے) انسان کے مفاد پرستی کے جذبات ہیں جو اسے حق و صداقت کی راہ میں قدم اُٹھانے سے روکتے رہتے ہیں۔ یہی وہ شیاطین (یعنی انسان کے مختلف خیالات) ہیں جو ان مقامات سے حملہ کرتے ہیں جو انسان کو نظر تک نہیں آتے۔ شیطان کے اس لشکر کے متعلق کہا ہے کہ

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (۷/۲۷)

وہ اور اس کا گروہ تمہیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم اسے نہیں دیکھتے۔ یاد رکھو ہم نے یہ بات ٹھہرا دی ہے کہ جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے رفیق و مددگار شیاطین ہوتے ہیں۔

نگاہ فریب آرزوئیں

پھر اگر ایک طرف شیطان صحیح راہِ عمل سے بہکانے کے لئے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے تو دوسری طرف دلوں میں نگاہ فریب اور سراب آسا غلط آرزوئیں پیدا کر کے انسان کو باطل کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس کا دعوےٰ یہی ہے کہ وَ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ (۴/۱۱۹) "میں انہیں گمراہ کروں گا اور ان کے دل میں جھوٹی آرزوئیں بیدار کرتا رہوں گا" وہ باطل آرزوئیں پیدا کرتا ہے اور ان آرزوؤں کے حصول کے لئے جتنی کوششیں کی جاتی ہیں انہیں نہایت خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے تاکہ کسی قدم پر بھی اس کا احساس نہ ہو سکے کہ جس راستے پر چل رہے ہیں وہ کامیابی اور کامرانی کے بجائے تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لئے جا رہا ہے۔ اعمال کو مزین بنا کر دکھانا، یہ سب سے بڑا فریب ہے جو شیطان کی طرف سے دیا جاتا

زینتِ اعمال ہے. وہ باطل کی مورتیوں کو ایسے حسین وجمیل، مرصع اور منقش پردوں میں چھپاتا ہے کہ نگاہیں ان کے نقش نگار میں اُلجھ کر رہ جاتی ہیں اور جاذبِ توجہ فریب کاریوں کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت تک پہنچنے نہیں پاتیں. اسی کا نام ہے زینتِ اعمالؔ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (۶/۴۳) شیطان ان کی نگاہوں میں ان کے غلط اعمال کو مزیّن (حسین) بناکر دکھاتا رہتا ہے. حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کے بُرے اعمال اس کی نگاہوں میں اچھے بن کر نظر آئیں تو یہ وہ فریب ہے جس سے اس کا نکلنا ناممکن نہیں تو محال ضرور ہوجاتا ہے. انسان کی عقل حیلہ جو کرتی ہی یہ ہے کہ اس کے غلط کاموں کے حق میں ایسے دلائل تراشتی ہے کہ وہ اسے غلط نظر ہی نہیں آتے. اس طرح وہ دیدہ و دانستہ سب کچھ دیکھتے بھالتے اس فریبِ رنگ و بُو میں کھوجاتا ہے.

وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَا۟ وَ قَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ وقفه
وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ
وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ○ۙ (۲۹/۳۸)

اور ہم نے (قومِ) عاد و ثمود کو ہلاک کیا. اور (یہ) ان کے مکانات (اور آبادیوں) سے تمہیں صاف نظر آرہا ہے (وہ کس طرح ہلاک کئے گئے) شیطان نے ان کے لئے ان کے اعمال کو مزیّن بنارکھا تھا چنانچہ اس نے انہیں (حق کی) راہ (کی پیروی) سے روک دیا. اور وہ لوگ سب کچھ دیکھتے بھالتے تھے.

قومِ سبا کے متعلق فرمایا.

وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ
لَا يَهْتَدُوْنَ ○ۙ (۲۷/۲۴)

شیطان نے ان کے اعمال (سیئہ) کو ان کے لئے مزیّن بنارکھا تھا چنانچہ اس نے انہیں (حق کی) راہ (کی پیروی) سے روک دیا. سو وہ سیدھی راہ پر نہیں چلتے تھے.

تمام اُمَمِ سابقہ کے متعلق ارشاد ہے.

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ

اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (۱۶/۶۳)

(اے پیغمبر!) اس بات کی سچائی پر ہم شاہد ہیں کہ ہم نے تجھ سے پہلے کتنی ہی امتوں کی طرف رسول بھیجے۔ پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے لوگوں کو ان کی بدعملیاں اچھی بنا کر دکھائیں (اور وہ سچائی کی دعوت پر کاربند نہ ہوئے) سو وہی حال آج بھی ہو رہا ہے۔ وہی شیطان ان منکروں کا رفیق ہے اور (بالآخر) ان کے لئے الم انگیز تباہی ہے۔

زینتِ اعمال کے مظاہر

اپنے گردوپیش نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ "زینتِ اعمال" کے یہ مظاہر کن کن نظر فریب پیکروں میں سامنے آتے ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے ہلاکو اور چنگیز یا دورِ حاضرہ کے ابلیسی نظام کے اربابِ حل و عقد سے پوچھئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح اپنے ہر فعل کو حق بجانب اور نوعِ انسانی کے لئے آیہ رحمت قرار دیتے ہیں، دل ہے کہ اس میں خود غرضی، حق ناشناسی، جلبِ منفعت اور ہوسِ زر کے چور چھپے بیٹھے ہیں۔ لیکن عقلِ حیلہ جو ہے کہ ان بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارت کو کمزوروں اور ضعیفوں، مظلوموں اور کس مپرسوں کے لئے امن و حفاظت کا قلعہ بنا کر دکھاتی ہے لیکن باطل کی ملمع کاری زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد دنیا دیکھ لیتی ہے کہ شیطان کا فریب کس قدر بودا تھا۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ○ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَ اتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَ رُسُلِيْ هُزُوًا ○ (۱۸/۱۰۳—۱۰۶)

(اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ وہ کون لوگ ہیں جو اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہیں؟ وہ جن کی ساری کوششیں (قانونِ مکافات سے بے نیاز ہو کر) مفادِ عاجلہ کے حصول میں کھوئی گئیں۔ اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا کارخانہ بنا رہے ہیں! یہی لوگ ہیں کہ اپنے پروردگار کے قوانین اور ان کے نتائج کا سامنا کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ پس اُن کے سارے کام اکارت گئے اور اس لئے مکافات

کے وقت ہم (اُن کے اعمال) کا کوئی وزن تسلیم نہیں کریں گے. انہوں نے جیسی کچھ کفر کی راہ اختیار کی تھی اور ہمارے قوانین اور رسولوں کی ہنسی اڑائی تھی' تو عذابِ دوزخ' اس کا لازمی نتیجہ ہے.

مذہبی دنیا میں زینتِ اعمال

یوں تو شیطان کی طرف سے پیش کردہ زینتِ اعمال انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں تخریب انگیز ہے. لیکن دنیائے مذہب میں اس کی سمیت بڑی ہلاکت آفریں ہو جاتی ہے. غور کیجئے. بعض معتقدات و رسومات آباؤ اجداد سے متوارث چلی آرہی ہیں. انسان انہیں اس قدر مقدس و متبرک خیال کرتا ہے کہ انہیں دل کی انتہائی گہرائیوں میں جگہ دیئے پھرتا ہے. ان کے خلاف خدا کی طرف سے کھلے کھلے احکام موجود ہوتے ہیں. لیکن شیطان ان غلط معتقدات و رسوم کو اس درجہ خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے کہ انسان انہیں تنقید کی حد سے بالاتر خیال کرتا ہوا کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ ذرا احکامِ خداوندی کی روشنی میں انہیں پرکھ کر تو دیکھ لے. سورۂ اعراف میں شیطان کے فتنۂ عظیمہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جن لوگوں پر شیطان کا جادو چل جاتا ہے اُن کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ:

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۷/۲۸)

یہ لوگ جب بے حیائی کی باتیں کرتے ہیں' تو کہتے ہیں" ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے (اور چونکہ وہ ایسا کرتے رہے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ) خدا نے ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہوگا." (اے پیغمبر!) تم کہہ دو" کہ خدا کبھی بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دے گا. کیا تم خدا کے نام پر ایسی بات کہنے کی جرأت کرتے ہو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں؟"

یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق ایک ہی آیت کے بعد تصریح فرما دی کہ

فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (۷/۳۰)

(تمہارے دو گروہ ہو گئے) ایک گروہ کو (اس کے ایمان و حُسنِ عمل کی وجہ سے کامیابی کی) راہ دکھائی۔ دوسرے پر (اُس کے انکار و بد عملی سے) گمراہی ثابت ہوگئی۔ ان لوگوں نے (یعنی دوسرے گروہ نے) خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا رفیق بنا لیا (یعنی مفسدوں اور شریروں کی تقلید کی) اور سمجھتے یہ رہے کہ راہِ راست پر ہیں!

وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ مُّھْتَدُوْنَ پر بنگاہِ تعمق غور فرمایئے اور پھر سوچئے کہ آج ہم ہی کتنے ہیں جن کی بعینہٖ یہی حالت ہے کہ

وَ اِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ کَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْھُمْ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیْرِ ○ (۳۱/۲۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس قانون کا اتباع کرو جو خدا نے نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ (نہیں) بلکہ ہم تو اس (راستہ) کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے (شیطان نے بزرگوں کی پیروی کے خیال کو اس قدر مزین بنا رکھا ہے کہ وہ اسے کسی طرح بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں) اگرچہ شیطان انہیں (اس آڑ میں) جہنم کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ بلا رہا ہو۔

لیکن پھر شیطان کے اس فریب کو کیا کیا جائے کہ مسلمان سمجھتا یہ ہے کہ یہ آیات یہود و نصاریٰ یا کفارِ عرب کے متعلق نازل ہوئی تھیں۔ ہم سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَ لٰکِنْ قَسَتْ قُلُوْبُھُمْ وَ زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○ (۶/۴۳)

لیکن ان کے دل سخت پڑ گئے اور جو کچھ بد عملیاں کر رہے تھے انہیں شیطان نے ان کی نظروں میں خوشنما کر دکھایا تھا۔

قرآنِ کریم نے دو آیات میں ایک ایسا تمثیلی بیان پیش کیا ہے جس میں مسلمانوں کی ساری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ فرمایا: وَ اتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰہُ اٰیٰتِنَا انہیں ذرا اس کی داستان بھی سناؤ جسے ہم نے اپنا ضابطۂ قوانین دیا۔ اُس نے کچھ عرصہ تک اُس پر عمل کیا اور اُس کے بعد (فَانْسَلَخَ مِنْھَا) اس میں سے اس طرح باہر نکل گیا جس طرح سانپ اپنی کینچلی کو چھوڑ کر صاف باہر نکل جاتا ہے۔ وہ اس

ضابطۂ خداوندی سے باہر نکلا تو (فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ) شیطان نے اسے جھٹ سے آدبوچا اور اسے قانونِ خداوندی کی جگہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب دے دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ (فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۷/۱۷۵) منزل کی صحیح راہ اس سے بالکل گم ہو گئی۔ اس کے بعد فرمایا:

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۷/۱۷۶)

اگر وہ ہمارے قانون کے مطابق عمل کرتا تو اس کا مرتبہ بلند ہو جاتا۔ مگر وہ پستی کی طرف جھکا اور اپنے جذبات کی پیروی کرنے لگ گیا تو اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اسے دھتکارو جب بھی ہانپے اور زبان لٹکائے اور نہ دھتکارو جب بھی ایسا ہی کرے۔ ایسی ہی مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہمارے قانون کو جھٹلایا۔ تو (اے پیغمبر!) یہ بات لوگوں کو سناؤ۔ تاکہ وہ اس میں غور و فکر کریں۔

جماعتی زندگی اور شیطان

یہ تو تھی قلوب میں وسوسہ اندازی باطل تمناؤں کی تخلیق اور تزئینِ اعمالِ سیئہ۔ اب اس سے آگے ہیئتِ اجتماعیہ کی تعمیری زندگی کی طرف آیئے۔ قرآن کا منشاء یہ ہے کہ انسانی معاشرہ میں نظامِ ربوبیت رائج ہو۔ نظامِ ربوبیت کے معنی ہیں ایسا انتظام جس کی رُو سے تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ پر ہو اور وہ ان سب کی صلاحیتوں کی کامل نشوونما کا پورا پورا سامان مہیا کر دے۔ اس کے لئے قرآن کا پروگرام یہ ہے کہ پیداوار (رزق) کے وسائل معاشرہ کی تحویل میں رہیں۔ اور افرادِ معاشرہ اپنی اپنی محنت کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات خود رکھ کر، باقی اُس نظام کے سپرد کر دیں تاکہ وہ اس طرح جملہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پوری کرتا اور ان کے لئے سامانِ نشوونما فراہم کرتا رہے لیکن شیطان (انسان کے مفاد پرستی کے جذبات) اسے یہ کہہ کر ڈراتا رہتا ہے کہ اس طرح تم غریب اور مفلس ہو جاؤ گے۔ تم اپنی اور اپنی اولاد کی فکر کرو۔ تمہیں دوسروں کی نشوونما سے کیا۔ یہ ہے اصل بنیاد ابلیس اور وحی کی کشمکش کی۔ قرآن کہتا ہے کہ

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۙ (۲/۲۶۸)

یاد رکھو کہ شیطان تمہیں قدم قدم پر یہ کہہ کر ڈرائے گا کہ (تم نے سب کچھ نظامِ خداوندی کے حوالے کر دیا تو) محتاج ہو جاؤ گے اس لئے وہ تمہیں کہے گا کہ سب کچھ اپنے پاس رکھو لیکن اس کے برعکس اللہ کا قانون تمہارے لئے سامانِ حفاظت کا ضامن بنتا ہے اور معاشی خوشگواریوں کا کفیل. اس کا قانون بڑی کشادگی اور علم رکھتا ہے۔

انفاق حق و باطل کا معرکہ درپیش ہے. اجتماعی موت و حیات کا معاملہ سامنے ہے. نظامِ ربوبیت کے قیام کا سوال ہے. لیکن شیطان کا فریب ہے کہ دل میں خوف پیدا کئے جا رہا ہے کہ اگر "اپنا" سرمایہ یوں "دوسروں" کی خاطر لٹا دیا تو خود بھوکے مر جاؤ گے. نفسِ انسانی کی یہی تنگ نگہی اور کوتاہ دامنی ہے جس سے بچنے میں فلاح و سعادت مضمر ہے. وہ کہتا ہے کہ انسان کی ذات کی پرورش کا راز اس میں ہے کہ انسان اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دے. چنانچہ اس نے نظامِ ربوبیت قائم کرنے والی جماعت کے افراد کی یہی خصوصیتِ عظمیٰ بتائی ہے.

وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۫ؕ وَ مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ (۵۹/۹)

یہ لوگ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ خود تنگی کی حالت میں ہی کیوں نہ ہوں. اور حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی (عقلِ خودبیں کی) تنگ نگہی سے بچ گیا تو انہی کی کھیتیاں سرسبز ہوں گی۔

بخل اور اسراف بخل کرنے والے بھی شیطان کے تبعین ہیں اور دوسری طرف بیجا صرف کرنے والے بھی.

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَ كَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝ (۱۷/۲۷)

بے محل خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی بند ہیں. اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کی ناشکری کرنے والا ہے۔

فتنہ پردازی نیز جماعت کے اتحاد و اتفاق میں خلل اندازی کے لئے جھوٹی خبریں اڑا دینا اور ان کی تحقیق کئے بغیر انہیں فضا میں منتشر کر دینا، یہ بھی شیطنت ہے۔ فرمایا۔

وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا ○ (۴/۸۳)

اور جب ان لوگوں کے پاس امن کی یا خوف کی کوئی خبر پہنچ جاتی ہے، تو یہ (فوراً) اسے لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں۔ اگر یہ اسے (لوگوں میں پھیلانے کی جگہ) اللہ کے رسول (یعنی مرکزِ ملت) کے سامنے اور اُن لوگوں کے سامنے جو ان میں صاحب حکم و اختیار ہیں (یعنی مقامی حکام) پیش کرتے تو جو (اصحابِ علم و نظر) بات کی تہ تک پہنچنے والے ہیں، وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے (اور عوام میں تشویش نہ پھیلتی) اور (دیکھو) اگر اللہ کا تم پر فضل نہ ہوتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی، تو (تمہاری کمزوریوں کا یہ حال تھا کہ) معدودے چند آدمیوں کے سوا سب کے سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔

تفرقہ اندازی اس قسم کی افواہیں پھیلاتے رہنا اور اس قسم کی باتیں کرنا جس سے وحدتِ ملت پارہ پارہ ہو جائے اور باہمی مودّت و محبت کی جگہ بغض و عداوت پیدا ہو جائے۔

وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ○ (۱۷/۵۳)

اور (اے پیغمبر!) میرے بندوں سے کہہ دو کہ (مخالفوں سے یا آپس میں گفتگو کرتے ہوئے) جو بات کہو ایسی کہو جو نہایت حسین ہو۔ یاد رکھو۔ شیطان لوگوں کے درمیان فساد ڈالتا ہے یقیناً شیطان انسان کا صریح دشمن ہے۔

فواحش یا سوسائٹی میں عام برائی اور فواحش کے میلانات یا ان کے اسباب و ذرائع پیدا اور عام کر دینا۔

اِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ (۲/۱۶۹)

وہ (شیطان) تو تمہیں برائی اور بے حیائی اور بخل کی باتوں ہی کے لئے حکم دے گا۔ نیز اس (گمراہی) کے لئے اُکسائے گا کہ اللہ کے نام سے جھوٹی باتیں کہو جن کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں۔

دوسری جگہ ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ٥ (۹۰-۵/۹۱)

اے جماعتِ مومنین! بلاشبہ خمر اور میسرہ، استھان اور پانسے۔ شیطانی کاموں کی خباثت ہے تو ان سے اجتناب کرو۔ تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ خمر اور میسرہ کے ذریعہ تمہارے درمیان عداوت اور کینہ دلوا دے اور تمہیں خدا کی یاد اور صلوٰۃ سے باز رکھے (پھر بتلاؤ! ایسی برائیوں سے بھی) تم باز رہنے والے ہو یا نہیں۔

نیز ہر قسم کی مشرکانہ رسوم بھی شیطان کی ایجاد ہیں (۴/۱۱۹)۔

بحث وجدل، بلا علم و دلیل

اللہ تعالیٰ (اور اس کے احکام و قوانین) کے بارے میں بلاعلم و براہین مجادلہ کرنا (کہ قوانینِ الٰہیہ کے خلاف علم و دلیل ہو کس کے پاس سکتی ہے؟) وہ روش ہے جو کھلی ہوئی گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ يَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ٥ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ٥ (۳-۲۲/۴)

اور (دیکھو) کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور ان کے پاس کوئی علم نہیں۔ وہ ہر سرکش شیطان کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ حالانکہ شیطان کے متعلق یہ حتمی بات ہے کہ جو کوئی اس کا رفیق ہوا، وہ ضرور اسے گمراہی میں ڈالے گا اور عذاب جہنم تک پہنچا کر رہے گا۔

اور یہ گمراہی آباؤ اجداد کے مسلک کی اندھی تقلید سے پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی کتاب منیر کے خلاف (بلا علم و براہین) مجادلہ کرتا ہی وہ ہے جو مسلکِ اجداد پر اندھا دھند جما ہو اور اُن کے مسلک کو کتاب اللہ کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت نہ سمجھے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝ (۳۱/۲۱)

جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اس (ہدایت اور روشنی) کی پیروی کرو جو خدا نے اتاری ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے۔ (یہ لوگ آنکھیں بند کئے اسی گمراہی کے راستہ پر چلتے رہیں گے) اگرچہ (اس طرح) شیطان انہیں جہنم کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ بلا رہا ہو۔

جس قدر آیات آپ کے سامنے آچکی ہیں ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ ان میں "شیطان" سے مراد کوئی خارجی ہستی نہیں ہے بلکہ یہ وہی لوگ ہیں جو معاشرے میں فتنہ و فساد پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یا وہ اربابِ مذہب جو لوگوں کو کتاب اللہ (قرآن) کی طرف نہیں آنے دینا چاہتے اور انہیں تلقین کرتے رہتے ہیں کہ تم آنکھ بند کئے اپنی اس روش پر چلتے جاؤ جو تمہارے پاس متوارث چلی آرہی ہے۔ قرآن نے ان سب کو شیاطین کہہ کر پکارا ہے۔ یا خود انسان کی اپنی عقلِ حیلہ جو، جو انسانیت کے عالمگیر مفاد کے مقابلے میں انفرادی مفاد کو ترجیح دیتی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں یہ سب کچھ درحقیقت انسان کے جذبات کرتے ہیں۔ عقل تو جذبات کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہی جذبات ہیں جو حقیقت کو انسان کی نگاہوں سے اوجھل کر دیتے ہیں اور صحیح باتوں کی یاد بھلا دیتے ہیں۔ اس لئے نسیان کو بھی شیطان کا کام کہا گیا ہے (۶/۶۸؛ ۱۲/۴۲)۔

سہو و نسیان

اس طرح رفتہ رفتہ شیطان ان کے دل سے خود خدا کے قوانین کی یاد ہی فراموش کرا دیتا ہے۔

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ؀ (۵۸/۱۹)

شیطان نے ان پر قابو پالیا اور قوانین خداوندی کی یاد اُن سے بُھلا دی۔ یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں۔ دیکھو! شیطان کا گروہ ہی خسارہ میں رہنے والا ہے۔

اور جو اللہ کی یاد بھلا دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات اور زندگی کے مقاصد ہی کو بھلا دیتے ہیں۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ؀ (۵۹/۱۹)

تم ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو اللہ کو بھول گئے، تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خود فراموش ہوگئے۔ اور یوں صحیح راستے سے ایک طرف کو نکل گئے۔

اور ابلیس کی جنگ میں یہی سب سے بڑی شکست ہے کہ انسان اپنے آپ ہی کو بھول گئے۔

خوف و حزن

قصۂ آدم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ سب سے بڑی قوت جو شیطان کے مقابلہ میں انسان کو عطا کی گئی ہے، وحی آسمانی ہے۔ جس کے اتباع کا نتیجہ خوف و حزن سے مامون ہوجانا ہے۔ لہٰذا شیطان کا بڑا حربہ یہ ہے کہ خوف و حزن پیدا کرکے پائے استقلال میں لغزش اور عزم راسخ میں تزلزل پیدا کردے۔ سورۃ آلِ عمران میں مومنین کے متعلق فرمایا "کہ یہ وہ لوگ ہیں جن سے بعض آدمی کہتے تھے، تم سے جنگ کرنے کے لئے دشمنوں نے بہت بڑا گروہ جمع کرلیا ہے پس چاہیئے کہ ان سے ڈرتے رہو (اور مقابلہ کے لئے باہر نہ نکلو) لیکن (بجائے اس کے کہ یہ بات سُن کر وہ خوف زدہ ہوجاتے) ان کا ایمان اور زیادہ مضبوط ہوگیا۔ وہ (بے خوف و خطر) بول اُٹھے" کہ ہمارے لئے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے۔ اور جس کا کارساز اللہ ہو تو کیا ہی اچھا کارساز ہے۔

اس کے بعد ہے:۔

اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیۡطٰنُ یُخَوِّفُ اَوۡلِیَآءَہٗ ۪ فَلَا تَخَافُوۡہُمۡ وَ خَافُوۡنِ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۳/۱۷۴﴾

یہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ شیطان تھا جو تمہیں اپنے ساتھیوں سے ڈرانا چاہتا تھا۔ اگر تم ایمان رکھنے والے ہو تو شیطان اور اس کے ساتھیوں سے نہ ڈرو، مجھ ہی سے ڈرو۔ (اگر تم اللہ کے قانون سے ڈرتے رہے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی تمہیں خوف زدہ نہیں کرسکے گی)۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ شیطان خوف پیدا کرنے کے لئے کیا ذرائع واسباب اختیار کرتا ہے یعنی وہ اسلام کے مقابلہ میں مخالفین کے پیکروں میں نمودار ہوتا ہے جو اپنی قوت وسطوت سے مسلمانوں کو ڈراتے ہیں۔ یہاں جس خاص شیطان کا ذکر ہے تاریخ بتاتی ہے کہ یہ وہ جاسوس تھا جسے قریشِ مکہ نے مسلمانوں کے دلوں میں خوف اور ان کی قوت کا رُعب ڈالنے کے لئے بھیجا تھا۔ یہی وہ اَوۡلِیَآءَ الشَّیۡطٰن ہیں جن سے مقاتلہ کا حکم دیا گیا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۚ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ الطَّاغُوۡتِ فَقَاتِلُوۡۤا اَوۡلِیَآءَ الشَّیۡطٰنِ ۚ اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًا ﴿۴/۷۶؛ ۸/۴۸؛ ۱۹/۸۳﴾

جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان کا لڑنا اللہ کی راہ میں ہوتا ہے (کیونکہ وہ نفسانی خواہشوں کے لئے نہیں لڑتے۔ عدل وانصاف کی حمایت اور قوانینِ الٰہیہ کی ترویج وتنفیذ کے لئے لڑتے ہیں) اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں (یعنی شر وفساد کی شیطانی طاقتوں کی راہ اور ان کے غیر خدائی نظام کے تحفظ کے لئے لڑتے ہیں) سو (اگر تم ایمان رکھتے ہو، تو چاہیئے کہ) شیطان کے حمایتیوں سے لڑو (اور ان کی طاقت وکثرت کی کچھ پرواہ نہ کرو) شیطان کی چالیں (دیکھنے میں کتنی ہی مضبوط کیوں نہ دکھائی دیں حق کے مقابلہ میں) کبھی جمنے والی نہیں ہوتیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ جو لوگ یہ کہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور پھر اپنے دعوے پر ثابت قدمی سے جمے رہیں، تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے (۴۱/۳۰)۔ (اس کی تشریح آگے چل کر ملے گی)۔ اس کے برعکس جو لوگ خود ساختہ، باطل کی روش اختیار کرلیتے ہیں ان پر "شیاطین" کا نزول ہوتا ہے (۲۶/۲۲۱)۔ یہ

شیاطین، انسان پر کہیں باہر سے نازل نہیں ہوتے۔ یہ خود انسان کے قلب کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں اور جب وہ غلط روی کا فیصلہ کرتا ہے تو اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہ اس کے سرکش جذبات ہیں جن کا مظاہرہ محسوس اعمال کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہی وہ "شیاطین" ہیں جن کے اتباع سے روکا گیا ہے (۲/۱۶۸؛ ۲/۲۰۸)۔

شیطان کی عبودیت

بعض آیات میں کہا گیا ہے کہ لَا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ (۳۶/۶۰)۔ اس کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے "تم شیطان کی پرستش مت کرو" لیکن یہ معنی درست نہیں۔ شیطان کی پرستش تو کوئی بھی نہیں کرتا۔[1] "عبودیت" کے معنی اطاعت گزاری یا محکومیت اختیار کرنا ہیں۔ دوسری جگہ ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ (۱۶/۳۶)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے (دنیا کی) ہر اُمّت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا (تاکہ اس پیامِ حق کا اعلان کردے) کہ اللہ کی عبودیت (اطاعت اور پیروی) اختیار کرو اور سرکش قوتوں سے بچو۔

طاغوت کے معنی

چونکہ یہاں شیطان کے بجائے طاغوت کا لفظ استعمال ہوا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پیشتر اس کا مفہوم متعین کر لیا

---

[1] دنیا میں کوئی شخص (یا فرقہ) شیطان کی پرستش نہیں کرتا۔ عراق میں موصل کے قریب ایک باطنی قسم کے فرقہ (یزیدی) کے متعلق مشہور ہے کہ وہ شیطان کی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن تحقیقات نے بتا دیا ہے کہ وہ بھی درحقیقت شیطان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اس کے ڈر کی وجہ سے اس کے خلاف کچھ نہیں کہتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا تو رحیم و کریم ہے۔ اس لئے اس سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن شیطان سے ضرور خوف کھانا چاہیئے کہ وہ بہت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ اسی لئے شیطان کو شیطان نہیں کہتے (کہ اس سے سوءِ ادبی کا احتمال ہے) بلکہ اس کا نام ملک طاؤس رکھ چھوڑا ہے۔ بہرحال مطلب یہ ہے کہ شیطان کی عبادت سے مراد شیطان کی پرستش نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس سے مفہوم سرکش انسانوں کے احکام یعنی غیر خدائی نظام کی اتباع اور اطاعت اختیار کرنا ہے۔ جیسا کہ متن میں آیندہ سطور سے واضح ہے۔

جائے۔ طغیان کے معنی ہیں حد سے تجاوز کر جانا۔ چنانچہ طوفانِ نوح کے وقت جب پانی کی موجیں پہاڑوں کی سی بلندیاں اختیار کر گئی تھیں وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ (۱۱/۴۲) اور (دیکھو) ایسی موجوں میں کہ پہاڑ کی طرح اُٹھتی ہیں کشتی انہیں لئے جارہی ہے۔ تو اس کیفیت کو پانی کی طغیانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۙ (۶۹/۱۱)

(اور دیکھو) جب (ایسا ہوا تھا کہ) پانی حد سے بڑھنے لگا تو ہم نے تمہیں کشتی میں سوار کر دیا۔

یعنی کسی چیز کا اپنے اندازہ کے مطابق چلنا اعتدال ہے اور اس سے آگے بڑھ جانا سرکشی و طغیان۔ سورۂ رحمٰن میں اس مفہوم کی وضاحت اور بھی کھلے الفاظ میں فرمادی گئی ہے۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۙ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ○ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ○ (۵۵/۹-۷)

آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان (عدل) کو قائم کیا تاکہ تم وزن کرنے میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ اور وزن کو (صحیح طور پر) قائم رکھو اور (معاملاتِ زندگی میں) تولنے جھوکنے میں (کسی قسم کی) کمی نہ کرو۔

ترازوئے عدل کا سیدھا رکھنا اس کی صحیح حالت کا مظاہرہ ہے؛ اس اندازہ سے ہٹ جانا، جادۂ مستقیم سے انحراف و سرکشی ہے۔ اب انسانی زندگی کی طرف آئیے۔ کائنات کی ہر شے انسان کے لئے مسخر کر دی گئی ہے اس لئے ان پر حکمرانی انسان کے حیطۂ اقتدار کے اندر ہے۔ ان حدود کے اندر حکومت، سرکشی و طغیان نہیں۔ لیکن خود انسان کسی دوسرے انسان کے تابع نہیں اس لئے کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کا حق حاصل نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی انسان (یا گروہ) قوت فراہم کر کے دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنا لیتا ہے تو یہ اس کا جائز حدود سے تجاوز ہے اور طغیان و سرکشی۔ ایسی سرکشی جس میں یہ خدا کی ہمسری کا مدعی بن بیٹھتا ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم کی رو سے نظامِ قرآنی کے علاوہ ہر قسم کا نظام اطاعت

ہر غیر خدائی نظام

طاغوتی نظام ہے اور اس کی فرماں پذیری شرفِ انسانیت کی تذلیل۔ اس نظام کا نتیجہ فساد ہے جو اصلاح کی ضد ہے۔ وہ اُممِ سابقہ جنہوں

نے قوانینِ الٰہیہ سے سرتابی اختیار کرکے خود ساختہ قوانین کی حکومت قائم کررکھی تھی طاغوتی نظام کی علمبردار تھیں جس کا نتیجہ فساد تھا. یعنی معاشرہ میں ناہمواریاں۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝..... وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۝ الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ۝ (۸۹/۱۲-۶)

(اے پیغمبر!) کیا تُو نے دیکھا نہیں کہ تیرے پروردگار نے قومِ عاد. یعنی اونچی اونچی عمارتوں والی قومِ اِرم کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا. ان جیسی مخلوق آج تک شہروں میں پیدا نہیں ہوئی اور اسی طرح کیا تمہیں معلوم نہیں کہ) قومِ ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراش تراش کر عمارات بنائی تھیں. اور بڑے بڑے لشکروں والے فرعون (اور اس کے رفقاء) کے ساتھ جنہوں نے شہروں میں سرکشی اختیار کررکھی تھی (کیا برتاؤ کیا گیا تھا؟) ان تمام قوموں نے ان بستیوں میں بہت زیادہ فساد مچا یا تھا۔

بالخصوص فرعون جس کا جُرم یہ تھا کہ اس نے طغیانی اختیار کررکھی تھی۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ (۲۰/۲۴)

(اے موسیٰ!) فرعون کی طرف جاؤ. بلاشبہ وہ بہت سرکش ہوگیا ہے۔

یہی طاغوتیت ان اقوام کی ہلاکت کا باعث تھی۔

فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝ (۶۹/۵)

چنانچہ قومِ ثمود محض سرکشی کی وجہ سے ہلاک کی گئی۔

انسان سرتابی اس وقت اختیار کرتا ہے جب سمجھ لیتا ہے کہ مجھے کسی کی احتیاج نہیں. اسی زعمِ باطل کے ماتحت وہ کسی آئین وقانون کی پابندی کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ (۹۶/۷-۶)

ہرگز نہیں! یقیناً انسان سرکش ہوجاتا ہے. کیونکہ وہ اپنے آپ کو مستغنی سمجھنے لگتا ہے۔

یہ اس لئے کہ انسان سمجھتا ہے کہ زندگی صرف طبعی جسم کے جینے کا نام ہے اور اس کے لئے میں نے اس قدر سامان اکٹھا کرلیا ہے کہ مجھے کسی کی احتیاج باقی نہیں۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۙ وَ اٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۙ (۷۹/۳۸-۳۷)

سو جو کوئی حد سے گزر جائے اور زندگی کے مفادِ عاجلہ کو مستقبل پر ترجیح دینے لگے۔

لیکن اگر وہ سمجھتا ہے کہ زندگی صرف جسم کی پرورش کا نام نہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے اور اصلِ حیات اس کی تربیت و استحکام ہے تو وہ اپنے آپ کو کبھی دوسروں سے بے نیاز نہ کرتا۔ اس لئے کہ انسانی ذات کی تربیت و استحکام دوسرے انسانوں کی ربوبیت کا سامان فراہم کرنے سے ہوتی ہے لہٰذا ایک فرد کبھی دیگر افرادِ انسانیہ سے بے نیاز ہو نہیں سکتا۔ یہ اپنی تکمیلِ ذات کے لئے ایک ایسے معاشرے کا محتاج ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق تشکل ہو۔ بنا بریں یہ دوسرے انسانوں کا بھی محتاج ہے اور قوانینِ خداوندی کا بھی۔ لیکن جو لوگ اس حقیقت پر نگاہ نہیں رکھتے اور زندگی کو صرف جسم کی پرورش تک محدود خیال کر لیتے ہیں وہ قوانینِ خداوندی کی ضرورت نہیں سمجھتے اور اپنے خود ساختہ آئین و ضوابط کے مطابق معاشرہ تشکل کر لیتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو طاغوتی نظام قائم کرتے ہیں جس میں خدائی قوانین کے بجائے ان کے خود ساختہ قوانین نافذ ہوتے ہیں۔ اس نظام کی طرف رجوع کرنے سے جماعتِ مومنین کو روکا گیا ہے۔ اس لئے کہ جن کا مقصدِ حیات آئینِ خداوندی کا نفاذ ہو ان کے لئے طاغوتی نظام کی طرف رجوع کرنا کیسے جائز قرار پا سکتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَ يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝ (۴/۶۰)

(اے پیغمبر!) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جن کا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا ہے وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں؟ لیکن (عمل کا یہ حال ہے کہ) چاہتے ہیں اپنے جھگڑے نپٹنے طاغوت کے پاس لے جائیں۔ حالانکہ انہیں حکم دیا جا چکا ہے کہ اُس (کے نظام) سے انکار کریں۔ اور صرف اللہ کے نظام کی پیروی کریں۔ (اصل یہ ہے کہ شیطان چاہتا ہے' انہیں اس طرح گمراہ کر دے کہ وہ راہِ راست سے بہت دُور جا پڑیں۔

تحاکم اِلی الطّاغوت

تحاکم الی الطاغوت (یعنی زندگی کے معاملات کا فیصلہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے مطابق کرنا) سے یہ حقیقت بالکل واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ طاغوت سے مراد غیر خدائی نظامِ اطاعت ہے. جو لوگ اس نظام سے اجتناب کرتے ہیں ان کے لئے اس زندگی اور اس سے اگلی منزل دونوں میں سعادت و کامرانی کی بشارتیں ہیں.

وَ الَّذِیْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ یَّعْبُدُوْهَا وَ اَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۙ (۳۹/۱۷)

جو لوگ طاغوت کی محکومیت سے بچے اور قوانینِ الٰہیہ کی طرف جھکے ان کے لئے (سعادت و کامرانی کی) بشارت ہے تو (اے پیغمبرِ اسلام!) تو میرے بندوں کو (نظامِ خداوندی کی اطاعت کے نتائجِ حسنہ کی) خوشخبری دے دے.

برعکس ان کے عبادالطّاغوت کا ٹھکانا بہت بُرا ہے. (وَ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ ۵/۶۰). یعنی جہنم. اس دنیا میں بھی جہنم (جس پر آج شعلہ زار یورپ کا ایک ایک ذرہ شاہد ہے) اور آخرت میں بھی جہنم.

ایک اور طاغوتی نظام

یہ تو ہے وہ طاغوتی نظام جو حکومت و سلطنت کی شکل میں مرتب ہوتا ہے. لیکن اس کے علاوہ ایک اور طاغوتی نظام بھی ہے جو تقدّس کا نقاب اوڑھ کر قائم کیا جاتا ہے. اس نظام میں انسانوں کی ایک جماعت دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم و مطیع بناتی ہے لیکن بزورِ شمشیر نہیں بلکہ ان کے دل کی گہرائیوں میں اپنی عقیدت و عظمت کا بُت اُتار کر. جب ان کی عقیدت یوں اِن کے دلوں میں گھر کر لیتی ہے تو پھر مقدّسین کا یہ طائفہ اپنا ہر حکم اِن سے منواتا ہے اور یوں اس قسم کی حکومت قائم کرتا ہے جس کی حفاظت کے لئے فوج اور سپاہ کی بھی ضرورت نہیں پڑتی ہے. یہ وہ محکومیت ہے جس کی زنجیریں انسان خود نہایت تذلّل و تعبد اور عجز و انکسار سے اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں میں ڈالتا ہے. یہی وہ نظام ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں ہے.

اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ وَ مَا كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ۙ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِیْمِ ۵ (۲۲-۲۳/۳۷)

ان لوگوں کو جو (غیر اللہ کی محکومیت اختیار کر کے اپنے آپ پر) ظلم کیا کرتے تھے اور ان کے ساتھیوں کو مع ان لوگوں کے جن کی وہ خدا کو چھوڑ کر عبودیت (اطاعت اور پیروی) اختیار کیا کرتے تھے جمع کر لو اور پھر سب کو دوزخ کے راستہ کی طرف لے جاؤ۔

اس کے بعد ہے۔

وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ○ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ○ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ○ (۲۷-۳۰/۳۷)

اس وقت وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر سوال و جواب کرنے لگیں گے۔ (چنانچہ پیروی کرنے والے) کہیں گے کہ تم تو ہمارے پاس (خیر و برکت کا مقدس نقاب اوڑھ کر) بہت زور و شور سے آیا کرتے تھے۔ (اب خدائی عذاب سے تو ہمیں بچاؤ) وہ لوگ (جواب میں) کہیں گے کہ (ہم تمہارے پاس کب آتے تھے؟) تم خود ہی (دل سے) مومن نہیں تھے۔ (اس لئے غیر خدائی احکامات کی تلاش میں رہا کرتے تھے) ہماری تم پر کوئی زبردستی بھی نہیں تھی بلکہ تم خود ہی سرکش جماعت کے افراد تھے۔

غور فرمائیے۔ اس حقیقت کو کیسے واضح انداز میں بے نقاب کیا گیا ہے کہ ان متبوعین کی سیادت و قیادت اپنی قوت پر قائم نہیں ہوتی بلکہ متبعین کے جذبۂ عقیدت و ارادت پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر یہ انہیں ماننا چھوڑ دیں تو ان کی حکومت خود بخود ختم ہو جائے۔ بقول علامہ اقبالؒ؛

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست
چوں یکے اندر قیام آئی فناست

حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا میں کسی قسم کا استیلاء و تغلب کیوں نہ ہو اس کی بنیاد خود محکوم کی اپنی ہی کمزوری پر ہوتی ہے۔ وہ تو صرف ایک احکم الحاکمین کی ذات ایسی ہے جس کی حکومت و سرداری محکوم کے جذبۂ اطاعت کی رہینِ منت نہیں بلکہ اپنی قوت پر قائم ہے۔ اس کے سوا یہ قوت کسی اور کو حاصل نہیں۔ اس لئے حکومت کا حق بھی کسی اور کو نہیں۔

بہرحال یہی وہ شیاطین ہیں جن کے متعلق فرمایا؛

وَ قَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ
......اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (۱۴/۲۲)

جب فیصلہ ہوچکا تو شیطان بولا. بلاشبہ اللہ نے تم سے وعدہ کیا تھا. سچا وعدہ (اور وہ پورا ہوکر رہا) اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا مگر اسے پورا نہ کیا. مجھے تم پر کسی طرح کا تسلط نہ تھا (کہ تم میری پیروی پر مجبور ہو گئے ہو) جو کچھ پیش آیا وہ صرف یہ ہے کہ میں نے تمہیں بلایا اور تم نے میرا بلاوا قبول کرلیا. پس اب مجھے ملامت نہ کرو. خود اپنے آپ کو ملامت کرو. آج کے دن نہ تو میں تمہاری فریاد کو پہنچ سکتا ہوں نہ تم میری فریاد کو پہنچ سکتے ہو. تم نے اب سے پہلے جو مجھے (اللہ کا) شریک ٹھہرالیا تھا (کہ اس کے احکام کی طرح میرے حکموں کی بھی اطاعت کرنے لگے تھے) تو میں اس سے بیزاری ظاہر کرتا ہوں. بلاشبہ ظلم کرنے والوں کے لئے بڑا ہی دردناک عذاب ہے.

دو متمیز راستے

یہ ہے وہ طاغوتی نظام جس کے متعلق فرمایا کہ یہ ایمان باللہ کی ضد ہے.

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ
........اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۲۵۶-۲۵۷/۲)

دین میں کسی قسم کا اکراہ نہیں. بلاشبہ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور نمایاں ہوگئی ہے. (اور اب دونوں راہیں لوگوں کے سامنے ہیں جسے چاہیں اختیار کریں) پھر جو کوئی طاغوت سے انکار کرے (یعنی ہر اس نظام کی اطاعت سے انکار کردے جو غیر خدائی قوانین پر متشکل ہو) اور اللہ پر ایمان لائے (یعنی صرف اس نظام کی اطاعت کرے جو تو قوانین خداوندی کی ترویج کے لئے قائم ہو) تو بلاشبہ اُس نے (فلاح و سعادت کی) مضبوط شاخ پکڑلی. یہ شاخ ٹوٹنے والی نہیں. جس کے ہاتھ آگئی وہ گرنے سے محفوظ ہوگیا) اور یاد رکھو اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے. اللہ ان لوگوں کا ساتھی اور مددگار ہے جو ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں. وہ انہیں (ہر طرح کی تاریکیوں سے نکالتا اور روشنی میں لاتا ہے. مگر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، تو ان کے مددگار سرکش اور

مفسد (طاغوت) ہیں۔ وہ انہیں روشنی سے نکالتے اور تاریکیوں میں لے جاتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جن کا گروہ دوزخی گروہ ہے۔ ہمیشہ عذابِ جہنم میں رہنے والا۔[1]

آپ اِلّا اللہ کے قائل نہیں ہو سکتے جب تک پہلے لَا اِلٰہ کے عملی معترف نہ ہوں۔ آپ نظامِ خداوندی کا اتباع نہیں کر سکتے جب تک ہر غیر خدائی نظام سے روگردانی نہ کر لیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بیک وقت آپ کا مُنہ مشرق اور مغرب دونوں کی طرف ہو جائے۔ ایک کی طرف مُنہ کرنے کے لئے دوسرے سے مُنہ موڑنا پڑے گا۔ یہی ہر رسول کی تعلیم تھی۔ یہی اسلام کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۚ فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ○

(۱۶-۳۶)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے (دنیا کی) ہر اُمّت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا، (تاکہ اس

---

[1] یہاں یہ فرمایا کہ اللہ تو ظلمات سے نور کی طرف لے جاتا ہے اور طاغوتی نظام نور سے ظلمات کی طرف۔ نور اور ظلمات کی تشریح تو اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں سورۃ ابراہیم کی ایک آیت پر غور کیجئے۔ جہاں فرمایا:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ○ (۱۴/۵)

اور دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ ہم نے موسیٰ کو اپنے قوانین کے ساتھ بھیجا تھا کہ وہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکالے اور روشنی میں لائے اور انہیں اللہ کے (فیصلہ کن) واقعات کی یاد دلائے۔ کیونکہ ہر اس انسان کے لئے جو حق کی راہ میں مستقل مزاج رہے اور چاہے کہ اس کی کوششیں بھرپور نتائج مرتب کریں، ان واقعات میں (عبرت و موعظت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کا مشن یہ تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی و محکومیت سے نکال کر قوانینِ الٰہیہ کے اتباع میں لے آئیں۔ لہٰذا جس فضا میں قوانینِ الٰہیہ کا نفاذ ہو وہ نورانی فضا ہے اور جس میں طاغوتی نظامِ اطاعت قائم ہو وہ ظلمت ہے۔ طاغوت کا مقصدِ زندگی یہ ہوتا ہے کہ انسان کو انسانی نظامِ اطاعت کا محکوم رکھے اور جماعتِ مومنین کی سعی و عمل کا مرکز یہ کہ ایسے نظام کو توڑ کر نظامِ خداوندی قائم کیا جاوے۔

پیامِ حق کا اعلان کردے) کہ اللہ کی محکومیت اختیار کرو، اور سرکش قوتوں (کے
طاغوتی نظام) سے بچو. پھران اُمتوں سے بعض ایسی تھیں جن پر گمراہی ثابت ہوگئی پس
زمین میں چلو پھرو اور دیکھو، جو قومیں (سچائی کی) جھٹلانے والی تھیں انہیں بالآخر کیسا انجام
پیش آیا.

غور کیجئے! جو رسول بھی آیا اس دعوتِ انقلاب کو لے کر آیا کہ اطاعت و محکومیت صرف ایک خدائے واحد القہار کی ہے اس کے علاوہ کوئی نظامِ اطاعت ایسا نہیں جس کی اتباع کی جائے. اور خدا کی اطاعت ہو نہیں سکتی جب تک ہر غیر خدائی نظام سے عملاً انکار نہ کیا جائے. کیسی عظیم الشان ہے یہ دعوت اور کتنا بڑا محیّر العقول ہے یہ انقلاب!!! ایسا انقلاب جو انسانوں کو دوسرے انسانوں کی ہر قسم کی غلامی سے نجات دلاکر اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ اپنا سر اونچا کرکے جیے.

لغزش کے اسباب

یہ حقیقت شروع ہی میں سامنے لائی جاچکی ہے کہ انسان کے اپنے سرکش جذبات کا نام "شیطان" ہے. یعنی جب انسان، احکامِ خداوندی کے خلاف، اپنے سرکش جذبات کا اتباع کرتا ہے، تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے شیطان کا اتباع کیا. یہ وجہ ہے کہ اس قسم کے فیصلوں اور ان فیصلوں پر عمل کرنے کو "عمل الشیطان" (شیطان کا کام) کہہ کر پکارا گیا ہے. مثلاً جب حضرت موسیٰؑ نے (زمانہ قبل از نبوت میں) غصہ میں آکر ایک قبطی کو مار ڈالا تو اس پر متأسف ہوتے ہوئے کہا. هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ (۲۸/۱۵)
[یہ شیطان کے عمل کی وجہ سے ہوا. بلاشبہ وہ ایک گمراہ کرنے والا کھلا دشمن ہے].

شیطان کی طرف سے لغزش کے سامان خود انسانی اعمال فراہم کرتے ہیں. جنگِ اُحد میں جب مجاہدین کی ایک جماعت سے ذرا سی لغزش ہوگئی تو اس کے متعلق فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ (۳/۱۵۴)

تم میں سے جن لوگوں نے اس دن لڑائی سے منہ موڑ لیا تھا جس دن دونوں لشکر ایک دوسرے

سے مقابل ہوئے تھے تو ان کی اس لغزش کا باعث صرف یہ تھا کہ بعض کمزوریوں کی وجہ
سے جو انہوں نے پیدا کر لی تھیں، شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے۔ (یہ بات نہ تھی کہ ان
کے ایمان میں فتور آ گیا ہو۔ بہرحال) یہ واقعہ ہے کہ خدا نے ان کی یہ لغزش معاف کر دی۔ اس
کا قانون ایسا ہے کہ ایک بڑے نظام میں ایسی کوتاہیوں کی طرف سے سامانِ حفاظت
مل جاتا ہے اور نظام یونہی اپنی جگہ سے ہل نہیں جاتا۔

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے ایک خاص اسکیم کے ماتحت آپ کو حضرت یعقوبؑ سے الگ کیا تھا۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کی اس عداوت کو شیطان کی طرف منسوب کیا۔ (دیکھئے ۱۲/۱۰۰)۔

سورۂ زخرف میں ہے کہ جو شخص خدائے رحمٰن کے قانون سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اللہ اس پر شیطان مسلّط کر دیتا ہے۔ پھر ایسے لوگوں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ غلط راہ پر چلے جا رہے ہیں لیکن بزعمِ خویش سمجھتے یہ ہیں کہ ہم راہِ راست پر ہیں۔

وَ مَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ ○ وَ اِنَّهُمْ لَیَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ وَ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ (۴۳/۳۷ — ۳۶)

اور (یاد رکھو) جو کوئی رحمٰن کے قانون سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو ہم ایک شیطان کو
اس پر مسلّط کر دیا کرتے ہیں، چنانچہ وہی اس کا ساتھی ہوتا ہے۔ اور یقیناً یہ (شیاطین) ان
لوگوں کو (نظامِ خداوندی کی) راہ سے روکتے ہیں۔ (مگر شیطانی اثرات کے ماتحت یہ لوگ
اس قدر بے حس ہو جاتے ہیں کہ اپنی گمراہی کا انہیں پتہ نہیں چلتا بلکہ) وہ خیال کرتے ہیں
کہ وہ صحیح راستہ پر چل رہے ہیں۔

قرین

آیاتِ بالا سے واضح ہے کہ جسے شیطان کی طرف سے لغزش کہا جاتا ہے وہ درحقیقت انسانی اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اکثر و بیشتر ان غلط اعمال کے محرکات اس سوسائٹی کے اثرات ہوتے ہیں جسے وہ اپنے لئے اختیار کرتا ہے کیونکہ ہم نشینی کا اثر سب سے گہرا ہوتا ہے۔

اسی کو قرآنِ کریم نے قرین (ہمنشین) کہا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ وَمَنۡ یَّكُنِ الشَّیۡطٰنُ لَهٗ قَرِیۡنًا فَسَآءَ قَرِیۡنًا ۝

(۴/۳۸ ؛ ۲۸ — ۳۰/۲۵)

اور (ان لوگوں کو بھی خدا دوست نہیں رکھتا) جو محض لوگوں کے دکھانے کو (نام ونمود کے لئے) مال خرچ کرتے ہیں اور فی الحقیقت اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے (کیونکہ اگر اللہ پر سچا ایمان رکھتے، تو کبھی ایسا نہ کرتے کہ اسے چھوڑ کر انسانوں کے سامنے نمائش کرنی چاہتے) اور (دیکھو) جس کسی کا ساتھی شیطان ہوا تو کیا ہی بُرا یہ ساتھی ہے!

حاشیہ نشیں! یہ ہم نوالہ وہم پیالہ مصاحب جھوٹی خوشامدوں اور فریب کارانہ قصیدہ خوانیوں سے اصل حقیقت کبھی سامنے آنے نہیں دیتے اور اپنے اغراض ومقاصد کی خاطر اس کی لغویات وخرافات کو مزیّن بنا بنا کر دکھاتے رہتے ہیں۔

وَ قَیَّضۡنَا لَهُمۡ قُرَنَآءَ فَزَیَّنُوۡا لَهُمۡ مَّا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ (۴۱/۲۵)

اور (دیکھو) ان کے لئے ہم نے کچھ ایسے ہم نشین (ساتھی) مسلّط کر دیئے ہیں جو اُن کے اگلے اور پچھلے کاموں کو (خواہ وہ کتنے ہی بُرے کیوں نہ ہوں) مزیّن کرکے دکھاتے رہتے ہیں۔

چنانچہ یہ اور اس کے ساتھی سب جہنّم کی ہلاکت میں جا پہنچتے ہیں۔

وَ قَالَ قَرِیۡنُهٗ هٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِیۡدٌ ۝ .... مَا یُبَدَّلُ الۡقَوۡلُ لَدَیَّ وَمَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ۝ (۲۳ — ۵۰/۲۹)

اور (یاد کرو جب ایسا ہوگا کہ قیامت کے دن بدعمل انسان کا ہر) ساتھی (ہمنشیں) بجائے ساتھ دینے کے (مخالفت) میں کہے گا "یہ ہے وہ سب کچھ جو میرے پاس (جہنّم کے لئے) تیار تھا، ہر ناشکر گزار دشمن (حق) کو جہنّم میں ڈال دو! (خصوصیت کے ساتھ ہر اس شخص کو جو خیر سے روکنے والا، حد سے بڑھنے والا اور شک کرنے والا تھا جس نے اللہ کے ساتھ

ایک دوسرا الٰہ بنالیا۔ (ایسے شخص کو) سخت عذاب میں ڈال دو۔" (پھر بارگاہِ الٰہی میں اپنی برأت کرتے ہوئے) اُس کا ساتھی (ہمنشین) کہے گا کہ "اے ہمارے پروردگار! میں نے تو اسے سرکش نہیں بنایا تھا، وہ تو خود ہی بڑی دُور کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا" تو خدا اُن سے فرمائے گا۔ "میرے سامنے مت جھگڑو میں تو عذاب کا وعدہ تمہاری طرف پہلے ہی بھیج چکا ہوں۔ میرے یہاں بات بدلی نہیں جایا کرتی۔ اور نہ میں بندوں پر ظلم کرنے والا ہوں (کہ بلاوجہ بندوں کو عذاب میں مبتلا کردوں)۔

وہ قرین صاف مُکر جائے گا کہ اُس نے اسے نہیں بہکایا۔ یہ تو خود ہی بہک جانے پر تُلا بیٹھا تھا۔

حَتّٰى إِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ○ (۴۳/۳۸)

حتیٰ کہ جب وہ ہمارے سامنے آئے گا تو (اس شخص سے جسے دنیا میں بہکایا تھا) کہے گا اے کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق ومغرب کی دوری ہوتی" (کہ تیری بدعملی کی پاداش میں تو نہ پکڑا جاتا۔ ذرا خیال تو کرو) کہ یہ کتنا بُرا ساتھی ہے۔

لیکن جو لوگ خدا کے قانون کا اتباع کرتے ہیں اُن پر اس قسم کے قرین کا کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ وہ ہر وقت خدا کو سامنے رکھتے ہیں۔ اہلِ جنّت کے باہمی مکالمہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ۙ ..... وَ لَوْ لَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ○ (۵۰ ـ ۵۷/۳۷)

(اور) ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا (دنیا میں) ایک ساتھی تھا جو کہا کرتا تھا کیا تو (ان رسولوں کی باتوں کی) تصدیق کرنے والوں میں سے ہے؟ کیا جب مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیوں (کا ڈھیر) رہ جائیں گے۔ تو (پھر بھی) ہم اپنے اعمال کا بدلہ دیئے جائیں گے؟ اور وہ اپنے ساتھیوں سے کہے گا کیا تم (جہنم کی طرف) جھانک کر دیکھو گے؟ (بالآخر) وہ خود ہی جھانکے گا اور (اپنے) اس (ساتھی) کو جہنم میں دیکھے گا۔ اور کہے گا۔ خدا کی قسم قریب تھا کہ تو مجھے ہلاک ہی کر ڈالتا۔ اگر میرے پروردگار کا (مجھ پر) احسان وانعام نہ ہوتا تو (آج) یقیناً میں بھی ان لوگوں میں سے ہی ہوتا جو (عذابِ الٰہی میں) حاضر کیے گئے ہیں۔

اور ان شیاطین سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو قوانینِ الٰہیہ کی حفاظت میں لے آئے۔ چنانچہ فرمایا:

وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ (۴۱/۳۶)

اگر شیطان کی طرف سے تمہارے دل میں کوئی خلش وسوسہ کی پیدا ہو تو فوراً قوانینِ الٰہیہ کی پناہ میں آجایا کرو۔ یقیناً وہ قانون اس خدا کا ہے جو سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔

شیطان سے پناہ کا طریقہ

یہ ہیں وہ شیاطین جو پہلے دن سے ذرّیتِ آدم کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور قیامت تک سایہ کی طرح ساتھ رہیں گے۔ ان داخلی اور خارجی تباہ کاریوں سے بچنے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ جوں ہی اُن کے شعلہ کی لپک دکھائی دے، فوراً اپنے آپ کو حدود اللہ کے اندر لے آؤ جہاں خدا کا قانون تمہاری حفاظت کرے گا۔

وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝ (۲۰۰ — ۷/۲۰۱)

اور اگر ایسا ہو کہ شیطان کی طرف سے وسوسہ کی کوئی خلش محسوس ہو، تو قوانینِ الٰہیہ کی حفاظت میں آجاؤ۔ بلاشبہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی کی حفاظت میں رہتے ہیں اگر انہیں شیطان کی وسوسہ اندازی سے کوئی خیال چھُو بھی جاتا ہے، تو فوراً چونک اٹھتے ہیں، اور پھر (پردۂ غفلت اس طرح ہٹ جاتا ہے گویا) اچانک اُن کی آنکھیں کھل گئیں! مگر جو لوگ شیطانوں کے بھائی بند ہیں، تو انہیں گمراہی میں کھینچے لئے جاتے ہیں اور پھر اس میں ذرا بھی کمی نہیں کرتے۔

شیاطین کی وسوسہ اندازیوں اور فریب کاریوں سے بچنے کے لئے یہ آرزو کرو کہ

وَ قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ ۙ وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ ۝ (۲۳/۹۸-۹۷)

خدایا! میں شیطانی وسوسوں سے تیرے قانون کے دامن میں پناہ لیتا ہوں. میں اس سے بھی تیری حفاظت چاہتا ہوں کہ وہ میرے قریب بھی پھٹکیں.

حضرت مریمؑ کی والدہ نے ان ہی دعاؤں اور آرزوؤں کے ساتھ اپنی بچی کو اللہ کے حفظِ امن میں سونپا تھا. جب کہا تھا کہ

وَ اِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ (۳/۳۵)

[میں اسے اور اس کی نسل کو تیری پناہ میں دیتی ہوں کہ شیطان رجیم (کی وسوسہ اندازیوں) سے محفوظ رہے]. اس لئے کہ جو ایسا کھُلا دشمن، لیکن ایسا دام ہمرنگِ زمین بچھا کر وار کرنے والا ہو اس کے حربوں سے قوانینِ خداوندی کے علاوہ اور کہاں پناہ مل سکتی ہے؟ اسی حقیقت کو زیادہ گہرائی سے دلنشین کرنے کے لئے بار بار اس طرف توجہ دلائی گئی کہ یاد رکھو!

اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝ (۲/۱۶۸ نیز ۲/۲۰۸؛ ۱۲/۵؛ ۳۶/۶۰؛ ۴۳/۶۲)

بلاشبہ وہ تمہارا کھُلا دشمن ہے.

طاغوتی نظام کے سرغنہ، شیاطین

چونکہ شیطان سرکشی و بغاوت کا مظہر ہے اس لئے قرآن نے خدا فراموش جماعتوں کے سرغنوں اور سرکردہ لیڈروں کے لئے بھی شیاطین کا لفظ استعمال کیا ہے. اور حق بھی یہ ہے کہ یہ لوگ جو اس کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ دنیا میں خدا کا قانون رائج نہ ہونے پائے، اگر شیاطین نہیں تو اور کیا ہیں؟ سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں منافقین کے متعلق فرمایا:

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (۲/۱۴)

جب یہ لوگ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو (دعوتِ حق پر) ایمان لا چکے ہیں تو اپنے آپ کو

مومن ظاہر کرتے ہیں. لیکن جب اپنے شیطانوں کے ساتھ اکیلے میں بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو
ان کے ساتھ تمسخر کرتے تھے. ورنہ (ویسے دل سے تو) ہم تمہارے ہی ساتھ ہیں.

سورۂ انفال میں اس شیطان کا ذکر ہے جس نے کفارِ مکہ کو مسلمانوں کے خلاف ابھارا تھا. اور پھر میدانِ کارزار سے خود بھاگ نکلا تھا. تاریخ اس کا نام سراقہ ابنِ مالک ابنِ جعشم بتاتی ہے. (دیکھئے ۸/۴۸).

سورۂ بقرہ کے بارہویں رکوع میں حضرت سلیمانؑ کا ذکر ہے جس کے ضمن میں فرمایا کہ یہود بجائے اس کے کہ قانونِ خداوندی کا اتباع کرتے، ان افترا پردازیوں اور افسانہ طرازیوں کے پیچھے لگ جاتے تھے جو شیاطین نے مملکتِ حضرت سلیمانؑ کے خلاف پھیلا رکھی تھیں.

وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا...... (۲/۱۰۲)

یہ لوگ ان افسانہ طرازیوں کے پیچھے لگ گئے جو مفسدہ پرداز لوگوں نے مملکتِ سلیمانی کے خلاف پھیلا رکھی تھیں (جن کی رُو سے وہ کہتے تھے کہ سلیمان کافرانہ عقائد و اعمال کا مرتکب ہو چکا ہے. حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ) سلیمان نے کبھی کفر کی روش اختیار نہیں کی، (نہ ہی وہ ایسا کر سکتا تھا) بلکہ ان ہی مفسدہ پردازوں نے ایسی روش اختیار کر رکھی تھی.

یہاں بھی شیاطین سے مفہوم فتنہ جو اور فساد انگیز لوگوں کے سرغنوں سے ہے (تفصیل اس کی اپنے مقام پر آئے گی). سورۂ انعام میں فرمایا.

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ۝ (۶/۱۱۳)

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے (جب اس کی دعوت کا ظہور ہوا تو) شہری اور بدوی لوگوں کے سرغنوں کو ان کا دشمن ٹھہرا دیا جو ایک دوسرے کو ملمع ساز باتیں سکھاتے، تاکہ لوگوں کو فریب دیں. اور اگر تمہارا پروردگار (چاہتا تو یقیناً ایسا کر سکتا تھا کہ) وہ دشمنی نہ کرتے. (لیکن اس کا قانون ہے کہ انسان کے اختیار کو سلب نہ کیا جائے، پس ان کی مخالفت سے دل گرفتہ نہ ہو اور) انہیں ان کی افترا پردازیوں میں چھوڑ دو.

یہاں سے یہ واضح ہے کہ حضرات انبیائے کرام کے ہمدم ودشمن کے مخالفین کو شیاطین کہا گیا ہے۔ یہ درحقیقت وہ مذہبی پیشوا ہیں جو (رسول کے چلے جانے کے بعد) اپنی پُرفریب، ملمع ساز لیکن نہایت دلچسپ باتوں کو اس کی تعلیم میں ملا دیتے تھے (یا اُس کی جگہ ان باتوں کو دین بنا کر عام کر دیتے تھے) اور اس طرح قوم، خدا کے صحیح دین کو چھوڑ کر، ان کے خود ساختہ مذہب کا اتباع کرنے لگ جاتی تھی۔

اسی طرح غیر مہذب اور وحشی قبائل کے وہ قوی ہیکل، دیو پیکر سرکش قبائل جنہیں حضرت سلیمانؑ نے ہیکل کی تعمیر کے سلسلہ میں مختلف کاموں پر لگا رکھا تھا، شیاطین کے نام سے مذکور ہیں۔

وَ مِنَ الشَّیٰطِیۡنِ مَنۡ یَّغُوۡصُوۡنَ لَہٗ وَ یَعۡمَلُوۡنَ عَمَلًا دُوۡنَ ذٰلِکَ ۚ
وَ کُنَّا لَہُمۡ حٰفِظِیۡنَ ۝ (۲۱/۸۲ نیز ۳۷ - ۳۸/۳۸)

اور سرکش قبائل کے وحشی انسان جو اس کے لئے دریاؤں میں غوطے لگاتے اور اس کے علاوہ بھی طرح طرح کے کام کرتے۔ اور ہم انہیں اپنی پاسبانی میں لئے ہوئے تھے۔

کاہن اور نجومی

انسان کے عہدِ جہالت میں یہ عقیدہ تھا کہ انسانوں کی قسمت ستاروں سے وابستہ ہوتی ہے اور کاہن اور نجومی آسمان پر جا کر ستاروں کی باتیں معلوم کر لیتے ہیں اور پھر انسانوں کی قسمت کے متعلق پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ آپ تاریخ مذاہب پر غور کیجئے۔ آپ کو ہر معبد میں کاہنوں اور نجومیوں کے "مقدسین" ملیں گے جن کی پرستش ہوتی تھی۔ قرآنِ کریم نے ان لوگوں کو بھی شیاطین کہہ کر پکارا ہے اور کہا ہے کہ عہدِ جہالت میں تو ان کا کاروبار چل سکتا تھا لیکن اب جو قرآن کی روشنی سے فضا معمور ہو گئی ہے، اب اگر یہ "آسمان پر جا کر حالات معلوم کرنے" کی کوشش کریں گے تو علم و بصیرت کا آتشیں کوڑا ان کا تعاقب کرے گا اور یہ وہاں سے خاسر و ناکام بھاگ کھڑے ہوں گے۔ اب اس قسم کی توہم پرستیوں کا دور گذر چکا ہے۔ اب اگر ان کی کوئی بات ٹھیک نکل آتی ہے تو وہ محض قیاس آرائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ نہ علم و بصیرت کا نتیجہ۔ اور نہ ہی ان کی "روحانی قوتوں" کا کرشمہ! (قرآنِ کریم کی آیات ۱۶-۱۸/۱۵؛ ۶-۱۰/۳۷؛ ۵/۶۷)۔ سورۂ طور کے دوسرے رکوع میں مذکور ہے۔

اَمۡ عِنۡدَہُمۡ خَزَآئِنُ رَبِّکَ اَمۡ ہُمُ الۡمُصَۜیۡطِرُوۡنَ ۝ (۵۲/۳۷)

(اے پیغمبر!) کیا ان کے پاس تیرے پروردگار کے خزانے ہیں یا وہ (یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خود)

ہی (دنیا جہان کے) داروغہ بن گئے ہیں۔

سلسلۂ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کاہنوں یا نجومیوں کا ذکر ہے جن کی اُس زمانہ میں پرستش ہوتی تھی۔ اس کے بعد ہے۔

اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ○ (۵۲/۳۸)

یا اُن کے پاس کوئی سیڑھی ہے (جس پر چڑھ کر وہ آسمانوں سے راز کی) باتیں سُن آتے ہیں۔ تو (اے پیغمبر! تو اُن سے کہہ کیوں نہیں دیتا کہ) جو اُن میں سے سننے والا ہے اُسے کوئی واضح دلیل لانی چاہیئے؟

یہاں اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ سب ان لوگوں کی حیلہ کاری اور فسوں سازی ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں آسمانی باتوں کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ وحیٔ آسمانی تک ان لوگوں کی رسائی نہیں۔ یہ حقائق تو کتاب اللہ میں ہی مل سکتے ہیں جس کا نزول ملا ءِ اعلیٰ سے ہوتا ہے۔ کتاب اللہ کسی شیطان کا کلام نہیں ہے۔

وَ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ○ (۸۱/۲۵)

اور وہ (قرآن) کسی مردود شیطان کا کلام نہیں ہے۔

قرآن اُن کے اثرات سے منزّہ ہے

بلکہ شیاطین تو اس کے سننے تک سے باز رکھے گئے ہیں۔

وَ مَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ○ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَ مَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۚ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ۚ (۲۱۰ — ۲۶/۲۱۲)

اور (دیکھ لے پیغمبرِ اسلام!) اس قرآن کو شیاطین لے کر نہیں اُترے نہ انہیں لے کر اُترنا چاہیئے اور نہ ہی وہ اُتر سکتے ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ سننے سے بھی باز رکھے گئے ہیں۔ (کیونکہ قرآن ایک مکمل صداقت اور حقانیت ہے اور صداقت وحقانیت سے شیاطین کو کیا سروکار؟)

قرآن آسمان کی نورانی فضاؤں سے براہِ راست قلبِ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مقدس قندیل میں اُترا ہے اور راستہ کی کثافتوں سے یکسر پاکیزہ اور منزّہ رہا ہے اس کی تو کیفیت یہ ہے کہ

از تاک باده گیرم و در ساغر افگنم

شیاطین کی کیا مجال کہ اس کے بلند و بالا سرچشمہ کو جھانک سکیں یا کوثر و سلسبیل کی اس جوئے شفاف میں کسی قسم کا تکدّر پیدا کر سکیں۔ اِنَّهٗ نَزَّلَ عَلٰى قَلْبِكَ۔

سحر و کہانت کی شعبدہ بازیاں عہدِ جاہلیت و ظلمت میں اپنا سکّہ جما سکتی تھیں، لیکن قرآن کریم کے نزول کے بعد جو سرتاپا علم و بصیرت اور نور و حکمت ہے ان افسانہ طرازیوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ اب بارگاہِ علم و دانش سے اُن پر آگ کے کوڑے برسائے جاتے تھے۔ آپ تاریخ کے اوراق اُلٹ کر دیکھئے کہ سحر و کہانت کا ذہنِ انسانی پر کس قدر گہرا اثر تھا۔ لیکن آج وہ اثرات صرف جہالت اور تاریکی کی وادیوں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ قرآنِ کریم کے آفتاب نے ان ظلمتوں کو چاک کر دیا۔ نورِ سحر سے رات کی تاریکیاں کافور ہو گئیں۔ ان ساحروں، کاہنوں یا نجومیوں پر گویا وہ دروازے بند ہو گئے جن کی راہوں سے وہ عوام کو فریب دیا کرتے تھے۔ یہی وہ کاہن اور نجومی تھے جن کا ذکر سورۂ جنّ کی ذیل کی آیات میں بھی آیا ہے۔

وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّ شُهُبًاۙ
وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ
لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًاۙ (۷۲/۹-۸)

اور یہ کہ ہم نے (تمام) آسمان کو ٹٹول کر دیکھ لیا (آجکل) ہم نے اسے سخت سنگین پہرہ دار شعلوں سے بھرپور پایا۔ اور (آپ لوگ خوب جانتے ہیں) کہ ہم (کچھ راز کی) باتیں سننے کے لئے آسمان کے (خاص خاص) ٹھکانوں پر بیٹھ جایا کرتے تھے (مگر اب وہ ناممکن ہو گیا ہے) جو کوئی اب سنتا ہے وہ اپنے تعاقب میں ایک شعلہ کو پاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے انسانی دنیا میں ایک محیرّ العقول انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے کہہ دیا کہ اب ذہنِ انسانی اپنے سنِ شعور میں داخل ہو رہا ہے۔ اس لئے اب دنیائے انسانیت میں کسی قسم کی توہم پرستی کی گنجائش نہیں رہے گی۔ قرآن کی دعوت سرتاسر علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی دعوت ہے۔ وہ انسانی عقل و دانش سے اپیل کرتا ہے اور فکر و تدبر سے کام نہ لینے والوں کا ٹھکانہ جہنم قرار دیتا ہے۔ لہٰذا نزولِ قرآن کے بعد اس توہم پرستی کا دَور ختم ہو گیا جس میں پیشوائیت (PRIEST HOOD) کا مقدّس طائفہ لوگوں کو اس فریب میں مبتلا رکھا کرتا تھا کہ وہ غیب کی خبریں جانتے

ہیں اور انہیں آسمانی راز معلوم ہیں۔ یہی وہ "شیاطین" ہیں جنہیں قرآن کی بارگاہِ علم و دانش سے آتشیں کوڑے پڑتے ہیں۔

قرآن نے تو یہ کہا تھا۔ لیکن اس کے بعد خود قرآن کی حامل قوم کی یہ کیفیت ہوگئی کہ اب ان کے ہاں قدم قدم پر وہ حضرات تشریف فرما ملتے ہیں جنہیں دعوےٰ ہے کہ وہ غیب کی باتیں جانتے ہیں۔ وہ پیش گوئیاں کرتے ہیں اور لوگوں کو ان کی قسمت بتاتے ہیں۔ بلکہ قسمت بدل دینے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔

سوچئے کہ قرآن کا پیغام کیا تھا اور اس کی وارث قوم کیا کر رہی ہے؟

تحریفِ کُتبِ سماوی عملِ شیطانی تھا

قرآن سے پیشتر تمام کتب سماوی کے ساتھ یہ ہوتا رہا کہ رسول کی تشریف برآری کے بعد شیاطین رسول کی تلاوت فرمودہ وحی میں اپنی طرف سے بہت کچھ ملا دیتے تھے اور یوں اس خالص آسمانی تعلیم کو محرّف بنا دیتے تھے۔ جب یہ صورت پیدا ہو جاتی تو اس کے بعد اللہ کی طرف سے ایک دوسرا رسول آجاتا جو ذہنِ انسانی کے داخل کردہ رطب و یابس کو الگ کر کے خدائی تعلیم کو پھر سے منزّہ و مطہر کر دیتا۔ سورۂ حج میں فرمایا:

وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّ لَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ ۚ...... عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۙ‏ (۲۲/۵۲)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پیشتر جتنے رسول اور نبی بھیجے سب کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا کہ جو کچھ انہوں نے تلاوت کیا اس میں شیطان نے (کچھ اپنی طرف سے) ملا دیا۔ اور پھر اللہ نے اس کی آمیزش کا اثر مٹا دیا اور اپنی آیات کو اور زیادہ مضبوط کر دیا۔ وہ (سب کچھ) جاننے والا (اپنے سارے کاموں میں) حکمت والا ہے۔

وضعی روایات

اس کے علاوہ ان ہی شیاطین کی ایک اور اسی قسم کی حرکت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ لوگ وحیِ آسمانی میں تحریف نہیں کرتے بلکہ ایسی ایسی دلچسپ باتیں وضع کر کے انہیں دین کا نگاہ فریب نقاب اُڑھا دیتے ہیں کہ رفتہ رفتہ یہی باتیں عین دین

بن جاتی ہیں اور اس طرح دینِ خداوندی، ان مزین پردوں کے پیچھے چھپ کر یوں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ اگر اسے کبھی بے نقاب کر کے سامنے لانے کی کوشش بھی کی جائے تو لوگ اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ سورۂ انعام کی اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ۝ (۶/۱۱۳)

اور (اے پیغمبر!) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے شہری اور بدوی لوگوں کے سرغنوں کو دشمن ٹھہرادیا، جو ایک دوسرے کو خوشنما باتیں سکھاتے، تاکہ لوگوں کو فریب دیں۔ اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا، تو یقیناً ایسا کرسکتا تھا کہ) وہ دشمنی نہ کرتے (مگر اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ انسانوں کے اختیار و ارادہ کو سلب نہ کیا جائے) پس تو ان کی مخالفت سے دل گرفتہ نہ ہو) اور انہیں ان کی افترا پردازیوں میں چھوڑ دو۔

لوگ اس کذب و افترا کے دام ہمرنگِ زمین میں پھنس جاتے ہیں اور یوں حقیقت سے دُور جا پڑتے ہیں۔

وَ لِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ لِيَرْضَوْهُ وَ لِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ۝ (۶/۱۱۴)

اور (خدا کے نبیوں کے یہ دشمن اس طرح کی باتیں اس لئے سکھاتے ہیں) تاکہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے دل پُر فریب باتیں سُن کر) ان کی طرف جھک پڑیں، اور ان کی باتیں پسند کریں۔ اور جیسی بدکرداریاں وہ خود کرتے رہتے ہیں، ویسی ہی یہ بھی کرنے لگیں۔

حالانکہ اطاعت ان نظر فریب اور دلچسپ باتوں کی نہیں بلکہ کتابِ خداوندی کی کرنی چاہیئے (۶/۱۱۵)۔

شیطان بمعنی سانپ

عربی زبان میں شیطان سانپ کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ قرآنِ کریم میں بھی دو تین مقامات پر یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ناگ پھن تھوہر کے متعلق ہے۔

طَلۡعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوۡسُ الشَّيٰطِيۡنِ ○ (۳۷/۶۵)

اس (درختِ زقوم) کے پھول (ایسے ہوتے ہیں) گویا کہ سانپوں کے پھنے ہوں۔

سود خوار کی نفسیاتی کیفیت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔

اَلَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا كَمَا يَقُوۡمُ الَّذِىۡ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ‌ؕ (۲/۲۷۵)

جو لوگ (حاجتمندوں کی مدد کرنے کی جگہ اُلٹا اُن سے) سود لیتے اور اس سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ وہ (یاد رکھیں اُن کے ظلم وستم کا نتیجہ اُن کے آگے آنے والا ہے۔ وہ) کھڑے نہیں ہو سکیں گے مگر اس آدمی کا سا کھڑا ہونا جسے سانپ نے ڈس کر خبطی (پاگل، بے شعور و بے حس) بنا دیا ہو۔ (ہوسِ زر انسان کو اس طرح مخبوط الحواس بنا دیتی ہے)۔

اسی طرح حضرت ایوبؑ کے قصہ میں مذکور ہے کہ انہیں سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اس کے لئے بھی "شیطان" کا لفظ آیا ہے (۳۸/۴۱)۔

خلاصۂ مبحث ابلیس یا شیطان، انسان کے ان جذبات کا نام ہے جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی برت کر، انسان کو غلط راہوں پر ڈال دیتے ہیں۔ ان جذبات کی سرکشی کی بنا پر نہیں "شیطان" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ ہر سرکشی کا آخری نتیجہ مایوسی ہوتا ہے، اس جہت سے انہیں "ابلیس" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ابلیس اور شیطان ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں جس کا مسکن خود انسان کا سینہ ہے۔ شیطان کے کارنامے یہ ہیں کہ انسانوں کے دل میں وساوس پیدا کئے جائیں تاکہ ان کے عزم و ایقان میں تزلزل واقع ہو جائے۔ اُن کے راستے میں باطل تمناؤں اور حسین آرزوؤں کے ایسے نظر فریب مناظر بچھا کر رکھ دیئے جائیں جن میں ان کا دامن نگاہ اُلجھ کر رہ جائے اور وہ یوں سفرِ زندگی میں سیدھے منزل رواں دواں جانے کے بجائے اسی تماشائے رنگ و بُو میں کھو کر رہ جائیں۔ پھر اُن کی سعی و کاوش کو ایسا خوشنما بنا کر دکھایا جائے کہ انہیں احساس تک بھی نہ ہو کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، وہ غلط اور بے نتیجہ ہے۔ اس قسم کے نگہ فریب مناظر اور زینتِ اعمال کے لئے مذہب کی دنیا بہت راس آتی ہے۔

شیطان کا کام یہ بھی ہے کہ جوں ہی انسان کے سامنے اجتماعی مفادِ انسانیت کا گوشہ آئے اس کے ذاتی منافع کو اُبھار کر سامنے رکھ دیا جائے تاکہ وہ ایثار و قربانی کی راہوں سے کتراتا ہوا نکل جائے. اس کے علاوہ مختلف انداز کی فتنہ پردازیوں اور مفسدہ انگیزیوں سے ایسی صورتِ حالات پیدا کرنا ہے جس سے حیاتِ اجتماعیہ کا شیرازہ بکھر جائے. اور سب سے بڑی چیز یہ کہ وہ قلبِ انسانی کو خوف و حزن کا کاشانہ بنا کر اس کی غیرت، وحمیت اور جرأت، و بسالت کی دنیا کو برباد کر دیتا ہے. اس لئے حق پرستوں کی جماعت کو ہمیشہ شیطانی رجحانات وعواطف کی اطاعت سے روکا گیا ہے.

شیطان کے علاوہ قرآنِ کریم نے اسی مقصد کے لئے طاغوت کا لفظ بھی استعمال کیا ہے جس کے معنی ہر وہ غیر خدائی نظام ہے جو انسانوں کو خدا کی محکومیت سے ورغلا کر انسانوں کی اتباع و اطاعت سکھاتا ہے. یہ نظام حکومت وسلطنت کے علاوہ دنیائے مذہب میں بھی عجیب کشش وجاذبیت سے کارفرما رہتا ہے. لیکن کسی غیر خدا کی اطاعت، خواہ وہ حکومت وسلطنت کے رنگ میں ہو یا مذہب وعقیدت کے نقاب میں. بہرحال خدا سے کھلا ہوا شرک ہے.

پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ شیطانی لغزشوں کے اسباب کہیں باہر سے نہیں آتے بلکہ اس کے ذمہ دار خود انسانی اعمال ہوتے ہیں اور اس سوسائٹی کے اثرات جسے انسان اپنے لئے اختیار کرتا ہے اسی کو "قرین" کہا گیا ہے.

قرآن کریم نے طاغوتی نظام کے سرغنوں کے لئے بھی شیطان کا لفظ استعمال کیا ہے. نیز سرکش و شعلہ مزاج وحشی قبائل کے لئے بھی اور دنیائے مذہب میں ان کے لئے بھی جو وحیِ خداوندی میں تحریف و الحاق کرتے ہیں. یا بڑی بڑی خوشنما اور دلچسپ باتیں وضع کر کے لوگوں کو کتابِ خداوندی کی اطاعت سے دوسری راہوں کی طرف لے جاتے ہیں.

ooo

یا عطا فرما خرد با فطرتِ روح الامیں

ملائکہ

قصۂ آدم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ملائکہ کو حکم دیا گیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں اور انہوں نے اس حکم کی تعمیل میں اپنا سر جھکا دیا۔

ملائکہ ملاک کی جمع ہے جس کی دوسری صورت ملک ہے اور اس کا مادّہ (ا۔ ل۔ ك) ہے۔ الوکۃ کے معنی ہیں پیغام رسانی۔ لہٰذا ملائکہ کے معنی قاصد، پیغام رساں اور ایلچی کے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم میں ملٓئکہ کے لئے رُسُل کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی پیغام رساں ہیں۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ (۲۲/۷۵)

اللہ نے ملائکہ میں سے بعض کو پیام رسانی کے لئے برگزیدہ کر لیا۔ اسی طرح بعض انسانوں کو بھی۔ بلاشبہ اللہ ہی ہے سننے والا، دیکھنے والا۔

لیکن یہی لفظ "ملك" سے بھی مشتق ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں مَلٰٓئِکَۃ کے معنی ہوں گے مختلف قوتیں۔ قرآنِ کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ملائکہ سے مفہوم وہ قوتیں (FORCES) ہیں جو کائنات کی عظیم القدر مشینری کو مشیّتِ خداوندی کے مطابق چلانے میں مصروف العمل ہیں۔ اور چونکہ وہ قوتیں جو نظامِ فطرت کو چلانے کے لئے مامور ہیں (یعنی قوائے فطرت) اس لئے قانونِ خداوندی کی زنجیر کے ساتھ جکڑی ہوئی ہیں کہ اُن سے انسان کام لے سکے اس لئے قصۂ آدم میں کہا گیا ہے کہ ملائکہ

نے آدم کو سجدہ کردیا. مطلب یہ کہ فطرت کی قوتیں انسان کے لئے تابع فرمان بنادی گئی ہیں. یہ تمام قوتیں خدا کی اسکیم (PLAN) کے مطابق (جسے مشیت کہا جاتا ہے) مختلف امور کی سرانجام دہی میں سرگرمِ عمل ہیں. نظامِ کائنات کے اس طرح چلانے کا نام قرآن کی اصطلاح میں "تدبیرِ امور" ہے. ان تمام تدابیر (SCHEMES) کا مرکزی کنٹرول خدا کے ہاتھ میں ہے." اسے "استویٰ علی العرش" یعنی خدا کا مرکزِ حکومتِ کائنات پر مسلط ہونا کہا جاتا ہے. سورۂ یونس میں ہے.

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ (۱۰/۲)

تمہارا پروردگار تو اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ مراحل میں پیدا کیا (یعنی چھ معین زمانوں میں پیدا کیا). پھر اپنے تختِ حکومت پر متمکن ہوگیا. وہی تدبیرِ امور کرتا ہے (یعنی کائنات کی ہستی پیدا بھی اسی نے کی ہے اور اس میں قانون بھی اسی کا کارفرما ہے اور فرماں روائی بھی اسی کی ہے).

یہی وہ امر ہے جس کی بناء پر کائنات کا یہ عظیم الشان سلسلہ قائم ہے.

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ (۳۰/۲۵)

اور (دیکھو!) اس کی نشانیوں میں سے ایک (زبردست) نشانی یہ بھی ہے کہ آسمان اور زمین اس کے امر (حکم اور ارادہ) سے قائم ہیں.

ملائکہ مدبّراتِ امور ہیں

یہ تدبیرِ امور کس طرح نافذ العمل ہوتی ہے یہ چیز ہماری سمجھ سے بالا ہے لیکن قرآن نے بتایا ہے کہ قوانینِ مشیت کے تابع ان امورِ الٰہیہ کو جاری وساری کرنے کے فرائض جن کے ذمہ ہیں انہیں ملائکہ کہا جاتا ہے. اسی لئے ملائکہ کو مدبّراتِ امور کہا گیا ہے. فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۘ (۷۹/۵). دوسری جگہ انہیں اَلْمُقَسِّمٰتِ امور بھی کہا گیا ہے (۵۱/۴).

سورۂ طلاق میں ہے:

۵" مُدَبِّرَاتِ اُمُوْر" سے مراد جماعتِ مومنین بھی ہوسکتی ہے جو احکام و قوانینِ خداوندی کو انسانی دنیا میں نافذ کرتی ہے.

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۠ (۶۵/۱۲)

اللہ ہی کی وہ ذات ہے جس نے متعدد فضائی کرّے پیدا کئے اور ان ہی کی طرح زمین کو پیدا کیا (اور) ان سب میں اللہ کا امر نازل ہوتا ہے (یہ تمام باتیں بار بار ہم اس لئے بیان کرتے ہیں) تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ وہ ہر چیز کو (اپنے) احاطۂ علمی میں لئے ہوئے ہے۔

دوسری جگہ اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا گیا ہے۔

فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ اَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ ۖۗ وَ حِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ (۴۱/۱۲)

سو دو مراحل میں اس نے متعدد فضائی کرّے بنا دیئے اور ہر کرّے میں اپنا حکم بھیج دیا اور ہم نے اس قریب والے آسمان کو ستاروں سے زینت دی اور اس کی حفاظت کی۔ یہ اندازے ہیں خدائے زبردست واقف الکل کے۔

وسائط و ذرائع یعنی اللہ نے ان فضائی کرّوں میں اپنی وحی نافذ کر رکھی ہے کہ وہ اپنے فرائضِ مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں رہیں۔ اس وحی کا "نزول" بھی ملائکہ ہی کے ذریعے ہوا ہے۔ کیونکہ ملائکہ تقسیمِ امور کرنے والے ہیں۔ لہٰذا ملائکہ وہ وسائط و ذرائع ہیں جن کی رُو سے امورِ الٰہیہ کائنات میں نافذ ہوتے ہیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے امور کی تنفیذ میں وسائط و ذرائع کا محتاج ہے۔ اس کی ذاتِ صمدیت احتیاج کے ہر تصور سے منزہ اور اسباب و ذرائع کے ہر شائبہ سے مستغنی ہے۔ لیکن یہ اس کا قائم کردہ نظام ہے کہ دنیائے خلق ہو یا عالمِ امر حوادث و

حاملین عرش اثرات اس کے متعین فرمودہ نظام کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ احتیاج اور انتظام میں بدیہی فرق ہے۔ اسی نہج سے ملائکہ کو عرشِ الٰہی کے اٹھانے والے اور اس کے گرد طواف کرنے والے بتایا گیا ہے۔

وَ تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَ قِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
(۳۹/۷۵ ؛ ۴۰/۷)

تو دیکھے گا کہ ملائکہ عرش کے گرداگرد حلقہ باندھے ہوں گے (اور) اپنے پروردگار کی تسبیح و تحمید کر رہے ہوں گے۔ اور (اس دن) تمام بندوں میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا کہ ساری خوبیاں (صرف) خدا (ہی) کو زیبا ہیں' جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔

تذکرہ قیامت کے ضمن میں فرمایا؛

وَّ الْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَ يَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝ (۶۹/۱۷)

اور فرشتے اس کے تمام اطراف پر ہوں گے اور ان سے بھی اوپر تیرے پروردگار کے عرش کو اُس دن آٹھ ملائکہ اٹھائے ہوں گے[1]

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے عرش وہ مرکزِ حکومتِ خداوندی ہے۔ جہاں کائنات کی تدبیرِ امور ہوتی ہے۔ چونکہ یہ تدبیرِ امور ملائکہ کی وساطت سے سرانجام پاتی ہے اس لئے ملائکہ' عرشِ الٰہی کے اٹھانے والے اور کمربستہ اس کے گرد گھومنے والے ہیں۔ تعمیلِ ارشادِ خداوندی میں ان کی یہ سرگردانی اور انہماک ہی ہے جس سے یہ کارگہِ عالم اس حُسن و خوبی سے چل رہا ہے' اس لئے کہ وہ ان احکامات کو نافذ کرتے ہیں' ان میں اپنا دخل کچھ نہیں دیتے۔ انہیں ان میں دخل اندازی یا خلاف ورزیِ احکام کی قدرت ہی نہیں۔

ملائکہ میں معصیّت کی قُدرت نہیں

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (۱۶/۴۹)

اور آسمانوں میں جتنی چیزیں اور زمین میں جتنے جانور ہیں' سب قوانینِ خداوندی کے سامنے

---

[1] ملائکہ کی تسبیح و تحمید سے مطلب یہ ہے کہ وہ ان امور کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل رہتے ہیں جن کے نتائج خدا کی ربوبیت کی حمد و ستائش کے پیکر بن جاتے ہیں۔

سربسجود ہیں نیز ملائکہ بھی۔ اور وہ سرکشی نہیں کرتے۔

ذرا قصّۂ آدم پر ایک نگاہ پھر ڈال لیجئے۔ ملائکہ کی اطاعت و فرماں پذیری نکھر کر سامنے آجائے گی" فَسَجَدُوْٓا" کے معنی ہی یہ ہیں کہ انہوں نے تعمیلِ ارشاد میں اپنا سر جھکا دیا۔ نظامِ عالم میں جس قدر قوتیں سرگرمِ عمل ہیں وہ جب تک ایک مرکزی حکومت کے تابع نہ ہوں، یہ سلسلہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر مشین کا ہر پُرزہ اپنی اپنی مرضی کے ماتحت چلنے لگ جائے تو نتیجہ ظاہر ہے۔ ملائکہ کی اس بے چون و چرا تعمیل ہی کا نتیجہ ہے کہ کائنات میں کہیں فساد نظر نہیں آتا۔ فساد ہوتا وہاں ہے جہاں ایک سے زیادہ حکمرانوں کے فیصلے نافذ ہوتے ہوں۔ جہاں حکومت صرف ایک خدا کی ہو، اور اس کے کارندے ایسے فرماں پذیر، تو ایسی مملکت میں فساد کا شائبہ بھی نہیں ہوسکتا۔ ملائکہ کی یہ فرماں پذیری اس امر کی زندہ و پایندہ شہادت ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسری ہستی نہیں جس کا قانون کائنات میں چلتا ہو (۳/۱۸)۔

وحیٔ الٰہی کا پہنچانا رسولوں کی طرف وحی بھیجنے کا فریضہ منتخب ملائکہ کے ذمہ عائد کیا جاتا تھا۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ (۲۲/۷۵)

اللہ نے ملائکہ میں سے بعض کو پیام رسانی کے لئے منتخب کرلیا۔ اسی طرح بعض انسانوں کو بھی۔ بلاشبہ اللہ ہی سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

اس آیتِ مقدسہ میں ملائکہ اور انسانوں میں سے "رسولوں" کے انتخاب کا ذکر ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ نوعِ انسانی کی رُشد و ہدایت کے لئے حضرات انبیائے کرامؑ یا تو انسان ہوتے تھے، یا ملائکہ۔ انسانی ہدایت کے لئے انسان ہی رسول ہوتے تھے۔ ملائکہ اللہ کی طرف سے انبیاء کرامؑ پر وحی نازل کرتے تھے اور

ملائکہ "رسول" نہیں ہوتے تھے انبیائے کرامؑ اس وحی کو آگے عام انسانوں تک پہنچاتے تھے۔ قرآن کریم نے تصریح فرمادی ہے کہ ملائکہ انسانی رُشد و ہدایت کے لئے بطور رسول نہیں بھیجے جاتے تھے؛

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ (۱۷/۹۵)

(اے پیغمبر!) کہہ دے کہ اگر ایسا ہوا ہوتا کہ زمین میں (انسانوں کی جگہ) ملائکہ بسے ہوتے اور
اطمینان سے چلتے پھرتے تو ہم ضرور آسمان سے ایک فرشتہ پیغامبر بنا کر اتار دیتے.

یہاں سے ملائکہ کی رسالت اور حضرات انبیاء کرامؑ کی رسالت کا فرق بیّن طور پر سامنے آ جاتا ہے. ایک رسالت (پیغام رسانی) تو یہ ہے کہ اللہ نے پیغام دیا اور اسے رسول تک پہنچا دیا. جس طرح ایک چٹھی رساں مکتوب الیہ تک چٹھی پہنچا دیتا ہے. یہ پیغام رسانی ملائکہ کی ہے. دوسری پیغام رسانی حضرات انبیاء کرامؑ کی ہے جن کے متعلق فرمایا کہ چونکہ انہیں انسانوں کی رشد و ہدایت کے لئے بھیجا جاتا تھا اس لئے اس غرض کے لئے انسان ہی منتخب کئے جاتے تھے' تاکہ وہ پیغامِ خداوندی کو ایک عملی نظام کی صورت میں متشکّل کر کے بتا دیں کہ انسانی معاشرہ کی صحیح تصویر کیسی ہونی چاہیئے.

ایک نکتہ کی وضاحت

اس مقام پر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے. بعض لوگ اس آیت سے یہ استدلال لاتے ہیں کہ فرشتے بھی ہماری طرح کی مخلوق ہیں اور جس طرح ہم زمین پر بستے ہیں' وہ بھی اسی طرح بس سکتے ہیں.

فرشتوں کے مخلوق ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں لیکن یہ کہنا کہ وہ بھی "ہماری طرح" کی مخلوق ہیں قرآنی تصریحات کی روشنی میں صحیح نہیں' جہاں تک اس آیت کا تعلق ہے' اس سے پہلی آیت میں ہے (اور دیگر مقامات میں بھی یہ آیا ہے) کہ ان لوگوں کا اعتراض تھا کہ رسول' عام انسانوں جیسا انسان کیوں ہے. اسے کوئی فوق الفطرت ہستی ہونا چاہیئے' جیسے ملائکہ (۱۷/۹۴). ان کے اعتراض کے جواب میں کہا گیا کہ تم اپنی اعجوبہ پسندی کی دُھن میں اتنا بھی نہیں سوچتے کہ رسول کا منصب کیا ہوتا ہے. رسولؐ کے ذمے صرف خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچا دینا نہیں. وہ پہلے خود اس پیغام پر عمل کرتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی دوسرے انسانوں کے لئے نمونہ بنتی ہے. اس سے ظاہر ہے کہ رسول کو انہی جیسا ہونا چاہیئے جن کی طرف وہ رسول بن کر آتے. اگر ایسا نہ ہو تو اس کی زندگی اس کے مخاطبین کے لئے نمونہ کیسے بن سکتی ہے؟ چونکہ یہاں انسان بستے ہیں اس لئے رسول بھی ایک انسان ہی ہونا چاہیئے. تمہارا مطالبہ کہ رسول کو فرشتہ ہونا چاہیئے اسی صورت میں معقول ہو سکتا تھا جب یہاں فرشتے بستے. یہ ان کے اعتراض کا منطقی جواب تھا.

حضرت عیسیٰؑ کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا (اور ہے) کہ وہ فوق البشر تھے. ان کے اس

غلط عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ ان کی زندگی بنی اسرائیل کے لئے نمونہ تھی. اگر وہ فوق البشر ہوتے تو ان کی زندگی، انسانوں کے لئے نمونہ کیسے بن سکتی تھی (۴۳/۵۹). وہ فوق البشر ہوتے تو یہاں کی مخلوق کو بھی فوق البشر (ملائکہ) ہونا چاہیئے تھا (۴۳/۶۰).

"انسانوں کے لئے انسانوں میں سے رسول" یہ ایک ایسی حقیقت باہرہ تھی جس کی حکمت پر ہر چشم بصیرت شاہد تھی لیکن نہ ماننے والوں (کفار) کے نزدیک یہی شے محلِ نظر تھی اور وہ اعتراض کرتے تھے کہ ہمارے جیسا ایک انسان اور رسول! بھلا یہ کیا؟ قومِ نوحؑ نے یہی اعتراض پیش کیا تھا جب کہا کہ

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚۖ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۚ (۲۳/۲۴)

اس قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی وہ یہ سن کر کہنے لگے" یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے؟ مگر چاہتا ہے کہ تم پر اپنی بڑائی جتائے. اگر اللہ کو کوئی ایسی ہی بات منظور ہوتی تو کیا وہ فرشتے نہ اتار دیتا؟ (وہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی کو اپنا پیامبر کیوں بنانے لگا؟) ہم نے اگلے بزرگوں سے تو کوئی ایسی بات کبھی سنی نہیں."

یہی قومِ عاد و ثمود نے کہا:

اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (۴۱/۱۴)

جب اُن کے پاس اُن کے آگے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی (بکثرت) پیغمبر آئے (اور ان میں سے ہر ایک یہی کہتا آیا) کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبودیت (اطاعت و فرمانبرداری) اختیار نہ کرو، تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر ہمارے پروردگار کو (یہ منظور ہوتا (کہ وہ کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجے) تو (وہ ہرگز ہمارے پاس ہمارے ہی جیسا ایک انسان نہ بھیجتا بلکہ) فرشتوں کو بھیجتا. (ہم تمہاری اس رسالت کو نہیں مانتے) بلاشبہ ہم ان تمام احکام (توحید وغیرہ)

سے منکر ہیں جنہیں لے کر تم اپنے دعوے کے مطابق خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہو۔

حالانکہ حضرات انبیائے کرامؑ خود اعتراف کرتے تھے کہ ہم فرشتے نہیں ہیں۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا:

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ (۱۱/۳۱)

اور دیکھو، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں، نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔

نبیٔ اکرمؐ نے بھی یہی فرمایا:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ (۶/۵۰)

(اے پیغمبر! تم ان لوگوں سے) کہہ دو "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے غیبی خزانے ہیں۔ نہ یہ کہتا ہوں کہ غیب کا جاننے والا ہوں۔ نہ میرا یہ کہنا ہے کہ میں (انسانیت سے ماورا) فرشتہ ہوں۔

اس آیت سے بھی بعض لوگ یہ دلیل لاتے ہیں کہ فرشتے ہمارے جیسی مخلوق ہیں، جبھی تو رسولؐ اللہ (یا حضرت نوحؑ) نے کہا کہ "میں فرشتہ نہیں"۔ یہ دلیل بھی بڑی کمزور ہے۔ اس سے تو بلکہ اس کے برعکس نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ (جیسا پہلے واضح کیا جا چکا ہے) مخالفین کا بنیادی مطالبہ یہ تھا کہ رسول کو انسان نہیں، فوق البشر ہستی ہونا چاہیئے۔ اسی لئے وہ رسولوں سے معجزات کی فرمائش کرتے تھے۔ ان کے جواب میں کہا گیا کہ رسول، فوق الفطرت باتیں کس طرح کر کے دکھائے جبکہ وہ کوئی فوق الفطرت ہستی نہیں۔ چونکہ مخاطبین کے ذہن میں فوق الفطرت سے مراد ملائکہ تھے اس لئے "لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ" کہہ کر ان کی تردید کی گئی۔ مطلب اس کا صاف ہے کہ (رسول نے کہا کہ) اگر میرا یہ دعویٰ ہوتا کہ میں انسان نہیں، کوئی فوق البشر ہستی ہوں تو تم مجھ سے فوق الفطرت باتوں کا مطالبہ بھی کرتے۔ جب میرا یہ دعوےٰ ہی نہیں تو مجھ سے اس قسم کے مطالبات بے معنی ہیں۔

عجیب عجیب اعتراضات اب آگے بڑھئے. کفار کا اعتراض فقط اتنا ہی نہیں تھا. وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر یہ حضرات خدا کے رسول ہیں تو ان کے جلو میں فرشتوں کی قطاریں کیوں نہیں ہیں. حضرت موسیٰؑ کے متعلق بھی اعتراض کیا کہ اگر یہ رسول ہے تو

فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ ۝ (۴۳/۵۳)

(اگر وہ سچ مچ نبی ہے) تو اس کے (ہاتھوں میں) سونے کے کنگن کیوں نہیں ڈالے گئے یا پرے باندھے ہوئے اس کے جلو میں فرشتے کیوں نہیں آئے.

یہیں تک بس نہیں! بلکہ وہ تو کہتے تھے کہ خود اُن پر بھی فرشتے کیوں نہیں نازل ہوتے.

وَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰی رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ وَ عَتَوْ عُتُوًّا كَبِیْرًا ۝ (۲۵/۲۱)

اور وہ لوگ، جو ہمارے قانون کا آمنا سامنا کرنے کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ (ان پیغمبروں میں کیا خصوصیت ہے کہ ان پر فرشتے آتے ہیں) ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے. یا ہم (کھلی آنکھوں) اپنے پروردگار کو کیوں نہیں دیکھ پاتے (کہ شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے) یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں (نہیں بلکہ) یہ لوگ تو (حدِ انسانیت سے بھی) دور نکل گئے ہیں.

(اس کی تفصیل چند قدم آگے چل کر ملے گی).

نزولِ ملائکہ لیکن اس نفی کا یہ مطلب نہیں کہ حضرات انبیاء کرامؑ کے علاوہ اور کسی پر فرشتے نازل نہیں ہوتے حضرات انبیاء کرامؑ پر نزولِ ملائکہ، اللہ کی وحی کے ساتھ ہوتا ہے. اور رسالت کی وحی، رسول کے علاوہ اور کسی پر نازل نہیں ہو سکتی[1] لیکن ابلاغِ وحی کے علاوہ ملائکہ، اور مقاصد کے لئے بھی نازل ہوتے ہیں. ہم اس سے پیشتر دیکھ چکے ہیں کہ ابلیس کا کام خوف وحزن پیدا کرنا ہے. اس کے برعکس ملائکہ قلبِ مومن میں وہ تسکین وطمانیت پیدا کرتے ہیں جس سے خوف

---

[1] وحی کی دیگر اقسام وتفصیل کے لئے وحی کا عنوان دیکھئے.

وحزن پاس نہیں پھٹکنے پاتا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَيۡهِمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّةِ الَّتِىۡ كُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ۝

(۴۱/۳۰)

بلاشبہ جو لوگ اقرار کریں کہ ہمارا (حقیقی) پروردگار (صرف) اللہ (ہی) ہے پھر اس پر ثابت قدم رہیں تو (خدا کے) ملائکہ ان پر نازل ہوتے ہیں (جو کہتے ہیں) کہ تم نہ اندیشہ کرو نہ غم کرو اور اس جنّت (کے ملنے) سے خوش ہو جاؤ جس کا تم سے (پیغمبروں کی معرفت) وعدہ کیا جایا کرتا تھا۔

ذرا نزولِ ملائکہ کی شرط پر پھر غور فرمایئے۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا! اللہ کی ربوبیت پر ایمان اور پھر اس ایمان پر استقلال، محکم ایمان، غیر متزلزل ایمان، کوہ شکن ایمان، ایسا ایمان کہ ابلیس کی بڑی سے بڑی قوت بھی اس میں جنبش نہ پیدا کر سکے۔ اس سے نزولِ ملائکہ ہوتا ہے جس سے قلبِ انسانی تسکین و طمانیت کی نورانی بارشوں کا مہبط بن جاتا ہے۔ یہی وہ

تسکین وطمانیت کی بارش

استقلال و استقامت تھی جس کی بنا پر بدر و حنین کے میدانوں میں اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کی نصرت ملائکہ کے ان جنود و عساکر سے فرمائی جنہوں نے آکر مخالفین کے قلوب میں خوف اور رعب اور مسلمانوں کے دلوں میں سکون و طمانیت پیدا کر دی۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے:

وَلَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدۡرٍ وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ ۚ...... وَمَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ۝ (۱۲۳ - ۳/۱۲۶)

اور دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے بدر کے میدان میں تمہیں فتحمند کیا تھا حالانکہ تم بڑی کمزور حالت میں تھے (اور تمہاری کامیابی کا کوئی وہم و گمان بھی نہیں کر سکتا تھا) پس تم سے کہا گیا کہ اللہ کے قانون کی حفاظت میں آجاؤ (اور اس کی نافرمانی سے بچو) تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔ (اے پیغمبر!) وہ وقت (بھی) یاد کرو جب تم (میدانِ جنگ میں) ایمان والوں سے یہ کہہ رہے تھے کہ "کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں

کہ اللہ (دشمن کے تین ہزار آدمیوں کے مقابلہ میں) تین ہزار نازل کئے ہوئے ملائکہ سے تمہاری مدد فرمائے؟" ہاں بلاشبہ اگر تم استقامت پذیر رہو اور تقوٰے کی راہ اختیار کرو اور پھر ایسا ہو کہ دشمن تم پر اسی دم چڑھ دوڑے تو تمہارا پروردگار (صرف تین ہزار ملائکہ ہی سے نہیں بلکہ) پانچ ہزار نشان رکھنے والے ملائکہ سے تمہاری مدد کرے گا (اور دشمنوں کی کثرت وطاقت تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکے گی!) اور یاد رکھو، یہ بات جو کہی گئی ہے، تو صرف اس لئے کہ تمہارے لئے (فتحمندی کی) خوشخبری ہو اور تمہارے دل اس کی وجہ سے مطمئن ہو جائیں. اور مدد و نصرت جو بھی ہے، اللہ کے قانون کے مطابق ہی آتی ہے. اس کی طاقت سب پر غالب ہے اور وہ اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے!

سورۃ انفال میں انہی ملائکہ کے متعلق فرمایا:

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ٥ (۸/۱۲)

(اے پیغمبر!) یہ وہ وقت تھا کہ تیرے پروردگار نے ملائکہ کو حکم دیا تھا کہ: میں تمہارے ساتھ ہوں (یعنی میری مدد تمہارے ساتھ ہے) پس مومنوں کو استوار رکھو. عنقریب ایسا ہوگا کہ میں کافروں کے دلوں میں (مومنوں کی) دہشت ڈال دوں گا. سو (مسلمانو!) ان کی گردنوں پر ضرب لگاؤ. ان کے ہاتھ پاؤں کی ایک ایک انگلی پر ضرب لگاؤ!

یوم حنین کے متعلق ارشاد ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ۙ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ ....

.... وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ٥ (۹/۲۶ - ۲۵)

(مسلمانو!) یہ واقعہ ہے کہ اللہ بہت سے موقعوں پر تمہاری مدد کر چکا ہے (جبکہ تمہیں اپنی قلت و کمزوری سے کامیابی کی امید نہ تھی) اور جنگِ حنین کے موقع پر بھی، جبکہ تم اپنی کثرت پر اترا گئے تھے (اور سمجھتے تھے کہ محض اپنی کثرت سے میدان مار لوگے) تو دیکھو وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی پوری وسعت کے باوجود تمہارے لئے تنگ

ہو گئی۔ بالآخر ایسا ہوا کہ تم میدان کو پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے۔ پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی جانب سے دل کا سکون و قرار نازل فرمایا اور ایسی فوجیں اتار دیں جو نظر نہیں آتی تھیں۔ اور (اس طرح) ان لوگوں کو عذاب دیا جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی اور یہی جزا ہے ان لوگوں کی جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں! (یعنی ان کی بدعملی کا لازمی نتیجہ یہی ہے)۔

ان تمام مقامات پر غور کیجئے۔ "ملائکہ کی مدد" کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس سے جماعتِ مومنین کے دلوں کو تسکین ملی تھی اور ان کے عزائم پختہ ہو گئے تھے۔ دوسری طرف دشمنوں کے دل خوف زدہ ہو گئے تھے اور ان کے حوصلے چھوٹ گئے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان مقامات میں ملائکہ سے مراد وہ نفسیاتی محرکات ہیں جو انسانی قلوب میں اثرات مرتب کرتے ہیں، اور چونکہ انسان کے عزائم و اعمال پر نفسیاتی کیفیات بڑا گہرا اثر کرتی ہیں اس لئے فتح و شکست اور کامیابی و ناکامی کا بیشتر انحصار ان ہی پر ہوتا ہے۔ اسی قلبی سکون اور دلی اطمینان کا تذکرہ اس واقعہ میں بھی کیا گیا ہے۔ جب نبیٔ اکرمؐ (صرف اپنے ایک ساتھی جناب صدیقؓ کی معیت میں) صبحِ ہجرت ایک غار میں پناہ گزین تھے۔ دنیاوی نقطۂ اعتبار سے بالکل بے کس و بے بس، بے سروسامان، بے یار و مددگار، گھربار چھوڑ کر وطن سے بھاگے ہوئے، دشمن اپنے پورے ساز و سامان سے تعاقب میں۔ ذرا تصور میں لائیے خوف و ہراس کے اس حوصلہ شکن منظر کو! اس بے کسی کی حالت میں چھپے بیٹھے ہیں۔ دشمنوں کے گھوڑوں کی ٹاپ کی آواز کانوں میں آ رہی ہے۔ اس یارِ غارؓ کی پیشانی پر، اپنی خاطر نہیں بلکہ بپاسِ خاطر رفیقِ اعظمؐ "تردد و پریشانی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ اس دوست کی نگاہوں نے اسے دیکھا اور یاس و ناامیدی کے اس ہولناک سماں میں پورے حزم و یقین کے ساتھ فرمایا کہ "لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" مت گھبراؤ اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔ اس تثبیتِ قلب اور تسکینِ خاطر کو بھی "نزولِ ملائکہ" سے تعبیر کیا گیا ہے جب فرمایا کہ

اِلَّا تَنْصُرُوْہُ فَقَدْ نَصَرَہُ اللّٰہُ اِذْ اَخْرَجَہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا......

...... وَ اللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ٥ (۹/۴۰)

اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہیں کرو گے تو (نہ کرو) اللہ نے اس کی مدد کی ہے اور اس وقت مدد کی ہے جب کافروں نے اسے اس حال میں گھر سے نکالا تھا کہ (صرف دو آدمی

تھے' اور) دو میں دوسرا (اللہ کا رسول) تھا اور دونوں غار میں چھپے بیٹھے تھے اور اس وقت اللہ کے رسول نے اپنے ساتھی سے کہا تھا' غمگین نہ ہو' یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" (وہ دشمنوں کو ہم پر قابو نہ پانے دے گا) پس اللہ نے اپنا سکون و قرار اس پر نازل کیا' اور پھر ایسی فوجوں سے مددگاری کی جنہیں تم نہیں دیکھتے' اور بالآخر کافروں کی بات پست کی اور (تم دیکھ رہے ہو کہ) اللہ ہی کی ذات ہے جس کے لئے بلندی ہے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

اللہ ملائکہ اور جماعتِ مؤمنین کی یہی تائید و نصرت تھی جس کے متعلق دوسرے مقام پر فرمایا۔

فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ (۶۶/۴)

اگر پیغمبر کے مقابلہ میں تم نے کچھ کیا تو (یاد رکھو! پیغمبر تمہارا محتاج نہیں) خدا' جبرئیل اور نیک مسلمان اس کے رفیق ہیں اور اس کے بعد عام ملائکہ بھی اس کے مددگار ہیں!

(تفصیل اپنے مقام پر آئے گی)۔

درود و صلوٰۃ

یہی تائید و نصرت ہے جسے درود و صلوٰۃ کہا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (۳۳/۵۶)

(اے جماعتِ مومنین!) دیکھو' خدا اور اس کے ملائکہ (سب) نبی کی تائید و نصرت کرتے ہیں۔ سو اے ایمان والو! تم بھی اس کی تائید و نصرت کرو۔ یعنی اس نظامِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرو۔

صرف نبیِ اکرمؐ کی تائید و نصرت نہیں بلکہ تمام مومنین کی۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۚ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۝ (۳۳/۴۳)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) خدا ہی کی تو وہ ذات ہے جو تمہاری تائید و نصرت کرتا ہے۔ اور اس کے فرشتے (بھی) تاکہ وہ تمہیں (غیر اللہ کی محکومی کی) تاریکیوں سے نکال کر (حکومت

فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (۲/۳۸)

وحی

رہبرِ منزلِ حیات

اگرچہ عقل فسوں پیشہ لشکرے انگیخت
تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست

وَحی

انسان، وادیٔ آدمیت میں اُترنے کو اُترا، لیکن ابلیس کی بے پناہ قوتوں کو دیکھ کر سہم گیا، جو قدم قدم پر تصادم و تزاحم کے لئے آمادہ بپیکار تھیں۔ ایسی مہیب اور خوفناک وادی اور یہ بالکل تنہا! کشمکشِ زندگی ایسی جاں کاہ اور یہ بے سروسامان!! آنے والے خطرات کے تصور سے اس کا جی بیٹھ گیا۔ خوف اور دہشت سے قدم لڑکھڑانے لگے۔ اس ہولناک منظر میں اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن کوئی معین و مددگار نظر نہ آیا۔ حسرت بھری نگاہیں اوپر کو اُٹھیں اور ہمہ تن التجا بن کر ایک بلند و بالا چوکھٹ سے جا ٹکرائیں۔ پکارنے والے نے یوں پکارا۔ اور جواب دینے والے نے اپنے ترحّمِ ربوبیّت سے اس طرح نوازا کہ سکون وطمانیت کی ہزار جنّتیں اس کے قلبِ مضطرب آباد کردیں۔ فرمایا کہ:-

لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۝ (۳/۱۳۸)

دیکھو، نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو۔

کیوں گھبراتے ہو۔ کیوں خوف کھاتے ہو؟ تم تو دنیا میں سب سے بلند ہو۔ لیکن اس بلندی تک پہنچنے کا طریقہ یہ ہے کہ

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (۲/۳۸)

جب ہماری جانب سے تمہاری طرف ہدایت آئے تو جو ہدایت کی پیروی کرے گا اس کے

لئے کسی طرح کا کھٹکا اور کسی طرح کی غمگینی نہیں ہوگی۔

یہ مت خیال کر کہ اس ظلمت کدہ میں تجھے تنہا چھوڑ دیا گیا ہے، نورِ ازلی کی شمعِ فروزاں تیرے ساتھ ہے پھر گھبرانا کیسا؟

اگرچہ عقل فسوں پیشہ لشکرے انگیخت
تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست

ابلیس کی تمام لرزہ انگیز، اور حوصلہ شکن قوتیں ایک طرف، اور ان کے مقابلہ کے لئے، ہدایتِ خداوندی دوسری طرف۔ اس کے بعد انسان کو کسی دوسری چیز کی ضرورت نہ تھی۔

یہ سوال کہ کشمکشِ حیات میں متصادم قوتوں کے مقابلہ کے لئے انسان خود اپنا خضرِ راہ ہو سکتا ہے یا اس کی راہنمائی کے لئے کسی خارجی روشنی کی بھی ضرورت ہے؟ بڑا اہم اور بنیادی ہے اور شروع سے آج تک اربابِ فکر و نظر کی توجہات کا مرکز چلا آ رہا ہے۔ اس مقام تک پہنچنے سے پیشتر، چند ایک ابتدائی مراحل کی وضاحت نہایت ضروری[1] ہے۔ اصل بحث شروع ہونے سے پہلے یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ مذہب کا سارا دارومدار وحی کے عقیدے پر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خدا کا ماننا ایک حقیقت کا اعتراف ہے۔ لیکن جس مقصدِ عظیم کے لئے خدا پر ایمان ضروری ہے وہ وحی کے ذریعے ہی پورا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہدایتِ خداوندی، وحی کے توسط ہی سے ملتی ہے اور یہی وہ ہدایت ہے جس سے انسان قوانینِ الٰہیہ کے تابع زندگی بسر کر کے شرفِ انسانیت کی تکمیل کر سکتا ہے۔ لہٰذا جس شخص کا، صحیح معنوں میں، خدا پر ایمان ہے اس کے لئے وحی کا ماننا بھی ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا اور خدا کا تعلق ہی وحی کے ذریعے قائم ہے۔ اگر وحی نہ ہو تو ہم جان ہی نہیں سکتے کہ خدا کیا ہے اور اس کا انسانوں کے ساتھ واسطہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سے خدا کی معرفت (پہچاننے) کا مطالبہ نہیں۔ مطالبہ اس کی نازل کردہ وحی کی رُو سے اس پر ایمان لانے کا ہے۔ وحی کے معنی ہیں وہ قانون یا ضابطہ جس کے مطابق انسانوں کو زندگی

---

[1] عقل اور ماورائے عقل مباحث کا تعلق علمِ فلسفہ سے ہے اس لئے موضوعِ زیرِ نظر کا انداز بھی فلسفیانہ ہی ہونا چاہیئے لیکن چونکہ فلسفہ کے فنی غوامض اور اصطلاحی رموز کا سمجھنا، ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کوشش یہ کی گئی ہے کہ فلسفہ کے فنی اسلوب سے ہٹ کر عام فہم انداز میں بات کی جائے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

بسر کرنا چاہیئے. یہ ضابطہ یا قانون، عقلِ انسانی کا پیدا یا تجویز کردہ نہیں بلکہ انسانی عقل سے ماوراء، خود خدا کی طرف سے ملا ہے. مشکل یہ ہے کہ مغربی تعلیم نے ہماری ذہنیت کو اس درجہ محسوسات کی چار دیواری میں محبوس کر دیا ہے کہ وہ مادہ سے آگے کسی اور دنیا کو بمشکل تسلیم کرتی ہے. انیسویں صدی کے اخیر تک کائنات کے متعلق مغرب کے سائنسدانوں کا تصور میکانکی تھا جس میں ماورائے مادہ کسی عقیدے کی گنجائش نہ تھی. وہ تصور، یورپ کی فکر گاہوں سے ایک عرصہ ہوا مردود قرار پا کر رخصت ہو چکا لیکن ہمارے ہاں کی ذہنیتیں ابھی تک اسی تصور سے ماؤف چلی آ رہی ہیں. لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ان کی تسکینِ خاطر کے لئے یورپ کے مفکرین اور اربابِ سائنس کی جدید تحقیقات و نظریات کو سامنے لا کر دیکھا جائے کہ وحی پر ایمان خلافِ علم و بصیرت تو نہیں؟

ایک بنیادی سوال

سب سے پہلے دیکھنا یہ ہے کہ کیا نوعِ انسانی کے سامنے کوئی سوال (PROBLEM) بھی ہے جسے اس کو بہ حیثیت انسان حل کرنا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ کسی دوسری نوع کے سامنے ایسا کوئی سوال نہیں. سلسلۂ ارتقاء میں انسان سے نچلی کڑی حیوانات کی ہے. ان کی زندگی محض طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے جس کی ضروریات و داعیات کی تسکین ان کا مقصودِ حیات ہے اور ان کی دنیا میں یہ سب کچھ میکانکی طور پر ہوتا رہتا ہے. جب کھانے پینے کو مل گیا (یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ پیش پا افتادہ خطرات سے حفاظت و صیانت کا اطمینان ہو گیا) تو تمام مسائلِ حیات حل ہو گئے. اس کے بعد کوئی پیکان کا دشش نہیں جو اُن کے پیکرِ سکون میں وجۂ اضطراب ہو. کوئی نشترِ تجسّس نہیں جو ان کی رگِ طمانیت کے لئے باعثِ خلش ہو، کوئی اسرار و بواطن نہیں جن کی پردہ کشائی کا "جنون" انہیں حیران و سرگرداں رکھے. کوئی رموز و غوامض نہیں جن کی کنہ و حقیقت سے آگہی کا تقاضا ان پر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر دے. لیکن کیا انسان کی بھی یہی کیفیت ہے؟ کیا اس کے دوائرِ حیات بھی محض کھانے پینے اور سو رہنے تک محدود ہیں[1]؟ اس کا جواب؟ نظر جھکائیے اور اپنے دل سے پوچھئے اور نگاہ اٹھائیے، تو انسانیت کی تاریخ

---

[1] قرآنِ کریم اس نہج زندگی کو کفر (شرفِ انسانیت سے انکار) کی زندگی قرار دیتا ہے.

وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲)

کفر کی زندگی بسر کرنے والوں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ (حظائظِ دنیوی سے) متمتع ہوتے ہیں اور حیوانات کی طرح کھاتے پیتے (اور سو رہتے) ہیں

سے دریافت کیجئے۔ اور پھر دیکھئے کہ عالمِ انفس و آفاق اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی زندگی کا ایک حصہ اسی طرح طبعی قوانین کے تابع ہے جس طرح حیوانات کا۔ اس سطح تک انسان کی زندگی حیوان کی سطح کی زندگی ہے۔ لیکن (جیسا کہ انسان کے عنوان میں لکھا جا چکا ہے) انسان کی زندگی حیوانی سطح پر ہی نہیں، اس سے بلند بھی ہے۔ یہ سطح، انسانی زندگی کی سطح ہے۔ حیوانی سطح تک تو اس کے سامنے بھی کوئی "سوال" نہیں ہوتا۔ لیکن جونہی یہ حیوانی سطح سے اُبھر کر انسانی زندگی میں پہنچتا ہے، اس کی دنیا میں ایک حیرت انگیز انقلاب واقع ہو جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کی تسکین محض "آم کھانے" سے نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اس کے بعد، یہ "پیڑ گننے" کی بھی کوشش کرتا ہے۔ "کیا ہے؟"، "کیوں ہے؟"، "کیسے ہے؟" اور "کیسے ہونا چاہیئے؟" کے معمّے رہ رہ کر اس کے دل میں کھٹک پیدا کرتے ہیں۔ قصۂ آدم پر ایک بار پھر نگاہ ڈالیے۔ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی۔ اس کی ابتدائی زندگی جو ہنوز خلشِ تجسّس سے لذّت آشنا نہ ہوئی تھی اتنی ہی تھی کہ وَ قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ص (۲/۳۵) "اور ہم نے کہا کہ اے آدم! تو اور تیری بیوی اس جنت میں رہو اور اس میں جہاں سے چاہو جی بھر کر کھاؤ پیو۔" گویا اس عہدِ طفولیت میں زندگی کے تقاضے خورد و نوش سے آگے کچھ نہ تھے۔ یہ آدم کے آب و گل کا زمانہ تھا۔ یہ محض گندھا ہوا خمیر تھا جو ہنوز انسانی پیکر میں متشکل نہیں ہوا تھا۔ یہ اس کی آرزوؤں کا بچپن تھا، نہ دل میں کوئی کانٹا تھا، نہ اس کانٹے کی کھٹک۔ نہ درد تھا، نہ درد کی کسک۔ لیکن "عہدِ شباب" میں پہنچ کر بچپن کے کھلونے کس طرح جی بہلا سکتے تھے؟ اب تقاضوں کی دنیا نرالی تھی۔ آرزوؤں کا عالم جدا گانہ تھا۔ اب رہ رہ کر جی چاہتا تھا کہ عروسِ حقیقت بے نقاب سامنے آجائے تاکہ حُسن اپنی انتہائی بے باکیوں اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ ریز ہو۔ آپ نوعِ انسانی کی تاریخ پر نگاہ ڈالیے۔ ہر زمانہ اور ہر ملک میں، انسان کسی لاینحل مسئلہ کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دے گا۔ رموزِ فطرت کی عقدہ کشائیوں میں اُس کے ذہن کی تگ و تاز، امورِ عالم کے سمجھنے اور سلجھانے میں اس کے فکر کی جدّوجہد، ہر شے میں غور و تدبّر، ہر چیز میں تفکّر و تفحّص۔ گاہ اپنے ماحول سے جنگ و پیکار۔ گاہ ستاروں کی دنیا سے چشمک و ستیز۔ کبھی ان سے بھی آگے فضا کی لامحدود پہنائیوں میں کھو جانے کی آرزو۔ کبھی خود اپنے دل کی دنیا میں کسی نامعلوم مدّعا کے حصول کی تڑپ۔ غرضیکہ جہانِ فکر و نظر میں اس کا جہدِ مسلسل اور تب و تابِ پیہم

اس خلش و کاوش کا آئینہ دار ہے جو کسی "سوال" کے حل کے لئے اس کے دل و دماغ کی دنیا میں حشر برپا کئے ہوئے ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ سوال کیا ہے؛ تفصیل اس اجمال کی طویل ہے لیکن اصل حقیقت تک راہنمائی کے لئے قصۂ آدم کے ایک اور لطیف گوشے کی طرف نگاہ اٹھائیے۔

وہ سوال کیا ہے؟

آپ نے غور کیا ہے کہ ابلیس نے کیا کہہ کر آدم کو ورغلایا تھا؟ اُس نے اس کے کان میں کیا سحر پھونکا تھا کہ یہ سب کچھ بھول بھلا کر اس کے پیچھے ہو لیا؟ ظاہر ہے کہ وہ کوئی ایسی ہی بات ہوگی جو اس کے دل کی گہرائیوں میں مچل رہی ہوگی جو اس کی آنکھوں میں انتہائے شوق بن کر آتی اور حسرت بن کر لوٹ جاتی ہوگی! ابلیس نے اس کے اسی وفورِ شوق واضطراب کو بھانپ کر، اس کے اس کمزور پہلو سے فائدہ اٹھایا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ دیا کہ آؤ تم جس چیز کی تلاش میں ہو تمہیں اس کا سراغ بتاؤں۔

انسان کی آرزو کیا تھی؟ ابلیس نے کیا کہہ کر اسے اپنے پیچھے لگا لیا تھا؟ قرآنِ کریم نے اسے دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے۔

قَالَ يَاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ٥ (۲۰/۱۲۰)

(ابلیس نے کہا) اے آدم! کیا میں تجھے ہیشگی کے درخت کا پتہ نشان دوں اور ایک ایسی بادشاہت کا جو فنا پذیر نہ ہو۔

غور فرمایا آپ نے کہ قلبِ انسانی کی یہ آرزو کیا تھی؟ بقائے دوام اور حیاتِ جاوداں!! انسان ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ حیاتِ جاوید کی خواہش اس کے دل کی گہرائیوں میں ہے۔ یہی ہے وہ سوال جو روزِ اوّل سے اس کے سامنے ہے۔ یہی ہے وہ معمہ جس کے حل کی تلاش نے اسے یوں نعل بر آتش بنا رکھا ہے۔

ابلیس کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ عقلِ بے باک کا مظہر ہے اس کے دعوائے انکار کا مدار اس منطقی توجیہہ پر تھا کہ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ٥ (۷/۱۲) "میں آدم سے بہتر ہوں مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے۔" اس لئے میں اسے سجدہ کیوں کروں؟ اور اپنے اس منطقی استدلال کو ایسا حرفِ آخر سمجھ لیا کہ جس نے اِسے آگ سے اور اُسے مٹی سے پیدا کیا تھا اپنے استدلال کے مقابلہ میں اُس کی حکمت کی بھی کوئی حیثیت نہ سمجھی۔ اسی کا

نام عقلِ بے باک ہے۔

انسان کے دل میں حیاتِ جاوید اور بقائے دوام کی خواہش بجا اور درست. لیکن اس کے حصول کا جو ذریعہ عقلِ بے باک نے بتایا وہ یکسر غلط اور گمراہ کن تھا اور اس کا نتیجہ ہبوط و تنزل. اس نے جو کچھ بتایا تھا قرآنِ کریم نے ایک لفظ میں اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا (۲۰/۱۲۱)۔ یعنی اس سے انسان کا جنسی شعور بیدار ہو گیا[1]۔ ابلیس نے اس کے کان میں یہ سحر پھونکا کہ حیاتِ جاوید افزائشِ نسل کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہے. مرنے والا باپ، اپنی زندگی کا تسلسل اپنے بیٹے کے آئینۂ حیات میں دیکھتا ہے وہ خوش خوش مرتا ہے کہ میرا اور میرے خاندان کا نام دنیا میں باقی ہے۔ میرا چراغ روشن ہے. میرے شجرِ زندگی کی شاخ آگے بڑھ رہی ہے. اس سے اسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ میں ہمیشہ زندہ رہوں گا. وہ اس سے حیاتِ جاوید کی خواہش کی تسکین حاصل کر لیتا ہے. لیکن قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ ابلیس کا فریب ہے، یہ عقلِ بے باک کا دھوکا ہے. اسے حیاتِ جاوید سمجھنا ہبوط و تنزل ہے. اگر یہی حیاتِ جاوید ہے تو یہ حیوانات کی ہر اس نوع کو حاصل ہے جس نے ناموافق مادی حالات کا مقابلہ کر کے اپنی نسل کو آگے بڑھانے کی صلاحیت پیدا کر لی (تفصیل انسان کے عنوان میں گزر چکی ہے) گائے، بھینس، بھیڑ، بکری، اونٹ، گھوڑا، اس دنیا میں شاید انسان سے بھی پہلے سے موجود ہیں اور ان کی نسل برابر آگے بڑھتی جا رہی ہے. اس قسم کی حیاتِ جاوید کا تو مطلب یہ ہے کہ انسان اور حیوان میں کچھ فرق ہی نہیں. بلکہ ایک حیثیت سے انسان درجۂ حیوانات سے بھی گر جاتا ہے کیونکہ افزائشِ نسل سے یہ خود اپنے دشمن پیدا کرتا جاتا ہے. ایک فرد دوسرے فرد کی جان کا لاگو. ایک قوم دوسری قوم کے مٹانے کی فکر میں بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶)۔ مختلف افراد میں ایسی (WEDGES) ٹھک جاتی ہیں. (عدو کے یہی معنی ہیں) جن سے ایک فرد دوسرے فرد سے الگ ہو جاتا ہے جس سے انسان کی عالمگیر برادری ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں، نسل کے ذریعے حیاتِ جاوید کے تصور کا مفہوم یہ ہے کہ انسان حیوانی ارتقاء کے میکانکی عمل ہی کی ایک کڑی ہے اور اس کی زندگی فقط طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے لہٰذا اس کے سامنے مسئلہ

---

[1] تفصیل ان امور کی قصۂ آدم میں گزر چکی ہے۔

صرف اس قدر ہے کہ طبیعی حوائج و ضروریات کو کس طرح پورا کیا جائے اور اس میں، دیگر افراد و اقوام سے کس طرح مسابقت و منافست حاصل کی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ عالمِ طبیعیات سے متعلق ہے اس لئے اس کا حل بھی علمِ محسوسات (یعنی دنیائے عقل) کے دائرہ کے اندر ہے۔ لہذا انسانی مسئلہ کو صرف اسی قدر ماننے والے نہ انسانی زندگی کو طبیعی زندگی سے زیادہ کچھ مانتے ہیں اور نہ اس کے لئے عقلِ انسانی کے علاوہ کسی اور روشنی کی راہنمائی کی ضرورت کے قائل ہیں۔ آج کی اصطلاح میں اس روشِ فکر و اسلوبِ حیات کا نام مادہ پرستی سمجھ لیجئے۔ اس کے برعکس خالقِ کائنات نے بتایا کہ یہ تصور غلط ہے۔ انسان کو جو فنا ہو جانے کا خوف اور مٹ جانے کا غم ستا رہا ہے اس کا علاج علمِ محسوسات (عقل) کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کہ انسان، طبیعیات و محسوسات کے ماوراء کچھ اور بھی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ رازِ حیات سے آگاہ ہو۔ یہ حقیقت کا ادراک کرسکے۔ یہ اس عظیم کو سمجھ لے کہ زندگی اپنے طول و عرض دونوں میں ایک غیر منقطع وحدت (INDIVISBLE UNIT) ہے۔ طول میں اس طرح کہ زندگی کی جوئے رواں مرنے کے بعد بھی مسلسل جاری رہتی ہے۔ اور عرض میں اس طرح کہ تمام نوعِ انسانی کی تخلیق اور نشوونما ایک فردِ واحد کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن ان امور کا پالینا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے ایک خارجی روشنی کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح آنکھ کے لئے سورج کی روشنی کی۔ ظاہر ہے کہ یہ نہجِ فکر اس اندازِ نگاہ سے بالکل مختلف ہے جو زندگی کو محض حیوانی سطح پر دیکھتی ہے۔ یہ دونوں اسالیبِ فکر دو الگ الگ بنیادیں ہیں جن پر دو مختلف تہذیبوں کی عمارت اٹھتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی نظامِ فکر و تمدن پر غور کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس اساس و بنیاد کو دیکھا جائے جس پر وہ نظام قائم ہے جو نظام انسان کی طبیعی زندگی ہی کو منتہیٰ و مقصود سمجھے، اُس کے نتائج عالمِ طبیعیات میں کتنے ہی درخشندہ و تابناک کیوں نہ ہوں اس گروہ کے لئے کبھی وجہِ اطمینان نہیں ہوسکتا جو انسان کو اس کے طبیعی پیکر سے کچھ ماوراء بھی سمجھتا ہے۔ اور جس کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی طبیعی اور ماوراء طبیعی دونوں زندگیاں سربلند و شاداب ہونی چاہئیں۔

سوال ہمارے سامنے یہ ہے کہ کیا انسان محض پیکرِ آب و گِل ہی کا نام ہے یا اس سے ماوراء کچھ اور بھی ہے! اور کیا رازِ حیات و ادراکِ حقیقت (یعنی انسان کا اپنی اور کائنات کی

حقیقت کو سمجھ لینا) تنہا عقلِ انسانی کے لئے ممکن ہے۔ آیندہ صفحات میں اسی اجمال کی تفصیل اور اسی سوال کا حل پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔
[آیندہ صفحات میں "رازِ حیات" اور "ادراکِ حقیقت" کی اصطلاحات اسی مفہوم کے لئے استعمال ہوئی ہیں]۔

عِلمُ الاشیا انسان کے شرف و مجد کا راز علم میں ہے۔ لہٰذا علم ہی وہ ذریعہ ہو سکتا ہے جس سے اسے حقیقت کی آگہی حاصل ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسا علم ہے جس سے یہ امکان واقعہ کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ علم کی دنیا پر نگاہ ڈالئے تو سب سے پہلے ہمارے سامنے محسوسات کا علم آتا ہے۔ یہی وہ علم ہے جسے قصہ آدم میں "عَلَّمَ الْاَسْمَآءَ" سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ ذرا آگے چل کر معلوم ہوگا "اسماء" کا لفظ ایسا جامع ہے کہ محسوسات و تصوّرات کی پوری دنیا اس کے اندر سمٹ کر آجاتی ہے۔ محسوسات کی دنیا میں کسی شے کا علم ممکن نہیں جب تک اس کا تصوّر آپ کے ذہن میں نہ آجائے اور کسی چیز کا تصوّر ممکن نہیں جب تک اس کا نام نہ رکھ دیا جائے اس لئے علم الاسماء یا علم الاشیاء درحقیقت تصوّراتی علم (CONCEPTUAL KNOWLEDGE) ہے۔ اس علم سے انسان، کائنات کے محسوس و مرئی پہلو کے متعلق آگہی حاصل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس علم کی دنیا، انسانی حواس (SENSES) کے دائرہ تک محدود ہے۔ یعنی انسانی حواس (SENSES) سے جو معلومات (DATA) ہم پہنچاتی ہیں ان سے اسے اشیائے کائنات کا محسوس علم (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) حاصل ہوتا ہے۔ اور اس کا ذہن[1] اس محسوس علم کے مختلف گوشوں میں باہمی امتزاج سے جو تصوّرات قائم کرتا ہے انہیں (CONCEPTUAL KNOWLEDGE) کہا جاتا ہے۔ انسان کے لئے یہ علم بھی کچھ کم شرف و مزیّت کا موجب نہیں۔ دنیائے طبیعیات (PHYSICAL WORLD) کی تسخیر اسی علم کی بنا پر ہے۔ انسان کو غاروں سے نکال کر آسمان کی وسعتوں میں اذنِ بال کشائی اسی علم نے عطا کیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کو صرف حواس ہی نہیں دیئے گئے بلکہ ان کے ساتھ قوّتِ فکر و تمیز (INTELLECT) بھی ودیعت کی گئی ہے۔

---

[1] اسے (MIND) بھی کہا جا سکتا ہے۔

قوّتِ عقل کا فریضہ تنقید ہے. یعنی اس کی خبر رساں ایجنسیاں جو معلومات بہم پہنچاتی ہیں عقل ان پر تنقید کر کے استدلال کے ذریعے اپنے حدود کے اندر صحیح اور غلط کا موازنہ کرتی ہے. آنکھ دکھاتی ہے کہ چاند میں آدمی بیٹھا ہے. عقل اس "خبر" پر تنقید کرتی ہے اور استدلال کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ اس میں آدمی نہیں ہو سکتا. یہ فریبِ نگاہ ہے.

عقلِ انسانی

یا ہم دُور سے دھواں اٹھتا دیکھتے ہیں، تو عقل فیصلہ کر دیتی ہے کہ نیچے آگ ہے. اس طرح عقل انسانی جزئیات سے استنباطِ نتائج کے بعد کلّیات یا علّت (CAUSE) سے معلول (EFFECT) تک پہنچتی ہے. علم اور اس کے ساتھ عقل کی قوّتِ تنقید، انسان کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے. تجارب و مشاہدات سے اصول متعیّن کرنا، ان اصولوں کی روشنی میں اشیائے کائنات سے کام لینا اور پھر ان سب کے ماحصل کو آگے منتقل کرنا اسی قوّت کے بل بوتے پر ہے. انسان کے پاس اپنے اسلاف کا جس قدر سرمایہ ہے وہ اسی قوّت کی بدولت جمع ہوا. اسی کی وجہ سے محفوظ ہے اور اسی کے ذریعے آگے منتقل ہوتا ہے. اس کے تمدّن و عمرانیت کی متاعِ گراں بہا، قوّتِ عقل و فکر کی بنا پر روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے. فلسفہ، کلام، تاریخ، طبقات الارض، ہیئت، فلکیات، حیاتیات، طبیعیات، مادرا الطبیعیات، علم النفس، معاشیات، سیاستِ مُدن، تدبیرِ منازل غرضیکہ دنیائے محسوسات کے قدیم و جدید علوم و فنون، عقل و بصیرت، فہم و فراست، دانش و بینش، تدبّر و تفکّر اور شعور و ادراک ہی کے کرشمے ہیں. اس لئے قوّتِ عقل کی عظمت سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن عقل کی اس عظمت و

کیا عقل ادراکِ حقیقت کر سکتی ہے؟

تفوّق کے باوجود سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عقل اس حقیقت کا ادراک کر سکتی ہے جس کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا ہے اور جو ہماری اس بحث کا نقطۂ ماسکہ اور مرکزِ ثقل ہے؟ کیا وہ اس سوال کا حل پیش کر سکتی ہے جس نے قلبِ انسان کو طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھا ہے؟

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے. عقل (یا علم استدلالی) کا دائرہ، عالمِ محسوسات ہے. لہٰذا سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ دنیائے طبیعیات (PHYSICAL WORLD) میں، جو محسوسات کی دنیا کا دوسرا نام ہے عقلی اکتشافات کی کیا کیفیت ہے؟ کیا اس دائرہ میں انسانی تحقیقات اشیاء کی حقیقت کا علم حاصل کر سکی ہیں؟ طبیعیات کی دنیا، مادہ (MATTER) سے متعلق ہے. انیسویں صدی عیسوی

کے اخیر تک سائنسدانوں کی دنیا میں عام طور پر سمجھا یہ جاتا تھا کہ یہ کائنات فضا کی پہنائیوں (SPACE) میں ایک بے جان ڈلے کی طرح پڑی ہے اور چند قوانین کی رُو سے جنہیں "اندھی فطرت" بروئے کار لاتی ہے اس میں میکانکی عمل جاری وساری ہے۔ کل تک یہ تحقیق، سائنس کے مسلّمات میں سمجھی جاتی تھی۔ کائنات کے متعلق اس میکانکی تصوّر (MECHANISTIC CONCEPT OF UNIVERSE) کا اثر یورپ کی تمام دنیائے فکر پر چھا رہا تھا۔ [جس کا نتیجہ وہ تمدّن ہے جو آج یورپ اور اس کے ساتھ باقی دنیا کو جہنّم کے عمیق ومہیب گڑھوں کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہا ہے]۔ لیکن بیسویں صدی کے شروع سے، یورپ کی دنیائے سائنس میں ایک عظیم انقلاب کے آثار اُبھرنے شروع ہوئے جس نے چند ہی سال کے عرصہ میں مادیّت (MATERIALISM) اور کائنات کے میکانکی تصوّر کی بنیادوں میں تزلزل پیدا کر دیا۔ سب سے پہلے تحقیقات کا رُخ اس طرف مڑا کہ جس چیز کو ہم ٹھوس اور جامد (SOLID AND INETR) مادّہ کہتے ہیں۔ وہ نہ ٹھوس ہے نہ جامد اور نہ ہی (اپنے اصطلاحی معنوں میں) مادّہ۔ بلکہ وہ برقیات (ELECTRONES) کا مجموعہ ہے جو ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ برق (ELECTRICITY) توانائی (ENERGY) کے سوا اور کچھ نہیں۔ مادّہ کے متعلق اب تحقیق یہ ہے کہ

مادّہ کیا ہے؟

تمام مادّہ توانائی ہی کی ایک شکل ہے۔ درحقیقت کسی شے میں آخر کار انجماد (SOLIDITY) اور مادیّت کا تصوّر ہی غلط ہے جو کچھ موجود ہے محض توانائی ہے۔

(OUTLINES OF MAN'S KNOWLEDGE, P.192)

اس نظریہ کی رُو سے، مادّہ کی دنیا درحقیقت "غیر مادّی" دنیا قرار پا جاتی ہے۔ توانائی مادّہ کی تعریف

۱؎ ہم برق (ELECTRICITY) کا تصوّر صرف برقائی ہوئی اشیاء (ELECTRIFIED OBJECTS) سے کر سکتے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ برقائی ہوئی اشیاء اور ہیں اور خود برق اور برقیات (ELECTRONES) برقائی ہوئی اشیاء (ELECTRIFIED OBJECTS) نہیں بلکہ برق کی مثبت (POSITIVE) اور منفی (NEGATIVE) قوتوں کا کرشمہ ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے مجرّد برق کا تصوّر ممکن نہیں۔

(DEFINITION) میں آتی ہی نہیں. اس لئے اب کائنات کی اصل، مادہ نہیں بلکہ ماورائے مادہ سمجھی جاتی ہے. یہی چیز ہے جس کے متعلق (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) سر جیمس جینز نے اپنی کتاب (THE MYSTERIOUS UNIVERSE) میں کہا ہے کہ کائنات "نور کی سربمہر لہریں ہیں"۔ لیکن اس سے بھی آگے بڑھئے تو حکیم آئن شائن (EINSTEIN) کے نظریۂ اضافیت (RELATIVITY) نے اس تصور میں مزید انقلاب پیدا کر دیا ہے. اس کا نظریۂ زمان و مکان (THEORY OF TIME AND SPACE) ایک بیحد دقیق فنی مسئلہ ہے لیکن اس نظریہ کی رُو سے قائم شدہ تصور کے متعلق رسّل (RUSSELL) کے الفاظ میں اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ

> نظریۂ اضافیت نے زمان کو "زمان ـــ مکان" میں سمو کر، مادیت کے روایتی تصور کو، فلاسفرز کے دلائل سے کہیں زیادہ مجروح کیا ہے. عقلِ عامہ کے نزدیک مادہ وہ ہے جو زمان میں قائم اور مکان میں گردش کرتا ہے. لیکن اضافیت کے قائل (عالِم) طبیعیات کے نزدیک یہ تصور اب باطل ہے. اب مادہ کا ٹکڑا، مختلف خصوصیات کا حامل، ٹھوس ٹکڑا نہیں رہا. بلکہ باہمی مربوط حوادث کا مجموعہ قرار پا گیا ہے۔

(RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM)

یعنی حکیم آئن شائن کی تحقیق کی رُو سے مادّہ کوئی ایسی شے نہیں جو ٹھوس اور جامد وجود رکھتی ہو بلکہ وہ چند مربوط حوادث (INTER-RELATED EVENTS) یا خیالاتِ منجمد (CONDENSED THOUGHTS) کا مجموعہ ہے جس کی اصل، حرکت یا توانائی ہے. لہٰذا

> طبیعی سائنس نے اب تمام اشیاء کو حرکت (MOVEMENT) میں تبدیل کر دیا ہے............ کائنات جو ہمیں اشیاء کا مجموعہ نظر آتی ہے ایک ٹھوس شے نہیں جو فضا میں پڑی ہے. یہ شے (THING) ہے ہی نہیں بلکہ عمل (ACT) ہے یا حوادث

لے یہ کتاب علامہ اقبالؒ کے مشہور لیکچرز کا مجموعہ ہے. آیندہ اوراق میں جہاں جہاں اس کتاب کے حوالہ کی ضرورت ہوگی اختصار کی خاطر ہم اسے صرف "خطبات" کہہ کر پکاریں گے.

(EVENTS) کی عمارت۔ (خطبات؛ صفحہ ۴۹ــ۵۳)

اندازہ فرمائیے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں عالمِ طبیعیات میں کائنات کی اساس و بنیاد کے متعلق کس قدر عظیم الشان تبدیلی واقع ہو چکی ہے. یہ وہ تبدیلی ہے جس سے" سائنس کو اپنی کوتاہیوں کا خود اعتراف ہو گیا ہے."

(BELIEF NAD ACTION, BY VISCOUNT SAMUEL; P-39)

کائنات کا تصوّر اور اس کی وجہ سے اب مادیّت کے بجائے" کائنات کا روحانی تصوّر انسب قرار پا گیا ہے". (ایضاً صٓ۴۰). لہٰذا وہی سائنس جو انیسویں صدی کے اخیر تک، کائنات کے میکانکی تصوّر سے یورپ کی دنیا کو خالص مادیت کی طرف لئے جا رہی تھی، اب اپنی ہی تحقیقات کی رُو سے ماورار المادیّت (یعنی کائنات کے "روحانی تصوّر") کی طرف لئے آ رہی ہے. سچ ہے. بقول بیکن :-

فلسفہ کا تھوڑا سا علم انسان کو دہریہ بنا دیتا ہے. لیکن اس کی گہرائیوں میں اُتر کر انسان (یکسر) مذہب پرست بن کر نکلتا ہے. (SAMUEL; P-41)

اب تحقیق کے ایک دوسرے رُخ کی طرف آیئے. مشہور فلاسفر برکلے (BERKELEY) کا نظریہ تھا کہ جن چیزوں کا علم ہمیں حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے ان کا وجود خارج میں نہیں ہوتا. وہ ہمارے ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں. مثلاً ایک پھول آپ کو سُرخ نظر آ رہا ہے. تو اس کی یہ سُرخی پھول کے اندر موجود نہیں ہوتی، بلکہ روشنی کی لہریں، دیکھنے والے کے دماغ پر ایسا اثر مرتب کرتی ہیں جس سے اسے سُرخ رنگت کا احساس ہوتا ہے (ہمارے زمانہ میں پروفیسر WHITE HEAD نے اس نظریہ کو مزید دلائل سے مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے) اس سے ظاہر ہے کہ حواس کے ذریعے اشیار کا جو علم ہمیں حاصل ہوتا ہے وہ درحقیقت" فریب نگاہ" ہے. اس حسین فریب کے متعلق پروفیسر (EDDINGTON)

لہ اس کتاب سے ماخوذ اکثر اقتباسات آیندہ اوراق میں ملیں گے جہاں اس کتاب کا ذکر صرف SAMUEL کے نام سے کیا جائے گا.

نے اپنے مختصر لیکن نہایت جامع لیکچر (SCIENCE AND THE UN-SEEN WORLD) میں بڑے دل کش انداز میں بحث کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہم سب اس فریب میں مبتلا ہیں کہ نفسِ انسان کی گہرائیوں تک پہنچنا تو خیر ناممکن ہے لیکن مادہ کی حقیقت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ مادہ کی حقیقت کا علم ہمیں کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ یہی ہوتا ہے نا، کہ مادی شے سے کوئی اثر (INFLUENCE) باہر آتا ہے اور ہمارے نظامِ عصبی کے کسی انتہائی کنارہ سے ٹکراتا ہے اس سے ہمارے اندر کچھ طبیعیاتی اور کیمیائی

حقیقتِ اشیاء

(PHYSICAL AND CHEMICAL) تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں جو اعصاب کے تاروں سے دماغ تک پہنچتی ہیں۔ وہاں پہنچنے پر ایک معمّہ (MYSTERY) ظہور میں آتا ہے۔ یعنی انسان کے دل (MIND) میں ایک خیالی تصوّر (IMAGE) یا سنسنی کی کیفیت (SENSATION) پیدا ہوتی ہے جو اس تحریک یا ہیجان سے مختلف ہوتی ہے جو اعصاب میں ہوئی تھی۔ یعنی اعصاب نے اس شے کا اثر کچھ اور لیا تھا اور دل میں اس کا اثر کچھ اور پیدا ہوا۔ اس اثر سے جو نتیجہ حاصل کیا جاتا ہے وہی اس شے کا علم کہلاتا ہے۔ اس علم کے متعلق جو جی میں آئے کہیئے۔ لیکن اتنا تو بدیہی ہے کہ یہ علم بہرحال شئے متعلقہ کی اصل وحقیقت کا علم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اس شے کی اصل وحقیقت اعصاب کے تاروں کے ذریعے ذہنِ انسانی تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ اعصاب کے ذریعے صرف وہ اثرات منتقل ہوتے ہیں جو انہوں نے اخذ کئے تھے۔ ان اثرات سے ہم ایک نتیجہ مستنبط کر لیتے ہیں۔ لہٰذا یہ استنباطی یا استخراجی علم (INFERRED KNOWLEDGE) مادہ کے پیکر کا عکس ہوتا ہے نہ کہ اس کی حقیقت۔ یہی وجہ ہے کہ مادّی اشیاء سے متعلقہ علم کو محض رموز و اشارات (SYMBOLS) کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اشارات اسی صورت میں استعمال کئے جاتے ہیں جب کسی شے کی حقیقت کا علم نہ ہو جیسے الجبرا میں (x) کی علامت ایک نامعلوم مقدار (UN-KNOWN QUANTITY) کی قائم مقام ہوتی ہے۔ ذہنِ انسانی ان اشارات کو اخذ کرتا رہتا ہے۔ ایک ہی قسم کے اشارات کو بار بار اخذ کرنے سے ان سے مرتب شدہ عکس پختہ ہو جاتا ہے لیکن اس عکس کو اصل شئے کی حقیقت

لہ ترجمہ کے بجائے مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان اشارات سے ہم حقیقت کا علم نہیں حاصل کر سکتے۔ جس طرح محطۂ نشر الصوت (BRODCASTING STATION) سے نشر شدہ آوازوں سے ہم براڈ کاسٹنگ اسٹیشن کی حقیقت کا علم حاصل نہیں کر سکتے۔ آج آپ اگر کسی عالم طبیعیات سے پوچھیں کہ اس نے ایتھر (ETHER) یا برقیہ (ELECTRON) کے متعلق بالآخر کیا تحقیق کیا ہے تو اس کا جواب ایسا نہیں ہوگا جیسے کسی میز یا کرسی کے متعلق کچھ بتا دیا جائے بلکہ وہ چند اشارات (SYMBOLS) اور ریاضی کی چند مساوات (EQUATIONS) گنا دے گا۔ اب اگر اس سے پوچھا جائے کہ یہ اشارات کیا بلا ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ملے گا کہ علمِ طبیعیات کو اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس علم کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے یہ اشارات کے پیچھے اصلِ حقیقت کی گہرائی تک اُتر سکے۔ دنیائے طبیعیات کے متعلق ان اشارات اور مساوات ہی کا علم حاصل ہو سکتا ہے نہ کہ اس فطرت کا جس کے مظہر یہ اشارات ہیں۔"

(SCIENCE AND THE UN-SEEN WORLD; CHAPTER-III)

ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ عقل (علم استدلالی) کے ذریعے (غیر مرئی و غیر محسوس دنیا تو ایک طرف) خود محسوسات کی دنیا میں حقیقت کا علم کس قدر حاصل ہو سکتا ہے اور سائنس اپنے نتائج مستخرجہ کے متعلق حتمی اور یقینی طور پر کیا کہہ سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ خود یورپ کے جلیل القدر محققین اب رفتہ رفتہ اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ علمِ محسوسات کے ذریعہ ادراکِ حقیقت ممکن نہیں۔ سر جیمس جینز کائنات کے مسئلہ پر نہایت عالمانہ بحث کرنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ

> جو کچھ کہا گیا ہے اور جو نتائج تجربتاً پیش کئے گئے ہیں سچ تو یہ ہے کہ وہ تمام محض قیاسی اور غیر یقینی ہیں۔ ہم نے اس مسئلہ پر بحث کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیا عہدِ حاضر کی سائنس ان مشکل مسائل کے متعلق جو ہمیشہ کے لئے ماورائے سرحدِ ادراک رکھے گئے ہیں کچھ کہہ سکتی ہے؟
>
> ہم زیادہ سے زیادہ روشنی کی ایک مدھم کرن دیکھ پائے ہیں۔ اس سے زیادہ ہم کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ کرن بھی فریبِ نگاہ ہی ہو اس لئے کہ

اس باب میں ہمیں کچھ دیکھنے کے لئے اپنی آنکھوں پر بہت بوجھ ڈالنا پڑا ہے۔ سوآج یہ دعوئے قطعاً نہیں ہو سکتا کہ دورِ حاضرہ کی سائنس کوئی (یقینی) اعلان کر سکتی ہے بلکہ انسب یہ ہے کہ سائنس کو چاہیئے کہ اس قسم کے اعلان کرنا چھوڑ دے۔ علم کے دریا کا رُخ اکثر اوقات پیچھے طرف مُڑتے بھی دیکھا گیا ہے۔

(THE MYSTERIOUS UNIVERSE)

ریڈنگ یونیورسٹی کا طبیعیات کا پروفیسر ڈاکٹر جیمس آرنلڈ کروتھر لکھتا ہے:

نظامِ فطرت اپنی گہری بنیادی سادگی میں اس قدر تحیّر انگیز ہے کہ دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر آخری انسان کے لئے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ (THE GREAT DESIGN P; -52)

اسی کتاب میں علم الافلاک کا ماہر کیلیفورنیا کی رصدگاہ کا ڈائریکٹر ڈاکٹر ایڈمن، ستاروں کی دنیا کی کرشمہ سازیوں سے متحیّر ہو کر لکھتا ہے۔

"کائنات کی ابتدا اور اس کی انتہا کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔" (ایضاً ص ۳۵)

سرفرانسس ینگ ہسبنڈ اپنے مقالہ میں لکھتا ہے۔

ہم سائنس سے جو کچھ معلوم کر سکتے ہیں وہ اتنا ہی ہے کہ علم کا سمندر بے کنار ہے۔ ہم یہی معلوم کر سکتے ہیں کہ ہم فطرت کے متعلق کبھی بھی سب کچھ نہیں جان سکتے۔ (صفحہ ۲۵۴)

یہ تو تھے علمائے طبیعیات، اب ایک عالمِ تاریخ کی زبان سے سنئے۔ پروفیسر (ALFRED COBBAN نے (۱۹۴۲ء میں) تہذیبِ مغرب کی شکست و ریخت پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے ان تمام عناصر سے بحث کی تھی جو اس تہذیب کے اجزاء ہیں اور اس کے بعد بتایا تھا کہ اس تہذیب کی تعمیر میں کس طرح خرابی کی صورت مضمر تھی۔ دنیائے سائنس پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے۔

ہم کبھی یہ تصور نہیں کر سکتے کہ (اور تو اور) سائنس کی محدود دنیا میں بھی قطعی حقیقت کا ادراک کر لیا گیا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا جب تک اس تمام محسوس کائنات کا علم حاصل نہ ہو جائے۔

(THE CRISIS OF CIVILISATION; PP 94-95)

عقل (REASON) کے متعلق پروفیسر صاحب کا بیان یہ ہے کہ

گذشتہ کچھ عرصہ سے عقل (REASON) کچھ ایسی راندۂ درگاہ ہوئی ہے کہ اب اسے چند فریب خوردہ مادرار طبیعی لوگوں کی متروک توہم پرستی خیال کیا جاتا ہے۔ (ایضاً ص۱۳)

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

عہدِ حاضر کا سب سے بڑا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ اب چاروں طرف سے عقل اور عقل پرستی پر حملے ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ سائنس نے خود عقل کے قلعہ پر دھاوا بول دیا ہے۔ جدید ریاضیات کے انکشاف نے کائنات کے معمّہ کو پھر سے اجاگر کر دیا ہے......

علاوہ بریں علم النفس کے ماہرین نے دنیا کے علم میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے جس کی رُو سے عقل کو اب نفسِ انسانی کی کائنات میں، وحید تو ایک طرف، کوئی ممتاز مقام بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ قانونِ عقل پر سب سے آخری اور کاری ضرب علم تصوّرات (IDEOLOGY) کے تجزیہ نے لگائی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر (KARL MANNHEIM) نے ثابت کیا ہے، مفکّرینِ دورِ حاضرہ اب رفتہ رفتہ اس حقیقت سے آشنا ہو رہے ہیں کہ تصوّرات (IDEAS) کو اس معاشرتی اور تاریخی پس منظر سے کبھی الگ نہیں کیا جا سکتا جن میں وہ موجود ہیں۔ (ایضاً ص۱۰)

یہ ہے اس عقل کی حقیقت جس کی ابھی چار دن پہلے یورپ میں پرستش ہو رہی تھی جس سے مرعوب ہو کر مشرق کا ذہنی غلام کسی مادرار عقل نظریہ کو اربابِ دانش و بینش کے سامنے پیش کرنے (یا اس پر ایمان کے اظہار) سے شرماتا تھا! آج انہی پرستاروں نے خود اپنے ہاتھوں اس بُت کے ٹکڑے کر دیئے ہیں لیکن ہماری غلامانہ ذہنیت کی یہ کیفیت ہے کہ ان پریشان ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے اکٹھا کرتے پھر رہے ہیں تاکہ انہیں جوڑ کر اس بُت کو پھر سے کعبۂ دل میں بٹھا لیں! سچ ہے:

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے

یہ ہے عقل کی محدودیت۔ لہٰذا جس طرح حدِ نگاہ سے آگے آنکھوں والا اور اندھا دونوں برابر ہوتے ہیں، سرحدِ عقل سے آگے عقلمند اور بے عقل، دونوں یکساں ہوتے ہیں۔

اس مقام پر اس حقیقت کا بیان کر دینا ضروری ہے کہ جو کچھ عقل (یا علم استدلالی) کے متعلق

اوپر لکھا گیا ہے اس سے عقل کی تنقیص یا تحقیر مقصود نہیں ہے۔ اس سے مفہوم صرف اتنا ہے کہ عقل کا دائرہ اپنا ہے اور ادراکِ حقیقت اس کے بس کی چیز نہیں۔ نیز یہ کہ دنیائے طبیعیات میں جو کچھ ابھی کل تک عین مطابقِ عقل سمجھا جاتا تھا آج کی عقل خود اس کی تغلیط کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں، عقل کا مدار کُلی اس علم پر ہے جو حواس کے ذریعے مرتب ہوتا ہے اور حواس اولتے بدلتے رہتے ہیں اس لئے اس بنیاد پر استوار عمارت بھی غیر متبدل نہیں ہو سکتی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں،

فروغِ دانشِ ما از قیاس است　　　قیاسِ ما ز تقدیرِ حواس است
چو حِس دیگر شد ایں عالم دگر شد　　　سکون و سیر و کیف و کم دگر شد

خلافِ عقل کا مفہوم

یہیں سے ہم ضمناً اس سوال تک بھی پہنچ جاتے ہیں کہ جس چیز کو عام طور پر "خلافِ عقل" کہا جاتا ہے اس سے مراد کیا ہوتی ہے۔

سب سے پہلے ایک فرد کی عقل کو لیجئے۔ بچپن میں اس کی عقل کچھ اور ہے۔ جوانی کے عالم میں کچھ اور۔ ایامِ پختگی میں اس سے الگ اور بڑھاپے میں ان سب سے جدا۔ جس بات کو ایک شخص بچپن میں عین مطابقِ عقل خیال کرتا ہے، دس برس بعد ان کھلونوں پر خود ہی ہنستا ہے۔ جن نظریاتِ زندگی کو وہ عالمِ شباب میں عین تقاضائے عقل خیال کرتا ہے، ذرا پختگی کو پہنچ کر ان پر خود ہی نادم ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں پہنچ کر کیفیت ہی بدل جاتی ہے وہ ساری دنیا کو بے عقل سمجھتا ہے اور دنیا خود اس پر ہنستی ہے۔

وَ مَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۭ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ۝ (۳۶/۶۸)

جسے ہم طویل عمر دیتے ہیں اسے نگونسار کر دیا کرتے ہیں۔ کیا یہ لوگ پھر بھی نہیں سمجھتے؟

ایک طرف زمانہ کے امیال و عواطف بدل چکے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف اس کی قوتِ حافظہ کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے سے جانتا ہے اسے بھی بھول چکتا ہے۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ڐ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ (۱۶/۷۰ نیز ۲۲/۵)

اور اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر وہی ہے جو تمہاری زندگی پوری کر دیتا ہے۔ اور تم میں سے

کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو (بڑھاپے کی) نکمّی عمر تک پہنچ جاتا ہے کہ (ذہن و عقل کی)
سمجھ بوجھ رکھنے کے بعد پھر ناداں ہو جائے۔ بیشک اللہ (سب کچھ) جاننے والا' ہر بات
کی قدرت رکھنے والا ہے!

ان حالات میں کہیئے کہ جب کوئی شخص کسی چیز کے متعلق کہتا ہے کہ یہ خلافِ عقل ہے تو اس سے کیا سمجھا جائے؟ یہ تو "خلافِ عقل" کا سوال ہے۔ جس چیز کو وہ آج عین مطابقِ عقل کہتا ہے کل ہی اسے خلافِ عقل کہنے لگ جائے گا۔ پھر ایک شخص کی عمر کے مختلف ادوار کو چھوڑ کر ایک ہی عمر کے مختلف افراد کو دیکھئے۔ ان کی عقلوں کا تفاوت اس قدر بیّن ہوتا ہے کہ جو چیز ایک شخص کے نزدیک عین مطابقِ عقل ہے اسے دوسرا شخص سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا۔ پھر افراد کو چھوڑ کر زمانہ کی عقل کو لیجئے جس چیز کو ابھی پچاس برس پہلے　خلافِ عقل کہا جاتا تھا، وہ آج عین مطابقِ عقل ہے۔ اگر کسی سے بیس تیس برس ادھر کہا جاتا کہ ایک آدمی لندن کے کسی گوشے میں بات کرے تو دنیا کے کونے کونے میں بیک وقت پہنچ جاتی ہے تو وہ اُسے پاگل خانے بھجوانے کی کوشش کرتا لیکن آج یہی "خلافِ عقل" بات ہر شخص کے مشاہدہ کی چیز ہے۔ لہٰذا جس چیز کو ہم آج خلافِ عقل کہتے ہیں' اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ فی الواقعہ عقل کے خلاف ہے؟ خود مادہ اور دنیائے طبیعیات کے متعلق سائنس کی تحقیقات کے اختلاف (اور وہ بھی صدیوں میں نہیں بلکہ چند سال کے عرصہ میں) گذشتہ صفحات میں ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ ایسے اختلاف جو فرعی اور جزعی نہیں بلکہ اصولی اور کلّی ہیں۔

کہیئے کہ جو چیز یوں ادلنے بدلنے والی ہو' اسے ادراکِ حقائق کا قابلِ اعتماد ذریعہ کیسے قرار دیا جاسکے؟

لہٰذا عقل و فکر کو چھوڑ کر کسی بات کو اندھا دُھند مان لینا خلافِ شرفِ انسانیت ہے تو کسی بات سے محض اس لئے انکار کر دینا کہ وہ میری یا میرے زمانہ کی عقل کے خلاف ہے یہ بھی انتہائی حماقت اور ضد ہے۔ قرآنِ کریم نے سورۂ یونسؑ کی دو جلیل القدر آیات میں ان دونوں گروہوں کا ذکر نہایت دل آویز اور بصیرت افروز انداز میں فرمایا ہے۔ پہلے اس گروہ کا ذکر کیا جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتا اور محض ظنّ و تخمین کی اتباع کرتا ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۚ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ

الْحَقِّ شَيْئًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ○ (۱۰/۳۶)

اور ان لوگوں میں زیادہ تر ایسے ہی ہیں جو صرف وہم و گمان کی باتوں پر چلتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ حق کے مقابلے میں ظنّ و گمان کچھ کام نہیں دے سکتا۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس سے بے خبر نہیں۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو حقیقت سے محض اس لئے انکار کر دیتا ہے کہ وہ اس کی عقل کے خلاف ہے اور اس کے اپنے احاطۂ علم میں نہیں آ سکتی۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ○ (۱۰/۳۹)

نہیں، یہ بات نہیں ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے، اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے۔ ٹھیک اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔ تو دیکھو ظلم کرنے والوں کا کیسا کچھ انجام ہو چکا ہے۔

غور سے دیکھئے تو انکارِ وجود کے جس قدر گوشے نظر آئیں گے وہ ان ہی دو کیفیتوں کے مظہر ہوں گے۔ صحیح روش یہ ہے کہ ظنّ و تخمین پر بھروسہ کرنے والوں کو چاہیئے کہ فکر و نظر سے کام لیں اور تنہا اپنی عقل پر بھروسہ کرنے والوں کو چاہیئے کہ عقل کی محدودیت کو بھی پیشِ نظر رکھیں۔

گذشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آ گئی کہ سائنس (یا علمِ محسوسات) کی رُو سے کلّی حقیقت کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ (J.W.N. SULLIVAN) اپنی کتاب (LIMITATIONS OF SCIENCE) میں لکھتا ہے:

سائنس کو اب اپنے متعلق احساس ہو گیا ہے، اس لئے اب اس میں فروتنی اور انکسار بھی آ گیا ہے۔ اب ہمیں یہ نہیں پڑھایا جاتا کہ حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لئے سائنس کا طریقہ ہی واحد طریقہ ہے (واحد طریقہ تو ایک طرف) اب تو دنیائے سائنس کے مشاہیر

اس امر پر مصر ہیں اور بڑی شدت سے مُصر کہ جہاں تک ادراکِ حقیقت کا تعلق ہے،
سائنس صرف جزوی سا علم بہم پہنچا سکتی ہے۔

○

دنیائے معاملات اور عقل

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اور تو اور خود عالمِ طبیعیات میں بھی حقیقت کا ادراک عقل کے بس کی چیز نہیں[1]۔ اب سائنس اور فلسفہ کی دنیا سے نیچے اُتر کر معاملات کی دنیا میں آیئے اور دیکھئے کہ کیا اس دنیا میں بھی عقل، انسانی راہ نمائی کے لئے کافی ہو سکتی ہے، ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ وہی نظام انسانی ذات کے داعیات و مقتضیات کی تسکین کر سکتا ہے جو حقیقت پر مبنی ہو۔ اور چونکہ عقل، ادراکِ حقیقت نہیں کر سکتی اس لئے یہ ظاہر ہے کہ عقل کی رُو سے وضع و متشکل کردہ نظام، انسانی معاملات کی دنیا میں کبھی فلاح و سعادت کے نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ اس باب میں عقل کی ناقصیت فقط اتنی ہی نہیں کہ اس کا دائرہ محدود ہے۔ بلکہ اس کی کمزوری اس سے بھی کہیں گہری ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان پتھر نہیں، اس کے سینے میں جذبات کا ایک طوفان ہے جو ہر وقت متلاطم رہتا ہے۔ جذبات اور عقل کی کشمکش ایسی اور بدیہی ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ جب جذبات (مثلاً غصہ، حسد، انتقام یا دوسری طرف جذبۂ محبت) انسان پر غالب آجاتے ہیں تو وہ، وہ کر بیٹھتا ہے جس پر طوفانِ جذبات کے فرد ہونے پر خود ہی نادم ہوتا ہے اور اتنا نقصان اٹھاتا ہے کہ بعض اوقات اس کا عمر بھر افسوس رہتا ہے حتّٰی کہ

---

[1] یہ ہو سکتا ہے کہ سائنس کی تحقیقات اسی طرح آگے بڑھتی رہیں تو انسانی علم کم از کم دنیائے طبیعیات میں کسی یقینی مقام تک پہنچ جائے۔ لیکن یہ صرف حقیقت کے ایک گوشہ (ASPECT) کی جھلک ہوگی پھر اس چیز کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ یہ نہیں کہ اگر حقیقت کے مختلف پہلوؤں (ASPECTS) کو یک جا کر دیا جائے تو ان کا مجموعہ حقیقتِ کُلّی بن سکتا ہے۔ حقیقتِ کُلّی اور شے ہے اور اس کے مختلف پہلو اور۔ آپ ایک شخص کے مختلف عادات و خصائل کا علم حاصل کر لینے کے بعد یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے اس کی ذات (PERSONALITY) کا بھی علم حاصل کر لیا ہے۔ عادات و خصائل (صفات) اس کی ذات کا پرتو ضرور ہیں۔ لیکن ان پرچھائیوں کا مجموعہ اصل ذات نہیں ہو سکتا۔

بعض مقامات پر انسان جذبات سے مغلوب ہو کر جان تک پر کھیل جاتا ہے۔ ایک بیمار جانتا ہے کہ فلاں چیز کھانے سے مرض بڑھ جائے گا۔ لیکن جاننے کے باوجود اسے کھالیتا ہے اس کی سزا بھگتتا ہے۔ ایک شخص جانتا ہے کہ قتل کی سزا موت ہے۔ لیکن جوشِ انتقام میں اندھا ہو جاتا ہے اور پھانسی کے تختے پر لٹک جاتا ہے۔ یہاں تک تو بدیہات کی حدیں تھیں جن کے اندر ہم محسوس کر لیتے ہیں کہ فلاں عمل جذبات کے ماتحت سرزد ہوا ہے اور فلاں تقاضائے عقل سے۔ لیکن قیامت تو اس سے آگے بڑھ کر شروع ہوتی ہے۔ جہاں عقلِ حیلہ جو، خود جذبات سے متاثر ہو کر انسان کو ناصحِ مشفق کے نقاب میں فریب دیتی ہے۔ اس باب میں علمِ تجزیۂ نفس (PSYCHO ANALYSIS) نے ایک حد تک ان حقیقتوں کا انکشاف کیا ہے جو اس سے پیشتر پردۂ شہود پر نہ آئی تھیں (ہر چند یہ فن ابھی اپنے عہدِ طفولیت میں ہے لیکن بایں ہمہ اس نے نفسیاتی دنیا میں فی الواقعہ ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے) یعنی ہوتا یہ ہے کہ انسانی خواہش کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ عقل اس کے جواز کے لئے منطقی توجیہات تراشتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ایسے ایسے دلائل پیش کرتی ہے کہ یہ سب کچھ عین مطابقِ عقل معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ یکسر جذبات کے داعیات پر مبنی ہوتا ہے۔

فریبِ کشمکشِ عقل دیدنی دارد
کہ میرِ قافلہ و ذوقِ رہزنی دارد

کہیئے کہ تنہا عقل کی راہنمائی انسان کو ہلاکت و بربادی کے کس جہنم کی طرف لے جائے گی؛ فلسفۂ قدیم و جدید دونوں اس حقیقت پر متفق ہیں کہ ہماری سعی و عمل کے محرکات ہمارے جذبات ہوتے ہیں۔ ارسطو کے الفاظ میں "عقل ہماری کسی قوت کو متحرک نہیں کر سکتی" اس لئے

> ہر عمل جو ارادۃً سرزد ہو بظاہر کتنا ہی معقول (مبنی بر عقل) کیوں نہ نظر آئے، درحقیقت ہمارے "مفاد" پر مبنی ہوتا ہے اور مفاد کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد جذبات پر ہو.... قوتِ ارادی کو آمادہ بہ عمل کرنے کے لئے مفاد کا احساس نہایت ضروری ہے۔ اس کے سوا اس کے لئے اور کوئی جذبہ محرک نہیں ہو سکتا۔

(MYSTICISM BY EVELYN UNDERHILL)

ڈاکٹر جوڈ اپنی کتاب (GUIDE TO MODERN THOUGHT) میں رقمطراز ہے۔

> عقل درحقیقت ہماری خواہشات کی لونڈی ہے۔اس کا کام یہ ہے کہ ہم جن مقاصد کو غیر شعوری طور پر حاصل کرنے کی خواہش کریں ان کے حصول کے لئے ذرائع بہم پہنچادے اور جو کچھ ہم کرنا چاہیں اس کے جواز کے لئے دلائل تلاش کرکے مہیا کردے!

دنیا میں آج جس قدر فتنہ وفساد برپا ہے محض اس لئے ہے کہ ہر شخص اور ہر گروہ اپنے جذبات کی تسکین اور اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے. عقل کی ہنرمندی ان جذبات وخواہشات کی تکمیل کے لئے ذرائع بہم پہنچاتی ہے. اب مختلف عقول کی جنگ (BATTLE OF WITS) شروع ہوجاتی ہے. ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ دوسرے کو بیوقوف بناکر اپنا اُلو سیدھا کرے. دوکاندار اس کوشش میں ہوتا ہے کہ اپنی عقل کے زور پر گاہک کو بیوقوف بناکر روپیہ کی چیز سوا میں بیچے. اور گاہک اس کوشش میں کہ اپنی عقل کے زور پر دوکاندار کو بے وقوف بناکر بارہ آنے میں خرید لائے. یہ چھوٹے پیمانے پر ہے. بڑے پیمانے پر سلطنتوں اور مملکتوں کے معاملات اسی نہج پر طے پاتے ہیں. عقل پرستوں کی ساری سیاست کامدار انہی حیلہ کاریوں پر ہے. بعضکم لبعض عدو.

قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

جس کی عقل غالب آجائے، وہی کامیاب وکامران؛ اس کے سامنے سب قوانین ودساتیر، اصول ومسلّمات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں. دنیا میں یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ آج ہورہا ہے.

وانہ ایں می کار د آں حاصل برد	اُمّتے بر اُمّتے دیگر چرد
ازضعیفاں ناں ربودن حکمت است	ازتن شاں جاں ربودن حکمت است
شیوۂ تہذیبِ نوآدم دری است	پردۂ آدم دری سوداگری است

یہی وجہ ہے کہ جو شخص اپنے جذبات کی تسکین ہی کو مقصدِ زندگی سمجھتا ہے علم وعقل کے باوجود فلاح وسعادت کی راہ سے محروم رہتا ہے. اس لئے کہ اس کا علم اور اس کی عقل اس کی صحیح راہ نمائی کے بجائے اس کی خواہشات کی تکمیل کے اسباب وذرائع بہم پہنچاتے ہیں. اسی لئے قرآن کریم نے علم وعقل کی اہمیت پر زور دینے کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی بے نقاب کردیا کہ جب "عقل" جذبات کے تابع ہوکر چلے تو انسان سعادت کی راہ نہیں پاسکتا. ارشاد ہے.

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ .... اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ (۴۵/۲۳)

(کیا) تم نے ایسے لوگوں کی حالت پر غور کیا جنہوں نے اپنے جذبات ہی کو اپنا خدا بنا رکھا ہے؟ چنانچہ (ایسے شخص کی اس بے راہ روی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ) اس کے علم (وعقل) کے باوجود خدا کا قانون صحیح راستے کو اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ اس کے کانوں پر اور دل پر مہریں لگ جاتی ہیں اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ خدا کے قانون کی رُو سے جس شخص کی حالت یہ ہو جائے اسے کون صحیح راستے پر لا سکتا ہے۔ کیا تم لوگ ایسی کھلی کھلی باتوں کے بعد بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے؟

سماعت و بصارت و قلب یہی تو ذرائع علم تھے۔ لیکن جب عقل و علم، جذبات و خواہشات کے تابع ہو جائیں تو کانوں اور آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور دل غلافوں میں لپٹ جاتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے کہہ دیا کہ العلم کے لئے (یعنی علمِ حقیقی) جس کی تفصیل چند قدم آگے چل کر آئے گی) کسی کے جذبات کا اتباع جائز نہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝ (۱۳/۳۷)

اور اسی طرح ہم نے اسے (یعنی قرآن کو) بالکل واضح انداز میں اتارا اگر حصولِ علم کے بعد تو نے ان لوگوں کے جذبات کی پیروی کی۔ تو سمجھ لے کہ پھر اللہ کے مقابلہ میں نہ تو تیرا کوئی کارساز ہوگا نہ بچانے والا۔

انسانی جذبات، راستہ کے پُرفریب مناظر رنگ و بو میں اُلجھ کر رہ جانا چاہتے ہیں۔ لیکن جس کی نگاہوں کے سامنے حقیقت کی روشنی ہو، وہ منزل کی سوچتا ہے۔ خواہ وہ منزل دُور اور راستہ پُرخطر ہی کیوں نہ ہو۔ قصہ قارون کے ضمن میں فرمایا؛

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ...... وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝ (۲۸/۷۹-۸۰)

چنانچہ (جب ایسا ہوا کہ) قارون اپنی قوم کے سامنے اپنی آرائش (اور ساز و سامان) کے ساتھ نکلا تو جو لوگ صرف حیاتِ دنیوی (اور اس کے ساز و سامان) ہی کے طالب تھے وہ

کہنے لگے "اے کاش ہمارے پاس بھی یہی (عیش و عشرت کے) سامان (اور اسباب تنعّم) ہوتے جو قارون کو دیئے گئے ہیں۔ بلاشبہ وہ بڑا ہی نصیبہ ور ہے" مگر ان لوگوں نے جو علم کی روشنی رکھتے تھے (ان کی یہ باتیں سُن کر) یہی کہا۔ تمہارا ناس ہو' جو حصّہ خدا کے قانون کے مطابق (دنیا اور آخرت میں ملتا ہے وہی) ان لوگوں کے لئے بہترین چیز ہے جو ایمان لے آئے ہوں اور (ساتھ ہی) نیکوکار (بھی) ہوں۔ مگر وہ حصّہ صرف انہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو اپنے پروگرام پر استقامت کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مفادِ عاجلہ ہی کو اصلِ حیات سمجھنے والوں (اور یوں اپنے جذبات کی تسکین میں کامیابی محسوس کرنے والوں) کا علم جذبات کی چار دیواری میں سمٹ کر رہ جاتا ہے اور اس کی نگاہوں کو محمل حقیقت تک نہیں پہنچنے دیتا۔

وَ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ..... وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ۝ (۵۳/۳۰-۲۸)

اور انہیں اس کے متعلق کچھ بھی علم نہیں ہے۔ وہ لوگ محض ظنّ و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور (ظاہر ہے کہ) حقیقت کے متعلق یہ ظنّ و تخمین ذرا بھی فائدہ نہیں دے سکتے۔ تو (اے پیغمبرِ اسلام!) جو لوگ ہمارے ذکر (کو سننے اور اس پر کاربند ہونے) سے اعراض اور رُوگردانی کا معاملہ کریں اور صرف دنیوی زندگی ہی کے طلب گار ہوں تو تم بھی ان سے اعراض کرو۔ (اور ان کی مطلق پرواہ نہ کرو) اُن (بدنصیبوں) کا مبلغ علم اتنا ہی ہے (وہ اپنی قبولِ حق کی صلاحیت کو کھو چکے ہیں اور اس کے علاوہ اب کچھ نہیں کر سکتے)۔ یقیناً جو لوگ خدا کے راستہ سے گم ہو گئے ہیں تمہارا پروردگار انہیں خوب جانتا ہے۔ اور وہ انہیں بھی خوب جانتا ہے جو (حقیقت کا راستہ) پا گئے ہیں۔

رفتہ رفتہ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اس کی عقل یکسر جذبات کے تابع ہو جاتی ہے اور وہ غلط راستے پر چلنے کے باوجود سمجھتا یہ ہے کہ بالکل راہِ راست پر ہوں۔ یہ شقاوتِ انسانی کی آخری حد ہے۔

وَ مَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ وَ اِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (۴۳/۳۷-۳۶)

اور جو لوگ خدائے رحمٰن کے ذکر (نصیحت و احکامِ الٰہی سے) مُنہ موڑ لیتے ہیں ہم ان کے لئے ایک شیطان مقرّر کر دیتے ہیں (جو ان پر مسلّط ہو جاتا ہے) بس! پھر وہی ان کا ساتھی (اور ہم نشین ہوتا ہے۔ اور (دیکھو) پھر (ایسا ہوتا ہے کہ) یہی لوگ خود افرادِ نسلِ انسانی کو (حقیقت کے) راستہ سے روکنے لگتے ہیں (اور خود ہی ایک دوسرے کے لئے شیطان بن جاتے ہیں) اور یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ وہ صحیح راستہ پر چل رہے ہیں.

یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق فرمایا کہ باوجود آنکھیں رکھنے کے انسان اندھا ہو جاتا ہے. سب کچھ دیکھتا بھالتا ہے لیکن تباہی کے جہنّم کی طرف چلا جاتا ہے۔ اقوامِ سابقہ کے قصص کے سلسلہ میں فرمایا.

وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاْ وَ قَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ۝ (۲۹/۳۸)

اور (دیکھو) ہم نے عاد و ثمود (جیسی زبردست قوموں) کو بھی تباہ و برباد کر دیا (اُن کی تباہی کچھ چھپی ہوئی نہیں ہے) ان کی آبادیوں سے تم پر (تباہی کی یہ داستان) خوب آشکارا ہو چکی ہے. (یہ تباہی کیوں آئی؟ محض اس لئے کہ) شیطان نے ان کی بدعملیوں کو ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا رکھا تھا اور وہ انہیں (متواتر) حق کے راستہ سے روکتا رہا. (چنانچہ بار بار کی خدائی تنبیہوں کے باوجود انہیں اپنی بے راہ روی کا احساس تک نہ ہو سکا. اور یہ بات نہیں تھی کہ وہ اندھے ہو چکے ہوں یا انہیں نظر نہ آتا ہو. (دنیوی معاملات میں) وہ ویسے بڑے (ہوشیار اور) دیدہ ور تھے!

اس کی تفسیر دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے.

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ.........وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (۴۶/۲۶)

اور ہم نے (زمین میں) انہیں اتنا اقتدار دے رکھا تھا جتنا تمہیں بھی نہیں دیا. اور ہم نے انہیں (دیکھنے کے لئے) آنکھیں (سننے کے لئے) کان اور (سمجھنے کے لئے) دل دے رکھے تھے. مگر ان کی وہ آنکھیں، کان اور دل کچھ بھی کام نہ آ سکے. (کیونکہ وہ ان کی قبول

حق کی صلاحیت کو خود ہی کھو چکے تھے) اس وجہ سے کہ وہ آیاتِ الٰہی کا ضد اور ہٹ دھرمی
سے انکار کیا کرتے تھے (اور اس حد تک پہنچ کر صلاحیت باقی نہیں رہا کرتی) اور (بالآخر) جن
چیزوں کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے (یعنی عذاب الٰہی) وہ اُن پر نازل ہو کر رہیں۔

اور اگر آپ کے نزدیک عاد و ثمود کی یہ داستانیں اتنی پرانی ہیں کہ ان کا اثر زائل ہو چکا ہے تو خود اپنی آنکھوں کے سامنے یورپ کے مستبصرین کی حالت کو دیکھ لیجئے. کس طرح وہ خود اور ان کے ساتھ پوری دنیا ہلاکت میں گھر چکی ہے اور باوجود آنکھیں رکھنے کے کوئی نجات کی راہ دکھائی نہیں دیتی؟ دکھائی دے بھی کس طرح؟ ایک تو عقل خود محدود. پھر اس پر وہ امیال و عواطف سے متأثر اور جذبات کے نرغے میں گھری ہوئی. یہی ہے کہ انسان کی نگاہ محض سطح پر رہتی ہے. معاملات کی گہرائی تک نہیں اُتر سکتی. اسی لئے فرمایا کہ

وَ عَسٰۤی اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲/۲۱۶)

بہت ممکن ہے ایک بات کو تم بُرا سمجھتے ہو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو. اور ایک بات تمہیں اچھی لگتی ہو. اور اسی میں تمہارے لئے برائی ہو (پس اپنے جذبات کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی بنا پر اعمال کی اچھائی برائی کا فیصلہ نہ کر دو) اللہ جانتا ہے (کہ تمہارے لئے کس ناگواری میں خوشگواری اور کس پسندیدگی میں ناپسندیدگی ہے) مگر تم نہیں جانتے!

عقل کی یہی کوتاہ دامنی ہے جس کی بناء پر انسان ان چیزوں کی آرزو کرتا رہتا ہے جو درحقیقت اس کے لئے مضر ہوتی ہیں۔

وَ یَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝ (۱۷/۱۱ نیز ۲۱/۳۷)

اور جس طرح انسان اپنے لئے بھلائی کی دعائیں مانگتا ہے اسی طرح (بسا اوقات) بُرائی بھی مانگنے لگتا ہے، اگرچہ نہیں جانتا کہ یہ اُس کے لئے بُرائی ہے) اور حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی جلد باز ہے۔

انسان کی اس کمزوری پر پھر غور کیجئے کہ وَ کَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (یہ بڑا جلد باز واقع ہوا ہے)۔ اِدھر ایک چیز سامنے آئی اور اُدھر اس کے جذبات نے اسے نہایت حسین و دل کش نقاب اڑھا کر اس کی نگاہوں کو فریب دیا۔ اُس نے عقل سے پوچھا اور عقل نے جذبات کے غلام ہونے کی حیثیت سے فوراً ایک منطقی توجیہہ اس کے جواز میں تراش دی۔ بس پھر کیا تھا؟ اس مقصد کے حصول کے لئے لہو پانی ایک کر دیا۔ گویا اس کی تمام زندگی کا دار و مدار اسی مقصد کے حصول میں مضمر ہے۔ اور کبھی خیال نہ کیا کہ ان فریبِ نگاہ پردوں کے پیچھے بھی جھانک کر دیکھ لیا جاوے کہ اُن میں چھپا کیا ہے؟ سچ ہے کَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا۔ بقول علامہ اقبالؒ،

آدمی اندر جہانِ خیر و شر کم شناسد نفع خود را از ضرر
کس نداند زشت و خوب کار چیست جادۂ ہموار و ناہموار چیست

○

تمدّن کی زندگی اور تنہا عقل کی رہبری

اگر انسان کو ایسی زندگی بسر کرنی ہوتی کہ ایک فرد کسی ایک جزیرہ میں تنہا رہتا اور دوسرا دُور کسی اور میں تنہا، تو بھی گزارہ ہو جاتا، لیکن انسان، ارسطو کے الفاظ میں "سیاسی حیوان" (POLTICAL ANIMAL) ہے۔ یہ مدنی الطبع واقعہ ہوا ہے۔ اسے آپس میں مل جُل کر رہنا ہے۔ اس نہج کی زندگی کا تقاضا ہے کہ انسانوں کے مفاد میں باہمی تصادم ہو، یہ تصادم جذبات پر مبنی ہوتا ہے (کہ مفاد کا تعلق جذبات سے ہے) اور جذبات کے تقاضوں کو بروئے کار لانے والی قوت عقل ہے۔ اس لئے مدنی الطبع انسان کے لئے 'تنہا عقل کی راہنمائی (جسے صحیح الفاظ میں جذبات کی کامجوئی کہنا چاہیئے) بڑی ہلاکت آفریں ہے۔ غور فرمایئے انسانی حقوق اور ان کا تحفظ، یہی وہ بنیاد ہے جس پر انسانی تمدّن کی فلک بوس عمارت قائم ہے۔ مملکت اور اس کا نظام، حکومت اور اس کا انصرام، سلطنت اور اس کا نظم و نسق، ایک قبیلہ کا دوسرے قبیلہ سے برسرِ پیکار ہونا، ایک قوم کا دوسری قوم سے نبرد آزمائی کرنا، ایک ملک کا دوسرے ملک پر دھاوا بول دینا۔ یہ سب کیا ہیں؟ انسانی حقوق و مفاد کے تصادم اور اُن کے تحفظ اور سلب و نہب کی آگ اور خون سے لکھی ہوئی داستانیں (بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ کی تفسیریں) ہیں۔ اس باب میں ہلاکو اور چنگیز خاں سے لے کر دورِ حاضر کی (بظاہر)

مہذب لیکن (درحقیقت) "وحشی" اقوام تک، سب ایک ہی رنگ میں رنگی ہوئی چلی آرہی ہیں عقل نے انہیں کیا سکھایا ہے؟ یہی نا کہ قتل و غارت گری۔ تباہی اور بربادی کے موثر ترین ذرائع کس طرح ایجاد کئے جاسکتے ہیں. چنگیزی اور ہلاکو خانی دور، وحشت و جہالت کا دور تھا۔ اس لئے وہاں ایک انسان دوسرے انسان کو بمشکل دوچار گھنٹے میں مار سکتا تھا. آج علم و عقل اپنی انتہائی بلندیوں پر ہے اور انسانی درندگی کی حالت یہ ہے کہ ایک ساعت میں لاکھوں انسان آگ اور خون کے جہنم میں دھکیل دیئے جاسکتے ہیں. بستیوں کی بستیاں، ملکوں کے ملک اس طرح ویران اور برباد کئے جاتے ہیں. (كَاَنْ لَّمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا) میدانِ جنگ میں سپاہی آگ کے شعلوں سے کھیل رہے ہوتے ہیں اور اُدھر شہروں کے اندر سائنسدانوں کی جماعتیں اپنے علم و عقل کے تمام مایۂ ناز سرمایہ کو لے کر اس فکر میں غرق کہ کوئی ایسی نئی ایجاد ہاتھ لگ جائے جس سے انسانوں کی بربادی جلد از جلد عمل میں لائی جاسکے. پہلی جنگِ عظیم کے دس سال بعد، دنیا کی ۶۸ حکومتوں میں سے ۶۳ نے ایک میثاق پر دستخط کئے جو (KELLOGG PACT) کے نام سے مشہور ہے. اس میں انہوں نے نہایت جوش و خروش سے اعلان کیا کہ

خُون کی ہولی

> اس مقدس فریضہ کے شدید احساس کے ساتھ کہ ہمیں نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کو ترقی دینا ہے. اس جذبہ سے متاثر ہو کر کہ وقت آگیا ہے کہ اس امر کا اعلان کر دیا جائے کہ جنگ کو قومی حکمتِ عملی کی حیثیت سے یکسر ترک کر دینا چاہیئے. اس یقین کے ساتھ کہ حکومتوں کے باہمی معاملات میں تغیّر و تبدّل امن و صلح کے طریقوں سے ہی ہونے چاہئیں اس میثاق پر دستخط کرنے والی حکومتیں (اپنی اپنی اقوام کے نام پر) حلفاً اعلان کرتی ہیں کہ وہ بین الاقوامی معاملات کے تصفیہ کے لئے جنگ کے طریقِ کار کو مذموم سمجھتی ہیں اور آپس کے باہمی تعلقات کے لئے اسے بہ حیثیت قومی حکمتِ عملی اختیار کرنے سے بیزاری کا اظہار کرتی ہیں. اس میثاق پر دستخط کرنے والی جماعتیں اس امر پر متفق ہیں کہ تمام باہمی تنازعات کا حل یا تصفیہ (خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں اور ان کی ابتدا کسی طرح ہوئی ہو) پُرامن طریقوں کے علاوہ اور کسی طریق سے نہیں کیا جائے گا.

لیکن اس میثاق امن کی ابھی روشنائی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ یہی اقوام پھر اسی طرح آپس میں

گتھم گتھا ہوگئیں. اور یہ سب کچھ کس چیز کے لئے ؟ "روٹی" کی خاطر اور اپنی اپنی قوم (نسل) کے تحفظ کے لئے! کیا اس کے بعد بھی اس حقیقت باہرہ کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ مدنی الطبع انسان کی راہ نمائی کے لئے عقل کی راہ نمائی (جو درحقیقت اس کے جذبات کی بر ومندی کا آلہ کار ہوتی ہے) راہ نمائی نہیں رہزنی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ یورپ اپنے موجودہ نظام سے جو تنہا عقل پر مبنی تھا اس درجہ تنگ آچکا ہے کہ وہ کسی نظامِ جدید کی تلاش میں پاگلوں کی طرح مارا مارا پھر رہا ہے. پروفیسر کوبن (جس کا تعارف پہلے کرایا جاچکا ہے) تہذیبِ مغرب کی تباہی کے سلسلہ میں چاروں طرف سے مجبور ہو کر لکھتا ہے:-

> اب صرف اتنا پوچھنا باقی رہ گیا ہے کہ عقل کے علاوہ کوئی ایسی بنیاد بھی ہے جس پر ہم قانونِ حکومت کی دوبارہ تشکیل کر سکیں؟ اگر دنیا میں کوئی عالمگیر مذہب ہوتا تو اس کے آسمانی قوانین پر جدید نظامِ حکومت کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی لیکن ایک ایسی دنیا میں جہاں مختلف مذاہب موجود ہوں یہ کوشش کرنا کہ ان میں سے کسی ایک کے ضابطہ کے مطابق "قانونِ فطرت" کو قائم کر دیا جائے. نہ یہ کہ نظری طور پر اس کا جواز مشکل ہوگا بلکہ عملی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم پھر سے لڑائیوں کے دَور کو واپس بلالیں گے.
>
> (صفحہ ۹۲)

سردست اس چیز کو نظر انداز کر دیجئے کہ پروفیسر صاحب نے اپنے اس بیان کے آخری حصہ میں کتنی بڑی ٹھوکر کھائی ہے. (اس کا جواب اپنے مقام پر آئے گا. جہاں یہ بتایا جائے گا کہ دنیا میں عالمگیر مذہب' یعنی دین' ہونے کی اہلیت کس میں ہے) یہاں صرف یہ دیکھئے کہ یورپ کس طرح اپنے نظامِ تمدن سے' کہ جس کی بنیاد عقل پر تھی' تنگ آکر اب ایک ایسے نظام کی تلاش میں ہے جس کے نظام کی بنیاد وحیٔ آسمانی پر ہو اس سے بڑھ کر تنہا عقل کے ناکافی ہونے کی اور کیا دلیل ہوگی؟

یورپ کیسا نظام چاہتا ہے؟

پروفیسر کوبن کو چونکہ کوئی عالمگیر مذہب دکھائی نہیں دیا. (اس لئے کہ ان کے سامنے حقیقی اسلام نہیں. ہم نے حقیقی اسلام ان تک پہنچایا ہی نہیں. ورنہ یورپ تو اسلام کے لئے تڑپ رہا ہے) اس لئے آگے چل کر وہ اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ دنیا آج کس قسم کا نظام چاہتی ہے. وہ لکھتے ہیں:-

"ہمارے اس کہنے سے کہ کیا کوئی ایسا قانون ہے جو انسانی فطرت کے اندر موجود ہو، دراصل مطلب یہ ہے کہ کیا کہیں کوئی ایسا ضابطۂ اخلاق ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے قابلِ قبول ہو اور جسے خود انسانی اندازِ زندگی سے، اخذ کر کے مرتب کیا جائے؟ محض عدل و انصاف کے نظری اصول کے طور پر نہیں. بلکہ جس طرح حق (RIGHT) کے مثبت تصورات کو فی الواقعہ محسوس کیا جاتا ہے. اگر کہیں کوئی ایسا ضابطہ ہے تو وہی نظامِ فطرتِ انسانی بن سکتا ہے." (صفحہ ۱۰۵)

اس کے بعد وہ حقوقِ انسانی اور فطرتِ انسانی کے اجمال کی وضاحت کر کے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ

ایسا مان لینا غیر معقول نہیں کہ اس قسم کے عالمگیر اخلاقی تصورات کا وجود ثابت کیا جا سکتا ہے. (لیکن) ضابطۂ اخلاق ایسی چیز نہیں جسے عقل سے ثابت کیا جا سکے. اس لئے کہ اس کی بنیاد ہی حق و باطل اور خیر و شر کی تمیز پر ہوتی ہے اور اس یقین پر کہ انسان کو حق اور خیر قبول کرنا چاہیئے اور باطل و شر سے مجتنب رہنا چاہیئے. لہٰذا فطرتِ انسانی کے اس اخلاقی تحکم کو عقلاً کس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے؟ اگر کوئی پوچھے کہ انسان کو کیوں حق اختیار کرنا اور باطل سے اجتناب کرنا چاہیئے تو اس سوال کا جواب بجز ان الفاظ کے جن میں یہ سوال پوچھا گیا ہے اور کیا دیا جا سکتا ہے. اس کا جواب اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ جواب خود سوال کے اندر موجود ہے. اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اخلاقی ضابطہ جبلی طور پر انسانوں کے اندر موجود نہیں. اس لئے کہ باطل پرستی بھی دنیا میں کچھ کم نہیں ہے." (صفحہ ۱۰۸)

آپ نے غور فرمایا کہ علم و عقل اور تہذیب و سائنس کے علمبردار اپنے نظامِ تمدن کے ہاتھوں تنگ آ کر کس چیز کی تلاش میں ہیں؟ ایک ایسے ضابطۂ حیات کی جو "فطرتِ انسانی" کے عین مطابق. بلکہ خود فطرت ہی پر مبنی ہو. جسے تمام نوعِ انسانی داعیاتِ فطرت کی حیثیت سے قبول کر لے. اور یوں یہ ضابطۂ عالمگیر نظامِ حکومت بن سکے. پروفیسر کوہن کے نزدیک اس قسم کا ضابطہ نہ تو جبلی طور پر انسانوں کے اندر موجود ہے اور نہ ہی عقل کی رو سے قائم کیا جا سکتا ہے. لہٰذا کوئی اور ذریعہ ہونا چاہیئے جس کی رو سے اس قسم کا ضابطہ وجود میں آ سکے (اس کی تفصیل آیندہ اوراق میں آئے گی).

یورپ کا قلبی اضطراب

یورپ کے موجودہ قلبی اضطراب اور ذہنی خلفشار کے متعلق پروفیسر جوڈ کا بیان بھی قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں،۔

اس زمانہ میں مشین نے انسان کو بے پناہ قوت دے دی ہے اور اس قوت سے وہ تعمیر اور تخریب کے بے حد و حساب کام کر سکتا ہے۔ وہ چاہے تو سمندروں کو پھاڑ دے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے۔ آسمان اس کے سامنے گرد ہے اور کائنات سرنگوں۔ لیکن اتنی قوت پا کر بھی وہ سکھی نہیں ہوا۔ بلکہ وہ اور دکھی ہے۔ آج مشین کی طاقت انسان کو مطمئن کرنے کے کام نہیں آرہی۔ بلکہ اُلٹا اسے تباہ و برباد کیا جا رہا ہے...... اگر اس طاقت کو قابو میں رکھنے کی کوئی سبیل نہ کی گئی تو انسانیت کا انجام اچھا نظر نہیں آتا۔

انسان کی ہزارہا سال کی جدّ و جہد کا یہ انجام کیوں ہوا؟ اور آج وہ مشین کے ہاتھوں کیوں ایسا بے بس نظر آرہا ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے طاقت تو حاصل کر لی اور آگ اور پانی اور معدنیات کو کام میں لانے کے وسیلے ڈھونڈ لیے۔ لیکن اس طاقت کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی عقل ہم نے حاصل نہ کی۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج انسان اس مصیبت میں گرفتار ہے۔ ضرورت ہے کہ طاقت کو صحیح راہ پر چلانے کی عقل بہم پہنچائی جائے۔ اور اگر طاقت اور عقل میں صحیح توازن ہو جائے تو آج ہماری مصیبتیں دُور ہو سکتی ہیں اور انسانیت آنے والی تباہی سے بچ سکتی ہے۔

بے شک انسان، مظاہرِ فطرت کو مسخر کرنے میں اپنے آبا و اجداد سے بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ لیکن جہاں تک اس کے اپنے رہنے سہنے اور دوسروں سے مل کر زندگی گزارنے یعنی اخلاقیات و سیاسیات کا تعلق ہے۔ وہ اب تک وہیں ہے جہاں ہزاروں برس پہلے یونان کے قدیم باشندے تھے۔ ہم نے گو مادّی ترقی تو بہت کر لی ہے۔ لیکن روحانی اور اخلاقی لحاظ سے ہم ذرا بھی آگے نہیں بڑھے۔ اور آج رونا بھی اس بات کا ہے اور ساری ضرورت بھی یہی ہے کہ ہم اپنی مادی طاقت کے مطابق اپنے اندر روحانی اور اخلاقی عقل پیدا کریں تاکہ اس طاقت کا صحیح مصرف ہو سکے۔ ورنہ یہ طاقت وبالِ جان ہو جائے گی۔"

غور کیا آپ نے کہ مغرب کے یہ مفکرین، کشاں کشاں کس طرح اس مقام کی طرف بڑھ رہے ہیں جس کی طرف

قرآن کریم نے راہنمائی کی ہے؟ اس کے بعد پروفیسر موصوف لکھتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ عقل (یعنی اخلاقی عقل) ہم کیسے سیکھیں اور موجودہ اخلاقی وروحانی مُردنی کو زندگی سے کیسے بدلیں؟ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کہیں سے کچھ زیادہ اُمید نظر نہیں آتی اور آثار بھی کچھ ایسے ہیں کہ نااُمید ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ مشینی طاقت کو قابو میں رکھنا اور نئی اخلاقی قدروں کو پیدا کرنا اس دور میں مشکل ہو گیا ہے۔ نوجوان روایتی مذہب سے بالکل برگشتہ ہو چکے ہیں۔ کوئی اخلاقی ضابطہ انہیں پسند نہیں آتا۔ اعلیٰ نصب العین سے وہ بیزار ہو چکے ہیں اور زندگی کی شب و روز کی مسرتوں ہی میں راحت پاتے ہیں کسی وعدۂ فردا کا انتظار ان کو گراں ہے اور عشرتِ امروز ہی اب ان کا عقیدہ بن گیا ہے "آج" کھاؤ، پی لو، کل کو تمہیں مرنا ہے" یہ ہے اصول آج کے نوجوان کا۔ اور شاید یہ وہی دور ہے جو "سپنگلر"[1] کے الفاظ میں کسی کلچر کی موت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ کیا ہم سمجھ لیں کہ موجودہ تمدّن فنا کے ہاتھ سے نہیں بچ سکتا اور یورپ پر اب دمِ نزع طاری ہے۔ اور جو کچھ روما کے ساتھ ہوا۔ اب بعینہٖ یہی حشر یورپ کا ہوگا؟

مغربی فلاسفر پسکال نے لکھا ہے کہ انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے اور اسی طرح انسان کا ارادہ بھی کسی نہ کسی سے محبت کرنے پر مجبور ہے اور جب ایمان و محبت کے لئے اس کو کام کی باتیں نہیں ملتیں تو وہ بیکار اور خراب مقصدوں پر ریجھ جاتا ہے۔ خلا قدرت کے کارخانے میں محال ہے اور محض مادّی دنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی خلا ناممکن ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ اور اچھے نصب العینوں سے دستکش ہو جائے تو بُرے راستے اس کو خوش آتے ہیں۔ یورپ کو اگر اس دلدل سے نکلنا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ بے یقینی کی جگہ یقین

---

[1] "سپنگلر" کی کتاب (DECLINE OF THE WEST) اپنے موضوع پر ایک بلند پایہ تصنیف ہے ارباب ذوق کے لئے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

اور ایمان لے لے۔ بے راہ روی ختم ہو اور یورپ والے نئی قدروں پر ایمان اور اخلاقی ضابطوں سے محبت پیدا کریں۔ وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی گرمی ہو اور نہ اخلاقی ضابطہ کی کشش، وہ زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز کی رائے میں اس دَور کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ طاقت اور قوت ہے لیکن اس کا کوئی مصرف موجود نہیں۔ یعنی کوئی ایسا نصب العین موجود نہیں جو نوجوانوں کی امنگوں، ولولوں اور حوصلوں کو بروئے کار لائے۔ ایک طرف اتنی زیادتی اور دوسری طرف اتنی کمی۔ یہ ہمارا سب سے بڑا روگ ہے۔ لیکن ہمارے اندر اس نصب العین کی تلاش کا مادہ فنا نہیں ہوا۔ اور اس سے اُمید ہوتی ہے کہ شاید ہم نئے دَور کو پیدا کر سکیں۔ اور اخلاقی اور مذہبی قدور کے نہ ہونے سے ہماری زندگیوں میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے، وہ بھرا جا سکے۔ اگر یہ نہ ہوا تو ہماری تہذیب آپس میں ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی۔ اگر ہمیں بچنا ہے تو اپنے لئے کوئی مذہب تلاش کرنا ہو گا جس کو ہم دل سے مانیں اور اس کے اصولوں پر زندگی ڈھالیں۔

(ماخوذ از "کتاب" لاہور۔ فروری ۴۳ء)

یورپ کا یہ تمام اضطراب و خلفشار، یہ سب بے چینی اور پریشانی، یہ سب وحشت و سراسیمگی، یہ عدمِ اطمینان و فقدانِ سکون کا جہنم، نتیجہ ہے اس تمدّن کا جسے تنہا عقل کی بنیادوں پر، کائنات کے میکانکی تصوّر کے مطابق قائم کیا گیا۔ تنہا عقل ادراکِ حقیقت نہیں کر سکتی اس لئے کہ اس کا قائم کردہ نظام کبھی انسانی ذات کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ اور میکانکی تصوّر چونکہ انسان کو ایک مشین بنا دیتا اور اس کی زندگی کو جوئے رواں قرار دینے کے بجائے، اسی مجلسِ آب و رگل میں ختم کر دیتا ہے۔ اس لئے مایوسیوں کے زہریلے سانپ اس کے تحت الشعور میں بُری طرح سے زہر افشاں اور شعلہ ریز رہتے ہیں۔

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار

اس طرح بقول علّامہ اقبالؒ یورپ کا نوجوان۔

اپنے فکر کی دنیا میں خود اپنی ذات کے خلاف ستیزہ کار رہتا ہے اور سیاسی دنیا میں دوسروں کے خلاف نبرد آزما۔ وہ نہ اپنی کفِ بردباں سرکشی کو ضبط میں لا سکتا

ہے اور نہ ہی ہوسِ زر پرستی کے استغفار کی تسکین کا سامان فراہم کر سکتا ہے یہی وہ چیزیں ہیں جو اس کے تمام بلند مقاصد کو (ایک ایک کر کے) ہلاک کر رہی ہیں اور ایسی کیفیت پیدا کر رہی ہیں کہ وہ زندگی کے ہاتھوں بیزار ہے۔ وہ نگاہ فریب مناظر میں جذب ہو کر اپنی ذات کی گہرائیوں سے یکسر منقطع ہو چکا ہے۔ اس منظم مادہ پرستی کے میدان میں اس کی توانائی پر وہ فالج گر چکا ہے جسے ہکسلے کی نگاہ نے بھانپا اور اس پر اظہار تأسف کیا تھا۔ (خطبات، ص۱۷۷)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ادراکِ حقیقت علم استدلالی (عقل) کے ذریعے ممکن نہیں۔ اب یہ دیکھنا ہو گا کہ کیا اس علم کے علاوہ انسان کے پاس کوئی اور علم بھی ہے۔ لیکن اس کڑی تک پہنچنے سے پہلے، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا پیکرِ انسانی میں ذریعۂ علم واحساس دماغ[1] ہی ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی۔ بالفاظِ دیگر یہ کہ انسان محض اسی آب و گل کے پیکر کا نام ہے جسے ارتقار کے میکانکی عمل کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے یا اس سے ماورار کچھ اور بھی۔

انسان کے گرد و پیش کی دنیا کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) جامد مادہ (INORGANIC MATTER) (۲) حیات (LIFE) (۳) شعور (CONCIOUSNESS) علم طبیعیات (PHYSICS) مادہ سے متعلق ہے اس سے آگے علم الحیات (BIOLOGY) ہے۔ اس کے بعد شعور۔ کائنات کے میکانکی تصوّر کی رُو سے (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جس کے سب سے بڑے علمبردار ڈارون اور اس کے رفقائے کار ہیں اور ان کا مابہ الامتیاز کارنامہ نظریۂ ارتقائے مادیت ہے) مادہ کے مختلف عناصر کے امتزاج سے "کسی نہ کسی طرح"[2] زندگی کی شاخ پھوٹ نکلی اور مختلف ارتقائے منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ زیادہ نفیس ہوتی گئی۔ حتّٰی کہ حیوانی قالب نے انسانی پیکر

---

[1] ہم اس مقام پر دماغ (BRAIN) اور قلب (MIND) کے اصطلاحی اور فنی فرق کی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے۔ دماغ سے ہمارا مفہوم علم استدلالی کا مقام ہے جسے مادہ پرست سائنسدان عملِ ارتقار کا میکانکی نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

[2] یہی اس کی سب سے بڑی غلطی ہے "کسی نہ کسی طرح" نہیں بلکہ ایک حکیم مطلق کے ارادہ سے ایک عظیم الشان مقصد کے ماتحت۔

شعورِ انسانی کیسے پیدا ہوتا ہے؟

اختیار کر لیا، جو سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی قرار دی جاتی ہے۔ [چنانچہ اس نظریہ کی رُو سے "دنیائے سائنس میں اس خیال کے لئے کوئی بنیاد نظر نہیں آتی کہ انسان کے موجودہ امتزاجی پیکر میں کوئی بھی مادی اضافہ ممکن ہے۔" (خطبات ص۱۷۷)۔ ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ انسانی شعور کا مقام، دماغ (BRAIN) ہے جو ارتقاء کے میکانکی عمل کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا جب پیکرِ انسانی کا یہ میکانکی عمل ختم ہو جائے گا تو پھر کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ لیکن دورِ حاضرہ کی تحقیقات نے جہاں مادّہ کی اصل دبنیاد کے متعلق محیّر العقول انکشافات بہم پہنچائے ہیں، وہاں حیات کی دنیا میں بھی قدیم زوایائے نگاہ کو بڑی حد تک بدل دیا ہے۔

فکر کے متعلق تحقیقِ جدید

عصرِ رواں کے اربابِ سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ انسانی قوّتِ فکر (INTELLECT) مادّہ کے میکانکی عمل کا نتیجہ نہیں۔ مشہور عالمِ حیات (J.S. HALDANE) اس مسئلہ پر تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ انسانی شعور، مشینی عمل نہیں ہے۔ اس لئے کہ "ایک مشین کے متعلق یہ تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے قیام وبقاء اور مزید نشوو ارتقاء کا ذریعہ بن سکتی ہے۔" (خطبات ص۴۱)۔ پروفیسر (A.V. HILL) اپنے ایک لیکچر میں خود حیات کے متعلق بیان کرتا ہے۔

> "میں آج آپ کے سامنے یہ نہیں کہنا چاہتا (اس لئے کہ آپ اس سے پہلے متعدد بار اس غلط نظریہ کو سُن چکے ہیں) کہ مسئلہ حیات موجودہ زمانہ کی طبیعیات اور کیمیا سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ خواہ سمجھانے والا کیسا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو (ایسا ممکن نہیں) آیا مستقبل کے علم طبیعیات اور کیمیا کے ذریعے ایسا ممکن ہوگا۔ اس کے متعلق میں قیاس آرائی نہیں کرنا چاہتا۔ جب علمِ طبیعیات کے حوادث غیر متعین ہو جائیں...... جب علم الکیمیا علمِ طبیعیات بن جائے، اس وقت صورتِ حالات اور ہوگی۔ لیکن اس وقت تک میں (HALDANE) کی ہم نوائی میں یہی کہتا رہوں گا کہ جب ہم علمِ حیات (یا اشیاء کی قوّتِ نمو) کو تماماً دیکھتے ہیں تو ہمارے سامنے ایک بالکل مختلف صورت آجاتی ہے۔ ایسی صورت جس کی وحدت اور بنیادی فطرت ایسی ہی اہم ہے جیسے طبیعیات کے کسی لوتصوّر کی
>
> (THE PHYSICAL REASONABLENESS OF LIFE)

حیات میکانکی عمل نہیں

یعنی زندگی "عناصر میں ظہورِ ترتیب[1]" کا نام نہیں۔ یہ اپنے امتزاجی عناصر کا میکانکی مجموعہ نہیں۔ اس کی بنیادی فطرت، ان عناصر کی فطرت واساس سے بالکل مختلف ہے جن سے یہ مرکّب ہے۔ لہٰذا جب خود زندگی، مادی ارتقاء کے میکانکی عمل کا نتیجہ نہیں تو ظاہر ہے کہ زندگی کا لطیف جوہر یعنی فکرِ انسانی (INTELLECT) میکانکی عمل کا نتیجہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ پروفیسر (C. LLOYD MORGAN) اپنی مشہور تصنیف (THE EMERGENCE OF NOVELTY) میں اس مسئلہ پر مبسوط بحث کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ فکرِ انسانی، سلسلۂ ارتقاء کی سابقہ کڑیوں کی پیداوار نہیں۔ اسی طرح علم الحیات کا مشہور محقق (DR. DRIESCH) لکھتا ہے کہ "نظریۂ میکانکی کی راہ میں، ایک بڑی مشکل شعور تھا۔ اس لئے کہ شعور، بداہتاً مادی چیز نہیں"۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ ۱۹۰۰ء کے بعد، رفتہ رفتہ علم الحیات اور علم النفس کے محققین کے تصور میں کس طرح بنیادی تبدیلی پیدا ہوتی گئی جس سے یہ میکانکی تصور، عہدِ پارینہ کی داستان بن کر رہ گیا۔ ان محققین کے نزدیک شعور، مادی ارتقاء کا نتیجہ نہیں ہے۔ (THE GREAT DESIGN)

(WILDON CARR) کا حسب ذیل اقتباس (جسے علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں نقل کیا ہے) اس باب میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

> اگر عقل ارتقاء کی پیداوار ہے تو مدارِ حیات اور ماہیتِ حیات کا سارا میکانکی تصور مہمل پڑتا ہے اور صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ جو اصول سائنس نے اختیار کیا ہے اس پر نظرِثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ اس اصول کو الفاظ میں ادا کرتے ہی ہمیں یہ نظر آجاتا ہے اس کے اندر تناقض موجود ہے۔ بھلا یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ خود عقل جو ادراکِ حقیقت کی ایک جہت ہے، نتیجہ ہو ایک ایسی چیز کے ارتقاء کا جس کا وجود محض ایک تصور منتزع ہے اسی جہت

---

[1] مغرب کے مادی تصور سے ماؤف ذہن کا مظاہرہ ان ہی الفاظ میں ہوتا ہے ؎

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

ادراک کا جسے عقل کہتے ہیں. اگر عقل ارتقائے حیات سے وجود میں آئی ہے تو وہ تصوّرِ حیات جس کی رُو سے عقل کا بہ حیثیتِ ادراکِ حقیقت کی جہت کے نشو و نما پانا ممکن ہے، ایک مقرون فعل کا تصوّر ہونا چاہیئے نہ کہ صرف ایک مجرد میکانکی حرکت کا تصوّر جس کا خیال عقل نے اپنے مشمول ادراک کی تحلیل کے ذریعے قائم کرلیا ہے. اس کے علاوہ اگر عقل ارتقائے حیات کا نتیجہ ہے تو وہ قائم بالذّات نہیں بلکہ منحصر ہے اس چیز کے عمل پر جس سے اس نے ارتقاء پائی ہے. تو پھر ایسی صورتوں میں سائنس کو کیا حق ہے کہ علم کے موضوعی پہلو کو نظر انداز کر کے معروضی ادراک کو قائم بالذّات سمجھ بیٹھے. غرض حیاتیات کا صریح اقتضا ہے کہ سائنس کے اصول پر دوبارہ غور کیا جائے.

ان تصریحات سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ انسانی فکر، مادّی عناصر کے امتزاج کا نتیجہ نہیں. اس سے الگ کچھ اور ہے اور اس کی کنہ دحقیقت دریافت کر لینا، علم الحیات کی دسترس سے باہر ہے چنانچہ (SAMUEL) اس موضوع پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے.

یہ کہنا بھی غلطی ہے کہ چونکہ علم الحیات، طبیعیات اور کیمیا کے ذرائع اختیار کر کے ایک خاص حد تک کامیابی حاصل کر چکا ہے اس لئے اس حد سے آگے بھی وہی ذرائع استعمال کئے جائیں. یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس علم کی کامیابی جس نقطہ پر جا کر رُک گئی ہے اس سے آگے ایک نیا موضوع شروع ہو جاتا ہو جو اُن (سابقہ) ذرائع کی حدود سے آگے ہو.

یہاں تک ہم نے یہ دیکھ لیا کہ فکرِ انسانی ارتقاء کے میکانکی عمل کا نتیجہ نہیں اس سے ہم کم از کم، اس نتیجہ تک تو ضرور پہنچ گئے کہ پیکرِ انسانی میں کسی غیر مادّی شے کا انکار محض اس بناء پر نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا وجود عالمِ طبیعیات یا علم الحیات کی رُو سے میکانکی طور پر ثابت نہیں ہوتا. پیکرِ انسانی میں اس قسم کی چیزوں میں سے ایک تو قوّتِ فکر (INTELLECT) ہے جسے ہم نے علم استدلال کے مرکز سے تعبیر کیا ہے اور جسے عرفِ عام میں دماغ[1] (BRAIN) کہا جاتا ہے. لیکن انسان کی دنیا میں اس کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جس کا دائرۂ استدلالی قوّت کی حدود سے ماوراء ہے.

---

[1] دماغ سے مفہوم، کاسۂ سر میں مادی خلیات (CELLS) کا مجموعہ (بھیجا) نہیں بلکہ قوّتِ عقل و فکر ہے.

قرآنِ کریم اس چھپی ہوئی دنیا کو نفس کہہ کر پکارتا ہے۔ فلسفہ اسے آنا (SELF) یا خودی (EGO) کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اسی سے انسان کی شخصیت (PRESONALITY) عبارت ہے اور اسی سے اس کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) قائم ہے۔ جب آپ "میں" کہتے ہیں تو اس سے مفہوم نہ آپ کا گوشت پوست کا جسم ہوتا ہے نہ دماغ، بلکہ ان سے کچھ الگ۔ کائنات کا تمام ہنگامہ اسی "میں" سے قائم ہے۔ اسی کا نام "نفسِ انسانی" ہے جس کا مقام استدلال کی دنیا سے آگے ہے۔

نفسِ انسانی

نفسِ انسانی کے متعلق، سائنس کی دنیا ابھی کچھ بھی مفید مطلب معلومات بہم نہیں پہنچا سکی۔ اس باب میں بقول (SAMUEL)

> "سائنس نے بہت تھوڑا فاصلہ طے کیا ہے۔ زندگی اور نفس کے متعلق آج ہمارا علم قریب قریب اسی مقام پر ہے جہاں مادہ کے متعلق ہمارا علم تین چار صدیاں پیشتر تھا۔"

دل اور دماغ، نظر اور فکر میں کیا باہمی تعلق ہے؟ یہ ایک دوسرے پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں؟ ان کے دوائرِ عمل و نفوذ کے حدود کہاں ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا ابھی تک کوئی جواب نہیں مل سکا۔ (واضح رہے کہ جب ہم دماغ کے بالمقابل دل یا فکر کے مقابل نظر وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کریں گے تو ان سے مراد انسانی نفس اور اس کی کارفرمائی ہوگی)۔ اس سلسلہ میں (SIR CHARLES SHERRING) رقمطراز ہے۔

> دل اور دماغ کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اس کے متعلق نہ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ عقدہ لاینحل ہے بلکہ یہ بھی کہ ہنوز وہ بنیاد بھی نہیں معلوم ہو سکی جہاں سے اس سوال کے حل کی ابتدا کی جا سکے۔ (THE BRAIN AND ITS MACHANISM)

مسٹر (SULLIVAN) لکھتا ہے،

> نظریۂ ارتقاء اگرچہ ہمارے جسم کی ارتقائی منازل کے متعلق ہمیں بہت کچھ بتاتا ہے لیکن ہمارے نفس کی ارتقائی منازل پر بہت ہی کم روشنی ڈالتا ہے۔
>
> (LIMITATIONS OF SCIENCE)

علم النفس (PHYCHOLOGY) یا اس کے دوسرے شعبے، نفس کی قوتوں اور اس کے شعوری مظاہر سے بحث کرتے ہیں لیکن نفس کی ماہیت کے متعلق یہ علوم بھی کچھ نہیں بتا سکتے۔ ماہیت تو ایک

طرف. لارڈ بلفورؔ[1] کے الفاظ میں.

کوئی شخص نہ یہ محسوس کر سکتا ہے اور نہ اس امر کو حیطۂ تصور میں لا سکتا ہے کہ طبیعی تبدیلیاں کس طرح نفسیاتی تجاب پیدا کرتی ہیں.

(THE FOUNDATION OF BELIEF)

لیکن کچھ نہ معلوم ہونے کے باوجود، دنیائے مغرب اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو چکی ہے کہ "نفس یا انا چند خصائص و رجحانات ہی کا مجموعہ نہیں. بلکہ یہ شعوری زندگی کا ایک نیا مرکز اور شعوری سرگرمیوں کا نیا سرچشمہ ہے."[2]

(MORAL VALUES AND THE IDEA OF GOD; BY DORLEY)

پروفیسر (EDDINGTON) جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اس موضوع پر بڑے دل کش انداز میں گفتگو کرتا ہے. وہ لکھتا ہے کہ "ہم نے اس سے پیشتر یہاں تک بحث کی ہے کہ "بجلی کے ذرات" کس طرح سمٹ سمٹا کر انسانی پیکر کی صورت اختیار کر گئے. لیکن ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ

---

[1] (LORD BELFOUR) دوسرے مقام پر نفسِ انسانی کی ماہیت کے متعلق جو کچھ لکھتا ہے وہ اسی کے الفاظ میں سنئے. وہ کہتا ہے.

(AN "I" MUST HAVE CHARACTER QUITE APART FROM THE EXPERIENCES, ACTIVE AND PASSIVE, WHICH FILL HIS CONSCIOUS LIFE. HE MUST HAVE (OR BE) A SOUL - A SOUL WHICH IS SOMETHING MORE THAN AN ORGANISED COLLECTION ON CAPACITIES OR A PROCESSION OF PHYSICAL STATUS A SOUL WHICH IS NOT ONLY MERELY SUBSTANCE BUT HAS AN INDIVIDUALITY WHICH IS UNIQUE AND INDESCRIBABLE: THEISM AND THOUGTHP -

[2] ترجمہ کے بجائے مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے.

انسان ان عناصر سے جن کے متعلق پہلے بحث کی جا چکی ہے، بالکل مختلف اور جداگانہ شے ہے. میں یہ نہیں کہتا کہ شعور (CONSCIOUSNESS) نے ارتقائی منازل طے نہیں کیں...... لیکن یہ حقیقت کا ایک ایسا پہلو ہے جو ہماری مادی تحقیق و تفتیش کے دائرے میں نہیں آسکتا یہاں سے مادہ اور روح کی ثنویت[1] کا سوال پیدا ہوتا ہے. ایک طرف شعور ہے کہ وہ مختلف خیالات و کیفیات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے. دوسری طرف مادی دماغ ہے جس میں سالمات و برقیات بگولہ کی طرح رقص کرتے رہتے ہیں. ان دونوں میں باہمی تضاد و تباین بھی ہے اور عجیب و غریب قسم کا تطابق و توافق بھی. میکانکی تصورِ حیات یہی کہے گا کہ جب ہمارے دماغ میں برقی سالمات رقص کرتے ہیں تو ان سے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ شعورِ انسانی، جذبات و خواہشات، آرزوؤں اور امنگوں اور حقوق و فرائض کی ایک نرالی دنیا اپنے اندر لئے ہے جن کے ادنیٰ سے اشارے پر دماغ کے تمام اجزائے لایتجزّیٰ رقص کرنے لگ جاتے ہیں. یہ وہ دنیا ہے جہاں کے احوال و کوائف، طبیعیات کے پیمانوں سے نہیں ماپے جا سکتے، یہی پروفیسر ذرا آگے چل کر لکھتا ہے کہ (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) "محسوسات کی دنیا میں ہم اشیاء کی حقیقت کے متعلق کچھ بھی علم نہیں رکھتے. ہم صرف ان اشارات (SYMBOLS) کو جانتے ہیں جو ہمارے حواس کے ذریعے ہمارے ذہن پر مرتسم ہوتے ہیں. لیکن اس تمام کائنات میں ایک چیز ایسی بھی ہے جس کا ہمیں براہِ راست علم ہے اور وہ ہے انسان کا قلب (MIND). ہم "اشارات" سے اشیاء کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے. لیکن اگر ہم ان اشارات کو اس حقیقت کی دنیا کے پس منظر کے سامنے رکھ دیں جس سے ہمارا قلب متعلق ہے، تو ہم اشیاء کی حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں. لیکن خود قلبِ انسان کی حقیقت طبیعیات کے قوانین سے معلوم نہیں ہو سکتی اس لئے کہ یہ قوانین صرف "اشارات" تک جا سکتے ہیں. ان سے آگے نہیں بڑھ سکتے. لیکن جب زندگی شعور کے ساتھ متمسک ہو جاتی ہے تو ہم ایک بالکل جداگانہ دنیا میں جا پہنچتے ہیں. یہ وہ دنیا ہے جس میں طبیعیات اور کیمیا کے اصول اسی طرح ناکام رہ جاتے ہیں جس طرح یہ کوشش کہ انسانوں کی جماعت پر گرامر کے قواعد و ضوابط کی مانند قوانین سے حکومت کی جائے"

---

[1] اس ثنویت کا حل صرف قرآن پیش کر سکتا ہے. لیکن اس بحث کا مقام یہ نہیں.

غور فرمایا آپ نے کہ مغرب کے "مادّہ پرست" نفسِ انسان کے متعلق کس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں؟ اور دیکھئے! پروفیسر (C. LLOYD MORGAN) نے "ارتقائے نفس" کے عنوان سے ایک محققانہ مقالہ لکھا ہے جس کے اخیر میں وہ رقمطراز ہے:

> میں اپنے اس عقیدہ کا اعتراف کرتا ہوں کہ (نفس کے) اس ارتقاء کو ایک "نفسِ اعلیٰ" (SUPER MIND) کا مظہر یا عکس سمجھنا چاہیئے۔ وہ "نفسِ اعلیٰ" جو ان تمام اشیاء کا خالق ہے جسے ہم "جدید" سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں اس ارتقائے نفس کے اندر یہی دیکھتا ہوں کہ اوپر سے نیچے اور اوّل سے آخر تک ایک عظیم الشان اسکیم (تدبیر) عمل پیرا ہے۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ فطرت کی ہر شے میں یہ ارتقائی بالیدگی خدائی عاملیت (DIVINE AGENCY) کا ہی مظاہرہ ہے۔ اور چونکہ اس سلسلۂ ارتقاء میں نفسِ انسانی بلند ترین مقام پر ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ارتقائے نفسِ انسانی اس "نفسِ اعلیٰ" کی عاملیت کا آئینہ ہے۔ لیکن (جیسا کہ میرا عقیدہ ہے) یہ "نفسِ اعلیٰ" لامحدود اور زمان کی قیود سے بے نیاز ہے اس کی ذات کے لئے "اوّل" اور "آخر" اور "جدّت" و "اعادہ" کے الفاظ ان معانی میں استعمال نہیں کئے جا سکتے جن معانی میں یہ نفسِ انسانی سے بحث کرتے وقت استعمال ہوتے ہیں...... وہ "روحِ خالق" جو قدیم اور واجب الوجود ہے ارتقاء کی پیداوار نہیں۔ بلکہ وہ ایسی ذات ہے کہ خود ارتقاء کی رفتہ ہوئی صورت اس کا پرتو ہے۔

دوسرے مقام پر لکھا ہے:

> میرا یہ عقیدہ ہے کہ جانداروں میں یہ ارتقائے نفس، خدائے تعالیٰ کی قوتِ تخلیق وہدایت (CREATIVE AND DIRECTIVE POWER OF GOD) کا رہینِ منت ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ "ارتقائے نفس" کی ترکیب کا اطلاق خود خدائی ذات پر بھی ہوتا ہے۔ نہیں۔ نفس یا روحِ خداوندی قدیم ہے اور زمان و مکان کی حدود سے بالا۔ (THE GREAT DESIGN)

اقتباسِ بالا میں "خدائے تعالیٰ کی قوتِ تخلیق وہدایت" (CREATIVE AND DICRCTIVE POWER OF GOD) کے الفاظ کو سامنے رکھئے اور پھر قرآنِ کریم کی ان آیاتِ جلیلہ پر غور کیجئے جن میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا ذکر ہے اور سوچئے کہ کیا یورپ کا مادہ پرست، سائنس کی تحقیقات کی رُو سے انہی نتائج تک نہیں پہنچ رہا جن کی طرف قرآنِ کریم نے آج سے چودہ سو سال پیشتر اشارہ کیا تھا؟ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ فرعون کے سوال کے جواب میں کہ (فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى) "اے موسیٰ! تم دونوں بھائیوں کا ربّ کون ہے؟" حضرت موسیٰؑ نے فرمایا:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى۝(۲۰/۵۰)

کہا کہ ہمارا ربّ وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی پیدائش عطا کی اور پھر اسے (اس کے کمال تک پہنچنے کی) راہ بتائی۔

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا:

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ۝(۲۶/۷۸)

اللہ وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور پھر وہی میری راہنمائی کرتا ہے۔

سورۂ اعلیٰ میں ہے:-

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى۝ وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى۝(۲-۳/۸۷)

خدا وہ ہے جس نے انسان کی تخلیق کی اور اس میں صحیح صحیح توازن رکھ دیا۔ پھر اس کی زندگی کے لئے پیمانے مقرر کر دیئے اور ان کی طرف اس کی راہ نمائی کر دی۔

ان آیات میں خَلَقَ اور هَدٰى پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ پروفیسر مارگن کے الفاظ (CREATIVE AND DICRCTIVE POWER) کیا انہی قرآنی الفاظ کا ترجمہ نہیں! غور کیجئے کہ قرآن، علمِ انسانی کو کن بلندیوں تک لے جاتا ہے؟ اگر ان محققینِ مغرب کے سامنے کہیں قرآن ہوتا تو ان کی راہیں کس قدر آسان ہو جاتیں؟ ان کی حالت یہ ہے کہ مدتوں غلط راستوں پر چلتے رہتے ہیں اور پھر ہزاروں ٹھوکریں کھا کر صحیح راہ پر آتے ہیں۔ اگر تلاشِ حقیقت کے اس بحرِ بے کنار میں قرآنی روشنی کے مینار ان کے سامنے ہوں تو ان کا ہر قدم منزل کی طرف بڑھے اور انہیں اندھیرے میں ٹکریں نہ مارنی پڑیں (لیکن اس بحث کا یہ مقام نہیں)۔

نفسِ انسانی کے متعلق جو کچھ گذشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے، اسے بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ حیات، ربانی توانائی (DIVINE DNERGY) کی مظہر ہے جو عالمگیر ہے اور ساری کائنات کی رگ و پے میں برقِ تپاں کی طرح جاری و ساری۔ جب حیات، شعور (CONSCIOUSNESS) سے متعارف (IDENTIFY) ہوتی ہے تو اس سے انسانی انا (HUMAN EGO) متشخص ہوتا ہے۔ شعور، انسان کی انفرادی (INDIVIDUAL) شے ہے۔ میرے دکھ اور درد کے احساس (FEELING) میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ دوسرے میرے ساتھ ہمدردی کر سکتے ہیں۔ میرے درد کا مداوا سوچ سکتے ہیں۔ لیکن میرے درد کے احساس میں شرکت نہیں کر سکتے۔ چونکہ نفسِ انسانی (EGO) حیات اور شعور کے تمسک و تعارف سے متشخص ہوتا ہے اس لئے یہ بھی انفرادی ہوتا ہے۔ اسی انفرادیت کی رُو سے یہ اپنا مستقل وجود رکھتا ہے۔ شعورِ انسانی میکانکی عملِ ارتقاء کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس لئے نفسِ انسانی بھی طبیعی ارتقاء کی تخلیق نہیں۔ پیکرِ انسانی اس ایگو کا ذریعۂ اظہار (VEHICAL) ہے اصل انسان یہی ایگو ہے۔

مستی ز بادہ می رسد و از ایاغ نیست
ہر چند بادہ نتواں خورد بے ایاغ

ایگو کی انفرادیت کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ اس لئے پیکر بدلنے سے کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔ شعورِ انسانی کے ظرف میں ایسی وسعتیں پیدا کی جا سکتی ہیں کہ حیات جس انداز میں مکمل طور پر اپنا نمود چاہتی ہے یہ اس کے قابل ہو جائے اسی کا نام استحکامِ خودی ہے۔

جب حیات اور شعور اپنی لامتناہیت (INFINITY) میں متعارف ہوتے ہیں تو اسے (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) آخری ایگو (ULTIMATE EGO) کہا جاتا ہے۔ وہ اس آخری ایگو کی بحث کے بعد لکھتے ہیں۔

ربانی توانائی کا ہر ذرّہ خواہ اپنے وجود کے اعتبار سے کیسا ہی ناچیز کیوں نہ ہو۔ ایک ایگو خودی ہے۔ لیکن خودی کی نمود (EPRESSION) کے مختلف

---

[1] دیکھئے اقبالؒ کا خطبۂ چہارم۔

> مدارج ہیں تمام دائرۂ ہستی میں، خودی کا تدریجی ارتقاء جاری و ساری ہے۔ حتیٰ کہ پیکرِ انسانی میں پہنچ کر یہ اپنی تکمیل حاصل کرلیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم آخری ایغو (UL TIMATE EGO) کو انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب بتاتا ہے۔
>
> (خطبات صفحہ ۶۸)

انسانی ایغو اپنے وجود، انفرادیت اور اختیار و ارادہ کی بناء پر عجیب و غریب صفات و خصوصیات (ATTRIBUTES AND CHARACTERS) کا حامل ہوتا ہے۔ جوں جوں اس میں استحکام اور وسعت پیدا ہوتی جائے، اس کی خصوصیات، آخری ایغو کی خصوصیات و صفات سے مشابہ ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن اگر اس میں ضعف اور اضمحلال پیدا ہوتا جائے تو یہ درجۂ انسانیت سے گر کر برباد ہو جاتا ہے۔ جن اعمال سے خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے انہیں اعمالِ صالحہ کہا جاتا ہے۔ جن سے اس میں ضعف آتا ہے وہ سیئات ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ۔

> دنیا میں دکھ پہنچانے والے یا آرام دینے والے اعمال نہیں ہوتے۔ صرف خودی کو مستحکم کرنے والے یا اسے تحلیل (DISSOLVE) کرنے والے اعمال ہوتے ہیں۔ یہ اعمال ہی ہیں جن سے اس میں مستقبل کی زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آجاتا ہے..... لہٰذا انفرادی بقا ہمیں بطور استحقاق نہیں مل سکتی۔ یہ ذاتی جدوجہد سے حاصل کرنی پڑتی ہے۔ انسان اس کے لئے امیدوار ہوتا ہے۔　　(خطبات، صفحہ ۱۱۳)

ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور گذشتہ صفحات میں نفسِ انسانی کے متعلق جو کچھ مغربی محققین کے خیالات سے مقتبس کیا گیا ہے اس پر پھر غائرانہ نگاہ ڈالئے بات واضح ہو جائے گی۔ (نفس کے متعلق مزید تفصیلات میں جانے کا یہ مقام نہیں جس سلسلہ میں یہ بات چھڑی ہے اس کے لئے اتنے سے اشارات کافی سمجھے جاتے ہیں)۔

گذشتہ صفحات میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی ہے کہ انسان کے پاس عقل (یعنی علم استدلالی) کے علاوہ کچھ اور بھی ہے جس پر عقل کے قوانین حکمرانی نہیں کرسکتے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا انسانی زندگی کے اس دائرے میں (جو عقل کی فرمانروائی سے باہر ہے) ادراکِ حقیقت کا امکان ہے؟ اس دائرے کے بلند ترین مقام کا نام "نفسِ انسانی" ہے (HUMAN EGO)۔ لیکن ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ انسان

ہی نہیں بلکہ حیوانات تک سے بعض افعال اس قسم کے سرزد ہوتے ہیں جو عقل کے تابع نہیں ہوتے۔ اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان سے جو ایسے اعمال سرزد ہوتے ہیں جو اس کی عقل کے تابع نہیں ہوتے وہ بالضرور اس کے نفس ہی کے مظاہر ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس قسم کے افعال (جو عقل کی فرمانروائی سے باہر ہیں) کس کس شعبے سے سرزد ہوتے ہیں۔ اس باب میں ہمارے سامنے سب سے پہلے وہ چیز آتی ہے جسے جبلّت (INSTINCT) کہتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ

جبلّت

وہ دائرہ ہے جس میں استدلال کو کوئی دخل نہیں۔ بلکہ اس کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب عقل و شعور ہنوز بیدار بھی نہیں ہوتے۔ انسان کے علاوہ باقی کائنات میں جبلّت ہی وہ چیز ہے جسے عام طور پر قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے جن کی رُو سے یہ تمام سلسلہ ایک نظم و ضبط کے تحت چلا جا رہا ہے۔ پانی جب تک سیّال ہے نشیب کی طرف بہتا ہے۔ جس قالب میں چاہیئے ڈھل جاتا ہے۔ ایک خاص درجۂ حرارت میں پہنچ کر، بھاپ بن کر اڑنے لگ جاتا ہے۔ تفریط کی طرف آیئے تو ایک خاص مقام پر سردی سے منجمد ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی جبلّت ہے۔ یہی اس کی "فطرت" ہے۔ آگ ہمیشہ حرارت پہنچاتی ہے۔ پتھر کو اوپر اچھالئے ہمیشہ نیچے کی طرف آتا ہے۔ اس کے بعد زندگی کی دنیا کی طرف آیئے۔ بط کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی پانی کی طرف دوڑتا ہے۔ لیکن مرغی کا بچہ پانی میں اپنی ہلاکت دیکھتا ہے۔ شیر بھوکوں مر جائے گا لیکن کبھی گھاس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ بکری کا بچہ جاں بلب کیوں نہ ہو کبھی گوشت کے پاس تک نہیں آئے گا۔ یہی ان کی جبلّت ہے جس کی خلاف ورزی کا انہیں اختیار نہیں۔ ہر ایک اس قانون کی اطاعت کر رہا ہے۔ وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (۱۶/۴۹ ؛ ۱۳/۱۵)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہے كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ ۝ سب اسی کے قانون کے تابع ہیں۔ جہاں تک انسان کی طبیعی زندگی کا

لے ہمیں اس مقام پر مسئلہ تعیین اور غیر تعیین (DETERMINISM AND INDETERMINISM) کی اس کشمکش میں نہیں الجھنا چاہیئے جو اس باب میں یورپ کے مفکرین و محققین کی بحث و تمحیص کا مرکز بن رہی ہے۔ ہم صرف اس عمومی حالت کا ذکر کر رہے ہیں جو ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ (نہ کہ برقیات کے قانونِ حرکت و گردش کا)۔

تعلق ہے۔ اس کا بچہ بھی ان چیزوں کو جبلّی طور پر اختیار کر لیتا ہے۔ انسان کا بچہ بھی پیدا ہوتے ہی اپنی خوراک کے سرچشموں کی طرف لپک کر جاتا ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ اُس نے عقلاً یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسے ایسا کرنا چاہیئے بلکہ اس لئے کہ اُس کے اندر خود بخود" بلا استدلال "اس قسم کی ایک امنگ (URGE) پیدا ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کیا جبلّت اس مسئلہ کا حل پیش کر سکتی ہے جو ہمارے پیشِ نظر ہے؟

طبیعی زندگی کے قوانین

جہاں تک انسان کی طبیعی زندگی کا تعلق ہے۔ یہ بھی حیوانات کی طرح طبیعی قوانین کے تابع ہے۔ بھوک، پیاس، تکان، نیند، سلسلۂ تولید وغیرہ میں دونوں پر ایک ہی قسم کے قوانین حاوی ہیں۔ لیکن انسان کو ساتھ ہی اختیار و ارادہ بھی دیا گیا ہے۔ اگرچہ اپنی طبیعی زندگی میں یہ اپنے اختیار و ارادہ کو زیادہ استعمال میں نہیں لاتا، کہ قوانینِ طبیعی کی خلاف ورزی کی سزا فوراً مل جاتی ہے۔ بایں ہمہ اس کے اختیار و ارادہ کے مظاہرات ہر وقت ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ انسان کا بچہ بھی اپنی پیدائش کے ساتھ ہی اپنی خوراک کے سرچشموں کی طرف اسی طرح لپک کر جاتا ہے جس طرح بکری کا بچہ۔ لیکن، انسان کے بچے کی ساتھ ہی یہ حالت بھی ہے کہ جو چیز اس کے سامنے آئے۔ مفید ہو یا مضر، حیات آفریں ہو یا ہلاکت انگیز بلا تکلف مُنہ میں ڈال لیتا ہے۔ اسی لئے جب بچہ ذرا گھٹنیوں چلنے لگتا ہے تو اس کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کبھی آگ میں ہاتھ ڈال دیا۔ کبھی پانی میں ڈبکیاں لینے لگا۔ کہیں اس چیز کو نگل گیا۔ حیوانات کے بچوں کی یہ کیفیت کبھی نہیں ہوتی۔ اور ایک بچپن پر ہی کیا موقوف ہے۔ انسان کے ساتھ بڑھاپے تک تمام سفرِ حیات میں قدم قدم پر یہی ہوتا ہے۔ ساری زندگی خلافِ فطرت، اور اس کا نتیجہ، ہزاروں قسم کی بیماریاں۔ ہماری اپنی تو یہ حالت تھی ہی۔ ہم نے جن جانوروں کو اپنے قریب لا کر گھریلو (DOMESTIC) بنایا۔ اپنے اغراض و مقاصد کی خاطر آہستہ آہستہ ان کی طرزِ زندگی کو بھی ایسا بدلا کہ انہیں بھی اپنے جیسے عوارض و آلام کا شکار بنا دیا۔

جب انسان کا اپنی طبیعی زندگی میں یہ عالم ہے تو اس کی عائلی، معاشرتی، تمدنی، معاشی، سیاسی زندگی میں جو کیفیت ہوگی وہ محتاجِ تفصیل نہیں۔ کائنات کی دیگر اشیاء اور انسانی زندگی کا یہی فرق ہے جسے ان بصیرت افروز الفاظِ قدسی میں بیان کیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝ (۲۲/۱۸)

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ آسمان اور زمین کی ہر چیز، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور بعض انسان بھی خدا کے حضور میں سجدہ ریز ہیں۔ (اسی کے وضع کردہ قوانینِ فطرت پر عمل پیرا ہو کر اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا مظاہرہ کر رہے ہیں)۔ بعض انسان ایسے بھی ہیں جو قانونِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں اور (یہی وہ) لوگ ہیں جن پر عذابِ خداوندی مقدّر ہو چکا ہے (ان کے لئے کامیابی و کامرانی کے بجائے ہر قسم کی ذلت و رسوائی منتظر ہے) اور (ظاہر ہے کہ) جسے خدا کا قانون رسوا کر دے تو اس کے لئے عزّت دینے والا (کون ہو سکتا ہے؟) کوئی بھی نہیں۔ (یہی خدا کا قانون ہے جو اٹل ہے۔ نہ یہ کسی کی سفارش سے تبدیل ہو سکتا ہے نہ کسی کے جبر سے)۔ یہ قوانین خدا کے اقتدارِ مطلق کی رُو سے وضع ہوئے ہیں۔

ضمیر کی آواز

لیکن جو سوال ہمارے سامنے ہے اس میں حیوانی زندگی چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ اس سوال کی تو ابتدا ہی منزلِ انسانیت سے ہوتی ہے۔ لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ کیا وادیِ انسانیت میں جبلّت کی راہنمائی کافی ہو سکتی ہے؟ تمدّنی زندگی میں انسانی معاملات، اخلاقیات (ETHICS) کے دائرہ میں آتے ہیں۔ اور اخلاقیات کے دائرہ میں جبلّت کا نام ضمیر (CONSCIENCE) کی آواز ہے۔ لہٰذا بات یہاں تک پہنچی کہ کیا تنہا "ضمیر کی آواز" اس قابل ہے کہ انسان کی صحیح راہنمائی کر سکے؟ کیا یہ خیر و شر کی تعیین و تفریق کا قابلِ اعتماد معیار قرار پا سکتی ہے؟ کیا ادراکِ حقیقت اس کے بس کی بات ہے؟

یہ امر بدیہی ہے کہ اخلاقی مقتضیات انسان سے شروع ہوتے ہیں۔ ایک بکری کی جبلّت میں ہے کہ وہ گھاس کھائے۔ گوشت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ لیکن یہ اس کی جبلّت میں نہیں کہ وہ گھاس اپنے ہی مالک کے کھیت سے چرے۔ دوسرے کے کھیت میں نہ جا گھسے۔ یہ تقاضا انسان سے شروع ہوتا ہے۔ عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کے اندر ایک قوّتِ تمیز موجود ہے جو اسے بتا دیتی ہے کہ جائز کیا

ہے اور ناجائز کیا؟ اس قوتِ تمیز کا نام "ضمیر" .(CONSCIENCE) رکھا گیا ہے. اس کو انسان کے اندر کی آواز یا دل کا فتویٰ کہا جاتا ہے. لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقعہ انسان کے اندر کوئی ایسی قوتِ تمیز ہے جو اسے جائز اور ناجائز کا فرق بتا دے! یہ بات بادنیٰ تعمق سمجھ میں آجائے گی کہ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو حق اور باطل، خیر اور شر، جائز اور ناجائز میں تمیز کر سکے. اس میں شبہ نہیں کہ انسان کے اندر سے ایک آواز ضرور اٹھتی ہے جو اسے بعض کاموں سے روکتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ آواز حق اور باطل کی تمیز بھی کرتی ہے. مشاہدہ اس کا جواب نفی میں دیتا ہے. یہ ظاہر ہے کہ حق اور باطل مطلق اقدار (ABSOLUTE VALUES) کا نام ہے، اضافی اقدار (RELATIVE VALUES) کا نام نہیں. یعنی حق کے یہ معنی نہیں کہ وہ ایک انسان کے لئے حق ہو اور دوسرے کے لئے حق نہ ہو۔ اگر انسان کے اندر کوئی ایسی قوت ہے جو حق و باطل میں تمیز کر سکتی ہے تو ظاہر ہے کہ ہر انسان کے اندر سے یکساں اٹھنی چاہیئے. لیکن ایسا نہیں ہوتا. ہم دیکھتے ہیں کہ گوشت کھانے والے خاندان کے بچے کے سامنے جب گوشت آتا ہے تو اس کی ضمیر اسے بالکل نہیں ٹوکتی. لیکن ایک سبزی خور گھرانے کے بچے کے سامنے گوشت کا نام آجانے سے اس کی طبیعت ابا کرنے لگتی ہے. جرائم پیشہ قبائل (مثلاً ٹھگوں) کے بچے بلا تکلف انسان کی جان لے لیتے ہیں اور اس میں لذت محسوس کرتے ہیں. لیکن جینیوں کا بچہ کیڑوں کوڑوں کو بھی ایذا نہیں پہنچاتا. اس میں شبہ نہیں کہ نفسِ لوّامہ برائی سے روکتا ہے۔

وَ لَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (۷۵/۲)

اور نہیں۔ میں انسان کے احساسِ ندامت کو شہادت میں پیش کرتا ہوں۔

لیکن اُسی برائی سے جسے وہ برائی سمجھتا ہے. اس نفس میں لوامیت کا جوہر تو ہے. لیکن وہ اسی چیز کے خلاف ملامت کرتا ہے جسے اس نے (مختلف اثرات کے ماتحت) قابلِ ملامت سمجھ رکھا ہے. لہٰذا جس چیز کو "ضمیر کی آواز" کہا جاتا ہے. وہ حق و باطل کی تمیز کا معیار نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ "آواز" خارجی اثرات سے متأثر ہوتی ہے. (SAMUEL) اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

اگر یہ صحیح ہوتا کہ انسان کے اندر ایک ایسی فطری جبلّت ہے جو (تمام اثرات) سے آزاد ہے اور حق و باطل کے فیصلہ میں کبھی غلطی نہیں کرتی تو نیک عملی کے ہر معاملہ میں

تمام انسان ہمیشہ متفق ہوا کرتے اور آج بھی متفق نظر آتے. لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی ہم آہنگی نہ کبھی پہلے ہوئی ہے اور نہ آج ہے. اس سے ظاہر ہے کہ کسی آدمی کا یہ کہنا کہ "میں نے فلاں بات کو نہایت دیانتداری سے حق سمجھ کر اختیار کیا ہے" اس بات کو فی الحقیقت حق نہیں بنا سکتا.

لہٰذا جس چیز کا نام ضمیر رکھا جاتا ہے وہ ان اثرات سے مرتب ہوتی ہے جو انسان غیر شعوری طور پر وراثت، ماحول، تربیت اور تعلیم سے اخذ کرتا ہے. اس کے علاوہ اس کا اپنا وجود کچھ نہیں ہوتا. اقبالؒ کے الفاظ میں ضمیر (INTERNALISED SOCIETY) کا نام ہے. لہٰذا ضمیر میں یہ صلاحیت کہاں ہو سکتی ہے کہ وہ حق اور باطل، خیر اور شر، غلط اور صحیح کا امتیاز کر کے بتا دے.

ذوق جبلت کے بعد ہمارے سامنے علم غیر استدلالی کا ایک اور میدان آتا ہے. آپ نے اکثر دیکھا ہوگا. ایک شخص کے دو بچے ہیں. وراثت و ماحول کے اعتبار سے انہیں (قریب قریب) یکساں ہونا چاہیئے. لیکن ان میں سے ایک طبعاً (از خود) شاعری کا ذوق رکھتا ہے اور دوسرے کو اس سے قطعاً کوئی لگاؤ نہیں. ایک شخص کو آپ دیکھیں گے کہ کوئی عمدہ سی تصویر اس کے سامنے آجائے وہیں ٹھٹک کر رہ جائے گا اور دنیا جہان سے بے خبر، پہروں کھڑا رہے گا. لیکن باقی دنیا اس کے پاس سے یوں گذرتی جائے گی گویا وہاں کوئی چیز وجہ جاذبیت نہیں. وقس علیٰ ہذا. یہ "ذوق کی دنیا" "استدلال کی دنیا سے بالکل الگ ہے. علم الحیات کی اس وقت تک کی تحقیقات یہ نہیں بتا سکیں کہ ذوق کا یہ اختلاف کس طرح پیدا ہوتا ہے. کسی اچھے گانے والے کے ایک الاپ سے آپ کے رگ و پے میں کیف و سرور کی ایک دنیا رقصاں و جنباں نظر آتی ہے لیکن آپ کسی دوسرے کو کبھی نہیں سمجھا سکتے کہ ایسا کیوں اور کس طرح ہوتا ہے. زیادہ سے زیادہ آپ فنِ موسیقی کے بعض قواعد و اصطلاحات کو سمجھا سکیں گے. لیکن اس دوسرے پر وہ اثر کبھی مرتب نہیں ہو سکے گا جو آپ پر ہوا. اس کے اصرار پر آپ یہی کہیں گے کہ

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی!

کیف و سرور کی اس دنیا کے جرعاتِ نشاط آور و بہجت آگیں، عقل کے پیمانوں سے نہیں ماپے جا سکتے. جس کا تعلق ذوق سے ہے."

مختلف افراد میں، اختلافِ ذوق کی وجہ کیا ہے، اس کی بابت، انسان کی طبیعی زندگی سے متعلق علوم ابھی تک کچھ نہیں بتا سکے۔ دورِ حاضر میں، علم النفس کے ماہرین نے ان امور کو اپنی تحقیق و تفحیص کی آماجگاہ بنایا ہے، لیکن اس باب میں حتمی طور پر وہ بھی کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ پائے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسانی بچہ ہنوز اپنے گہوارہ میں ہوتا ہے اور بولنا بھی نہیں سیکھتا، وہ اپنے ماحول کے نقوش اپنے تحت الشعور میں جذب کئے چلا جاتا ہے اور اس طرح اپنے عادات و خصائل اور سیرت و کردار کی رُو سے وہ کچھ بن چکتا ہے جو کچھ اسے آگے چل کر بننا ہوتا ہے۔ یا یوں کہئے، کہ اس کی مستقبل کی زندگی کی بنیادیں بچپن کے ابتدائی دو تین سال میں رکھی جا چکتی ہیں۔ ان کا اندازہ یہ ہے کہ اختلافِ ذوق بھی انہی غیر شعوری نقوش کے مظاہر کا نام ہے۔

لیکن انسانی (یا انفرادی) ذوق کی کیفیت و ماہیت کچھ ہی ہو، یہ واضح ہے کہ جبلت و ضمیر کی طرح یہ چیز بھی ادراکِ حقیقت کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

وجدان

ذوق کے علاوہ، ایک اور شے بھی ہے جس کا تعلق (بظاہر) استدلالی دنیا سے نہیں۔ اسے وجدان یا (INTUTION) کہا جاتا ہے۔ مثلاً، آپ کے سامنے کوئی معاملہ آتا ہے۔ آپ استدلالات کی کڑیاں عبور کئے بغیر، یونہی بلا سوچے سمجھے کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں اور وہ اکثر صحیح نکلتا ہے۔ شاعری کی دنیا میں جسے آمد کہتے ہیں اس کا تعلق بھی وجدان سے ہے۔ اسی کے لئے غالب کہتا ہے کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

عرب اسے ہاتف کہہ کر پکارتے ہیں۔ فکری دنیا ابھی تک وجدان کے متعلق بھی نہیں بتا سکی کہ اس کی ماہیت کیا ہے لیکن ہمارے دور کا وجدان کا سب سے بڑا موید، برگسان، اسے (A HIGHER KIND OF INTELLECT) ایک بلند نوعِ فکر ہی قرار دیتا ہے جو فکری ارتکاز (CONCENTRATION) یا ممارست کا غیر شعوری نتیجہ ہوتی ہے۔ مثال سے یوں سمجھئے کہ انسان جب بات کرتا ہے تو اس کے اندر کئی ایک صلاحیتیں بیدار ہوتیں اور رو بہ عمل آتی ہیں۔ وہ پہلے سوچتا ہے کہ مجھے کیا کہنا ہے۔

پھر اس کے لئے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے۔ پھر ان الفاظ میں ایک ربط پیدا کر کے انہیں فقروں کی لڑی میں پروتا ہے۔ اس کے بعد ان فقروں کو زبان سے ادا کرتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ انسان کو ایک فقرہ بولنے کے لئے کس قدر کاوش کرنی پڑتی ہے۔ جب کوئی بچہ پہلے پہل بولنا سیکھتا ہے تو اس کی یہ کاوش نمایاں اور محسوس طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ لیکن آپ کسی شعلہ نوا مقرر کو دیکھئے۔ وہ دو تین سو لفظ فی منٹ کی رفتار سے بولتا ہے، اور گھنٹوں مسلسل بولتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے موضوع کے متعلق سوچتا بھی ہے۔ اس کے اظہار کے لئے الفاظ کا انتخاب بھی کرتا ہے۔ ان لفظوں کو فقروں میں مربوط بھی کرتا ہے۔ پھر ان فقروں کو زبان سے اس طرح ادا کرتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ تلفظ نہ بگڑنے پائے بلکہ جن جذبات کے اظہار کا وہ ذریعہ ہیں، آواز کے زیر و بم اور شگفت و گداز سے ان کی بھی پوری پوری نمود ہوتی چلی جائے۔ وہ یہ سب کچھ برق رفتاری کے ساتھ کئے چلا جاتا ہے اور سامعین تو ایک طرف، خود اسے بھی اس کا علم و احساس نہیں ہوتا کہ وہ کب سوچتا ہے۔ کس طرح الفاظ کا انتخاب کرتا ہے۔ کب ان لفظوں کو فقروں کے قالب میں ڈھالتا ہے اور پھر کس طرح دریا کی سی روانی کے ساتھ انہیں ادا کئے چلا جاتا ہے۔ اس کے اس عمل میں کہیں فکری کاوش نظر نہیں آتی۔ لیکن ہوتا یہ سب کچھ فکری کاوش ہی کی رُو سے ہے۔ فکری کاوش میں ممارست سے انسان میں اس قسم کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جب اپنی توجہ کو کسی موضوع پر مرتکز کرتا ہے تو غیر شعوری طور پر اس کے ذہن کی مشینری کے مختلف پُرزے بیک وقت حرکت میں آجاتے ہیں اور اس تیزی سے حرکت کرتے ہیں کہ فکر کی عام سُست خرامی اس حرکت کا احساس نہیں کر سکتی۔ بعینہٖ جس طرح پانچ ہزار فی سیکنڈ کی رفتار سے گردش کرنے والے پہیئے کی حرکت، تیز سے تیز نگاہ بھی محسوس نہیں کر سکتی۔ وہ ساکن نظر آتا ہے۔ دورِ حاضر کے علم النفس کی تحقیق یہ ہے کہ ہماری معلومات، نفسِ غیر شعوری کے ریکارڈ روم سے اُبھر کر شعور کی سطح پر آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ شعور کی مشینری کی رفتار جس قدر تیز ہو گی اسی قدر سرعت کے ساتھ یہ ذخیرہ، شعور کی سطح پر آتا جائے گا۔ اور (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) اگر اس مشینری کی حرکت کی رفتار برق پا ہے تو شعور کو اس کا احساس بھی نہیں ہونے پاتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اسے یاد بھی نہیں پڑتا کہ وہ معلومات اسے کب حاصل ہوئی تھیں۔ فراموش شدہ حکایتیں، از یاد رفتہ واقعات و حوادث، طاقِ نسیاں کی زینت وادہ تشبیہات و تمثیلات، فضا کی پہنائیوں میں گم گشتہ اشعار و اقتباسات، یوں سامنے آتے چلے جاتے ہیں گویا ان کا کہیں سے "نزول" ہو رہا ہے۔

حالانکہ ان کا کہیں خارج سے نزول نہیں ہوتا؛ تحت الشعور کی گہرائیوں سے صعود ہوتا ہے. اسی کو (عصر حاضر کی نفسیاتی تحقیقات کی رُو سے) وجدان کہا جاتا ہے.

لیکن وجدان کی ماہیت کچھ بھی ہو یہ ظاہر ہے کہ یہ ملکہ بھی، ادراکِ حقیقت کا ذریعہ نہیں بن سکتا.

نابغہ جس شخص میں وجدانی کیفیت زیادہ شدت سے رونما ہو اسے نابغہ (GENIUS) کہہ کر پکارا جاتا ہے. نابغہ میں یہ خصوصیات کس طرح اس انتہا تک پہنچتی ہیں؛ یہ معمہ بھی دنیائے سائنس میں ہنوز محتاجِ کلید ہے. علمائے علم الحیات (BIOLOGIST) ایسے لوگوں کے دماغ کی کھوپڑیاں لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان کے بھیجے کے خلیات (CELLS) کی ساخت اور امتزاج کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتے رہتے ہیں. لیکن یہ حضرات جب ابھی تک یہی معلوم نہیں کر سکے کہ انسان میں خود فکری صلاحیت (INTELLECT) کہاں سے آتی ہے یا کس طرح پیدا ہوتی ہے تو یہ نابغہ کی خصوصی صلاحیت کی کنہ و ماہیت کے متعلق حتمی طور پر کیا کہہ سکیں گے؟ وہ اس وقت تک اس سلسلہ میں جو کچھ کہہ سکے ہیں فقط اتنا ہے کہ یہ ایک "فجائی ارتقاء" (EMERGENT EVOLUTION) ہے جو میکانکی سلسلۂ ارتقاء کے حدود سے باہر ہے.

> تیس سال کے گہرے تجربہ نے اس امر کے لئے بیّن ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر مخلوط نسل کے انسانوں کے اندر اس قسم کے افراد پیدا ہو جاتے ہیں جن کے متوارث خصائص (اپنے آباء و اجداد سے) بالکل مختلف ہوتے ہیں. ان افراد کو (MUTANTS) یا (SPORTS)[1] کہا جاتا ہے.
>
> (THE NATURL OF LIVING MATTER; BY L. HOGBEN)

---

[1] یہ (SPORTS) صرف نوعِ انسانی ہی میں پیدا نہیں ہوتے بلکہ نباتات اور حیوانات میں بھی ایسا ہوتا ہے. عام طور پر ایک پھول کے بیج سے ایک ہی قسم کے پھول پیدا ہوتے ہیں. لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسی بیج سے ایک الگ قسم کا پھول پیدا ہو جائے اسے SPORT کہتے ہیں. اور اربابِ ذوق اس کی تلاش میں رہتے ہیں.

پروفیسر (TAYLOR) اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

ان تمام اسباب و علل کا جن سے کوئی شے وجود پذیر ہوتی ہے، ہر ممکن محاسبہ کر لینے کے بعد بھی یہ حقیقت باقی رہ جاتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ شے اپنے نشوونما کے بعد ایک ایسی خصوصیت کی مظہر بن جائے جو ان عناصر میں کہیں بھی نہ ہو جن سے اس شے نے ترکیب پائی تھی۔ یہ خصوصیت ایسی ہوتی ہے کہ ان تمام عناصر کی خصوصیات کا علم حاصل ہو جانے کے بعد بھی اس نرالی خصوصیّت کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(EVOLUTION IN THE LIGHT OF MODERN KNOWLEDGE)

(C. LLIYD MORGAN) اس باب میں لکھتا ہے۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ جس چیز کو تم فجائی EMERGENT کہتے ہو وہ بالآخر ہے کیا؟ تو اس کا مختصر جواب فقط اتنا ہے کہ یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں، تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ ان کی خصوصیات کے متعلق ان کے ظہور پذیر ہونے سے پیشتر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(EMERGENT EVOLUTION)

"فجائی ارتقا" کے نظریہ اور اس کی تائید میں محسوس شواہد و نظائر نے کائنات کے متعلق میکانکی تصوّر کی بنیادیں تک ہلا دی ہیں۔ اس مقامِ تحیّر پر پہنچ کر، اس حقیقت کے اعتراف کئے بغیر بن نہیں پڑتی کہ

علّت و معلول کی زنجیر میں بعض اوقات ایسے مستثنیات آتے ہیں جنہیں صرف دستِ قدرت ظہور میں لا سکتا ہے۔ (SEMUEL)

ماہرینِ علم الحیات کی اس بے بسی کے پیشِ نظر، اب علمائے علم النفس نے اس موضوع کو اپنی مژگانِ کاوش و خدنگِ تحقیق کا ہدف قرار دے لیا ہے۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ یہ خصوصیت درحقیقت وجدان ہی کی افراطی شکل ہے۔ جب ہم وجدان کے متعلق یقینی نقطہ تک پہنچ جائیں گے تو نابغہ کی خصوصیات کا مسئلہ بھی خود بخود حل ہو جائے گا۔

لیکن ان علوم کی تحقیقات کس نتیجہ پر پہنچیں، جس مقصد کے لئے ہم نے اس بحث کو چھیڑا ہے، وہ واضح ہے۔ یعنی یہ کہ ادراکِ حقیقت ایک نابغہ کے بس کی بھی بات نہیں۔ بلکہ نابغہ بے چارہ تو اس

باب میں عمومی اربابِ فکر کے مقابلہ میں بڑی (DISADVANTAGEOUS POSITION) میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے خاص فن میں تو نابغہ ہوتا ہے لیکن زندگی کے دوسرے گوشوں میں بالکل کورا۔ حالانکہ جسے "حقیقت" کا علم ہو، اسے ہر شعبۂ حیات میں "نابغہ" ہونا چاہیئے، اس لئے کہ حقیقت ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے جسے مختلف حصوں میں بانٹا نہیں جا سکتا۔ جسے حقیقت کا علم ہو، اس کی یہ کیفیت ہو نہیں سکتی کہ وہ زندگی کی کسی ایک شاخ پر تو گلِ سرسبد ہو اور اس کی باقی شاخیں خزاں دیدہ ہوں۔ اصل یہ ہے کہ نابغہ کی نشوونما یک طرفہ (LOP-SIDED) ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی زندگی میں اعتدال اور توازن نہیں ہوتا۔

نابغہ تو ایک طرف رہا، مختلف علوم (SCIENCES) بھی حقیقت کے ایک ایک رُخ ہی کو دیکھتے ہیں، اور جب وہ اسی اصول کے مطابق انسان کا مطالعہ کرتے ہیں، تو اسے ایک مشین سمجھ کر، اس کے الگ الگ پرزوں کے متعلق تحقیق کرتے ہیں۔ مشین کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کے مختلف پرزوں کو جوڑنے سے مشین مکمل ہو جاتی ہے لیکن انسانی زندگی کی یہ کیفیت نہیں۔ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ آپ سیرتُ کردار، جذبات و عواطف، میلانات و رجحانات کا الگ الگ مطالعہ کریں اور پھر اس کے حاصل جمع کا نام فرد رکھ لیں۔ وہ فرد ان کے حاصل جمع سے مرکب نہیں ہوگا۔ انسانی ذات منفرد حقیقت کا نام ہے اور منفرد حقیقت نہ اجزا میں بٹ سکتی ہے اور نہ ہی اجزا کو یک جا کرنے سے وجود میں آ سکتی ہے۔ علم وہی علم کہلائے گا جو انسان کو تماماً (MAN AS A WHOLE) کو دیکھے اور سمجھے۔ نابغہ کہ جس کی صلاحیتوں کی نشوونما صرف یک طرفہ ہوتی ہے، اس قابل ہی نہیں ہوتا کہ وہ انسان کا مطالعہ بتمامہٖ کر سکے یا حقیقت کے متعلق کاملیۃً علم حاصل کر سکے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، نبوغ درحقیقت وجدان ہی کی شدّت کا نام ہے، اور جب وجدان خود ادراکِ حقیقت نہیں کر سکتا، تو نابغہ کے لئے یہ کیسے ممکن ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک نابغہ کی برق رفتار صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن وہ کاروانِ انسانیت کا راہ نما نہیں بن سکتا۔

اس سے بھی آگے بڑھئے تو غیر استدلالی علم کا ایک اور میدان سامنے آتا ہے۔ یہ وہ میدان ہے

جس میں قوّتِ خیال یا ارادہ (یا قوتِ نفس) کے مظاہر دکھائی دیتے ہیں. ہمارے ہاں اسے دنیائے تصوّف کہا جاتا ہے. لیکن چونکہ تصوّف سے ذہن ایک خاص منظّم ادارہ (SYSTEMISED INSTITUTION) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اس لئے بہتر ہے کہ ہم اسے

تصوّف

اصطلاحی نام سے نہ پکاریں. انگریزی میں اسے (MYSTICISM) باطنیت کہا جاتا ہے. لیکن کسی اور مناسب لفظ کے فقدان کی وجہ سے ان کے ہاں باطنیت کا دامن، نبوّت کو بھی اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے. اس لئے اس لفظ (MYSTICISM) سے ایک غلط فہمی کا اندیشہ ہے (اور یہ اندیشہ مزعومہ نہیں. اکثر دیکھا گیا ہے کہ جن حضرات نے ان امور کا مطالعہ صرف انگریزی زبان کی وساطت سے کیا ہے وہ تصوف اور نبوّت کے خصائص و کوائف اور احوال و ظروف میں فرق نہیں کرتے. اور اس طرح ایک عجیب چکّر میں اُلجھے رہتے ہیں). تصوف دراصل "گیان دھیان" کی دنیا ہے جس کا تعلّق قوتِ نفس کے شواہد و مظاہر سے ہوتا ہے. سہولتِ بیان کی خاطر (بنا برمجبوری) ہم اسے "باطنیت" کے لفظ سے تعبیر کریں گے. تاریخِ انسانی کے کسی دَور پر نگاہ ڈالیئے. اس علم کے مظاہرے ہر ملک اور ہر زمانہ میں دکھائی دیں گے.[1] علمی اعتبار سے دیکھئے تو قوتِ ارادی کے ابتدائی مراحل "خود ایمائیت" (AUTO SUGGESTION) سے لے کر اس کے آخری مراحل تک ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں. جبلّت اور وجدان کے متعلق ہم نے دیکھا ہے کہ وہ وراثت یا ماحول کا نتیجہ ہیں. کسب و ہنر کو ان میں کچھ دخل نہیں. لیکن باطنیت ایک اکتسابی فن ہے. چیلہ اپنے گرد سے، مرید اپنے پیر سے، شاگرد اپنے استاد سے[2]، اس فن کی باقاعدہ تحصیل کرتا اور مختلف قواعد و ضوابط کے ماتحت ریاضتوں اور مشقتوں سے اس قوت میں

یہ اکتسابی فن ہے

اضافہ کرتا چلا جاتا ہے. یہ ریاضتیں اور مشقتیں، انسان کی قوتِ ارادی (WILL POWER) یا ارتکازِ نفس (CONCENTRATION OF MIND) میں اضافہ کرتی ہیں جس سے، اس کے

---

[1] چونکہ اس وقت اس موضوع پر خالص علمی اور تاریخی اعتبار سے گفتگو ہو رہی ہے اس لئے اسے عقائد کے چشمہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے.

[2] یورپ اور امریکہ میں اس کے لئے باقاعدہ درسگاہیں (INSTITUTIONS) کھلی ہوئی ہیں.

عامل سے اس قسم کے غیر معمولی کارنامے ظہور میں آتے ہیں جنہیں ہمارے ہاں روحانیت کے کرشمے یا کرامات سمجھا جاتا ہے لیکن مغرب میں اسے ہپناٹزم کہا جاتا ہے اور اسے ایک سائنس کے طور پر سیکھا جاتا ہے. اور ہسپتالوں میں اس سے بہت کام لیا جاتا ہے. اس کا تعلق درحقیقت علم النفس سے ہے. یورپ کا علم النفس (PSYCHOLOGY) ہنوز اپنے عہدِ طفولیت میں ہے. اگرچہ عہدِ حاضر میں اس کے جلیل القدر ائمہ ہوگزرے (اور موجود) ہیں. بایں ہمہ' ان کے ہاں انسانی نفس کی کیفیات' اس کے تأثرات و ماجریات' اقسام و مدارج اور طبقات و اطوار کے متعلق تو بحثیں ہوتی ہیں لیکن خود نفسِ انسانی کے متعلق انہیں بھی کچھ معلوم نہیں کہ یہ ہے کیا؛ باقی رہے "اربابِ حال" (خواہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں) وہ خود حیرت کی وادیوں میں گم ہیں. ان کے متعلق کہا جاتا ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ

کاں راکہ خبر شد خبرش باز نیامد

اس لئے نفس کی کنہ و حقیقت کے خیال کو چھوڑ کر دیکھنا یہ چاہیئے کہ یہ علم ہمارے اس سوال کا حل بتا سکتا ہے جو اس بحث کا مرکز ہے؟

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' حقیقت' کُلّی وحدت ہے اور ناقابلِ تقسیم. اس لئے جس آنکھ کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو' زمان و مکان کے بُعد و فصل کے باوجود' اس کا نتیجہ مستخرجہ ہر مقام پر ایک ہونا چاہیئے. لیکن آپ تاریخ کے اوراق کو الٹ کر دیکھئے یا اپنے دَور پر نگاہ ڈال کر آپ دیکھیں گے کہ مدعیانِ کشف کے تجرباتی نتائج ایک دوسرے سے مختلف[1] ہوں گے. (WILLIAM JAMES) اپنی مشہور کتاب (THE VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE) میں اس موضوع پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

---

[1] اکثر اوقات یہ اختلافات جزئی نہیں بلکہ اصولی ہوتے ہیں. ہمارے ہاں وحدتِ وجود (ابنِ عربیؒ) اور وحدتِ شہود (امام سرہندیؒ) کے نظریات ایک دوسرے کی ضد ہیں. شاہ ولی اللہؒ نے ان میں باہمی توافق و تطابق کی کوشش کی ہے لیکن وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں' اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں؛ پھر یہ چیز بھی عجیب ہے کہ اس دنیا کا تعلق یکسر وارداتِ قلب سے ہے لیکن اس موضوع پر بحث فلسفیانہ کی جاتی ہے. یہ لوگ عقل کی تنقیص خود عقلی دلائل سے کرتے ہیں!

ان لوگوں کے خوابوں اور پیغاموں میں بعض بے حد حماقت آمیز ہوتے ہیں۔ ان کے عالمِ وجد و مستی کے ماجریات میں سے بعض، انسانی اعمال و سیرت کے لئے کسی نفع کا موجب نہیں ہوتے۔ لہذا انہیں خدائی پیغامات وغیرہ کہنا تو ایک طرف وہ اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ انہیں کوئی اہمیت دی جاتے...... علاوہ بریں، باطنیت کا فن ایک انفرادی چیز ہے اور اس کے نتائج ایسے متضاد و متبائن کہ انہیں "عالمگیر سند" کی حیثیت حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔

کشف حجّت نہیں

اسی لئے خود اہلِ تصوّف کے ہاں بھی کسی کا کشف، کسی دوسرے کے لئے سند و حجّت قرار نہیں پا سکتا۔ حتیٰ کہ خود صاحبِ کشف کے لئے بھی نہیں۔ اس لئے کہ اس حقیقت کے پرکھنے کے لئے اس کے اپنے پاس بھی کوئی معیار نہیں ہوتا کہ وہ کشف کن میلانات و عواطف اور رجحانات، وو ساوس کا نتیجہ ہے۔ "رحمانی الہام" کے ساتھ "شیطانی الہام" ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ علم النفس، بالخصوص علم تحلیلِ نفسی (PSYCHO ANALYSIS) نے اس باب میں مفید خدمات انجام دی ہیں۔ وہ نفسِ انسانی کے امیال و عواطف کا تجزیہ کر کے بتاتا ہے کہ فلاں قسم کے خواب یا مکاشفہ کی اساس کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک تو یہ فن ہنوز اپنے عہدِ طفولیت میں ہے۔ دوسرے اس کی بنیاد میں بعض اینٹیں ایسی غلط رکھی گئی ہیں جن سے اس کی عمارت کے بعض گوشے کبھی قابلِ اعتماد نہیں قرار پا سکتے۔ بالخصوص ڈاکٹر فرائڈ کا یہ نظریہ کہ تمام نفسی رجحانات و محرّکات کا سرچشمہ عام طور پر (کسی نہ کسی شکل میں) جنسی تحریک (SEX IMPULSE) ہے اس لئے یہ حقیقت ابھی تک اپنی جگہ پر ہے کہ اربابِ کشف کے دعاوی کے پرکھنے کا کوئی معیار اس فن میں موجود نہیں اس لئے متضاد و متبائن نتائج کے حامل سب اپنی اپنی جگہ حقیقت کے مدعی ہیں اور کوئی ان کی تکذیب و تردید نہیں کر سکتا۔ اگر ایک اس کی تردید کرتا ہے تو دوسرا اس کی تائید کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے باہمی صلح جوئی کی شکل یہ پیدا کی ہے کہ سب دعاوی اپنی اپنی جگہ برحق ہیں، فرق صرف اظہارِ بیان میں ہے اس مقصد کے لئے ("جمنا ایک گھاٹ بہتیرے" جیسی) سطحی شاعرانہ تشبیہات و استعارات سے عوام کے بہلاوے کا سامان مہیا کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان مختلف مسالک و مشارب کا بدقّتِ نظر مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ان میں باہمی اختلاف، طرق و اسالیب کا نہیں بلکہ اصل و حقیقت

کلہے۔ پھر مشکل یہ ہے کہ اس باب میں ردّ و قبول (بلکہ حقّ و باطل) کا معیار "کرامات" قرار پاچکا ہے۔[1]
اور یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ان چیزوں کے لئے نہ تطہیرِ فکر کی شرط ہوتی ہے نہ تصحیحِ اعمال کی۔ (جیسا کہ
کہا جاچکا ہے) یہ قوّتِ ارادی کے مظاہر ہوتے ہیں جسے فنّی حیثیت سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔
مشکل اندر مشکل یہ کہ (ان لوگوں سے قطعِ نظر جو اس قسم کی "شعبدہ بازیاں" حصولِ مفاد کی خاطر
دیدہ و دانستہ دکھلاتے ہیں) بعض لوگ نفس کے دھوکے میں رہتے ہیں اور اس قوّتِ خیال کو روحانی
ترقّی (اور قربِ الٰہی) سمجھ کر حقیقت شناسی کے مدعی بن بیٹھتے ہیں اور انہیں اس بات کا احساس تک بھی
نہیں ہوتا کہ جسے وہ گلستاں سمجھے ہیں فریبِ رنگ و بُو کے سوا کچھ نہیں۔ انہیں اس مغالطہ سے نکالنا یا
دوسروں کو اس فریب میں مبتلا ہونے سے باز رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ ان ہی لوگوں کے متعلق
(WILLIAM JAMES) لکھتا ہے۔

> یہ مسئلہ کہ ایسے تجربات و پیغامات جو درحقیقت منجانب اللہ تھے اور وہ جنہیں شیطان
> نے وضع کر دکھایا تھا اور جن سے بچارے مذہب پرست لوگ پہلے سے بھی زیادہ جہنّم
> کے عذاب کے مستحق بن گئے۔ ان دونوں میں کس طرح تمیز کی جاسکے۔ عیسائی تصوّف
> کی تاریخ میں لاینحل رہا ہے۔

(THE VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE)

ایک عیسائیت ہی پر کیا موقوف ہے؟ یہ مسئلہ ہر مذہب کی باطنیت (تصوّف) میں ہزار مشکلات کا
موجب بنا رہا (اور بنا ہوا) ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے "القائے رحمانی" اور "القائے شیطانی"
میں تمیز و تفریق بڑی مشکل ہے جس کی وجہ سے شیطنت، بڑے بڑے مقدّس نقابوں میں، رہزنِ
ایمان و ہوش بنے رہتی ہے۔ اور اس رہزنی میں فریب کاروں کے علاوہ فریب خوردگان کا بھی کچھ کم
حصّہ نہیں ہوتا۔

لیکن اگر، قطعِ نظر ان لوگوں کے جو دیدہ و دانستہ مکّاری اور فریب کاری کرتے ہیں۔ یا نادانستہ
مبتلائے خدع و فریب رہتے ہیں، ان لوگوں کو بھی لیا جائے جو سچ مچ وارداتِ قلب سے لذّت آشنا

---

[1] "کرامات" تو بُت پرست سادھوؤں، سنیاسیوں سے بھی سرزد ہوجاتی ہیں۔

ہوتے ہیں تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ ان لوگوں کی یہ لذت آشنائی اپنی ذات کے لئے ہوتی ہے. یعنی یہ تجربہ یکسر انفرادی (INDIVIDUAL) ہوتا ہے ان لوگوں کے پاس نوعِ انسانی کے لئے کوئی پیغام نہیں ہوتا. وہ ان کے فکر وعمل کی دنیا میں کوئی انقلاب برپا نہیں کرسکتے ان کے نزدیک "تزکیۂ نفس" مقصود بالذّات ہے. حالانکہ تزکیۂ نفس نہ بجائے خویش منزل ہوسکتا ہے نہ مقصود[1] ادراکِ حقیقت سے مفہوم یہ ہے کہ اس سوال کا حل بتایا جائے جو دنیائے انسانیت کے لئے موجبِ ہزار خلش و اضطراب بنے چلا آرہا ہے. لیکن اگر کوئی شخص خاص نظم وضبط اور ریاضتوں اور مشقتوں سے اپنے دل کی دنیا میں کچھ کیفیتیں اور لذتیں محسوس کرنے لگ جاتا ہے تو اس سے انسانیت کو کیا فائدہ ہے؟ ایسا شخص اپنے تجرّد کی خلوت گاہوں سے باہر بھی آئے گا تو زیادہ سے زیادہ یہی کرسکے گا کہ کسی دوسرے کو ان طرق و مقامات کا پتہ بتادے جن سے وہ بھی اس کی طرح اسی قسم کی کیف وستی سے لذت آشنا ہوجائے. لیکن اس صورت میں بھی یہ تجربہ انفرادی ہی رہا. اس انفرادیت کو رہبانیت کہتے ہیں جس نے دنیا میں کبھی کوئی انقلاب نہیں برپا کیا. انفرادیت کبھی نوعِ انسانی کے مسائل کا حل نہیں بتاسکتی. یہی وجہ ہے کہ جن مذاہب نے اسے ادراکِ حقیقت کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے انہیں مسائلِ حیات کے حل کے لئے دوسری راہیں اختیار کرنی پڑی ہیں. یہی غلطی آگے چل کر دین اور دنیا (روح اور مادہ) کی ثنویت (DUALISM) کا موجب بن گئی جس سے نظامِ انسانی میں فساد ہی فساد برپا ہوگیا. استحکامِ خودی، ترکِ خواہشات و قطعِ علائق سے حاصل نہیں ہوسکتا. بلکہ متصادم و متحارب قوّتوں سے کشمکش اور ان پر غلبہ و استیلاء سے حاصل ہوتا ہے. شمشیر کی تاب و برندگی کا راز نیام کی خلوت گاہوں میں نہیں بلکہ فسان کی شعلہ باریوں میں ہے. اپنے پر ضبط و قابو اس لئے ضروری ہے کہ اس مومنانہ استغناء سے دنیا کی بڑی سے بڑی طاغوتی قوّتوں کو مغلوب و مفلوج کردیا جائے. نہ اس لئے کہ خود ایک گوشۂ انزوا میں بیٹھ کر انہیں ہر قسم کی سرکشی و بے باکی کے لئے کھلا چھوڑ دیا جائے. بقائے نفس کے لئے اگر صفاتِ خداوندی کا پرتو ضروری ہے تو ضربِ کلیمی کا جلال بھی تو خدائے قہار و جبار کی صفت کا عکس ہے (اور یہ

---

[1] "تزکیہ" کے معنی نشو و نما کے ہیں. لیکن یہ حضرات "نفس کُشی" کو تزکیہ سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں.

ظاہر ہے کہ خدا کی قہاریت وجباریت (معاذ اللہ) کسی متبد قوت کی قہرمانیت نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی در پردہ اس کی ربوبیت ہی کا تقاضا ہوتا ہے)۔ لہٰذا جہاں فقط طبیعیات کی خارجی دنیا کو مرکزِ نگاہ بنالینا غلط ہے۔ وہاں صرف نفس کی داخلی دنیا کو خارج سے متعلق سمجھ لینا بھی صحیح نہیں۔ نفس کا ارتقاء ان دونوں کے صحیح امتزاج سے ہوتا ہے۔ روح اور مادہ (داخلی اور خارجی دنیا) کی ثنویت قرآنی مسلک نہیں۔ جو اسلوبِ فکر ان میں سے صرف ایک کو سامنے رکھتا ہے عجمی ہے' اسی کے لئے علّامہ اقبال نے کہا ہے کہ

به چشمے خلوتِ خود را به بیند ۔۔۔ به چشمے جلوتِ خود را به بیند
اگر یک چشم بر بندد گناہے است ۔۔۔ اگر با ہر دو بیند شرطِ راہ است

ان تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ باطنیت (MYSTICISM) کا طریق بھی حقیقتِ کُلّی کے ادراک کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ جن شاہراہوں میں اس قدر غلط فہمیوں اور ابلہ فریبیوں' وساوسِ نفس کی رنگ آمیزیوں اور دسیسہ کاریوں کے کھلے کھلے امکانات موجود ہوں۔ جہاں خضر اور راہزن میں تمیز ہی نہ ہو سکتی ہو' انہیں حقیقتِ عظمیٰ کی منزل تک پہنچانے کا قابلِ اعتماد طریق کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ عالمِ محسوسات (دنیائے سائنس) میں اگر آج کوئی قدم غلط اٹھتا ہے تو کل کی مزید تحقیقات اس غلطی کی تردید کر دیتی ہیں۔ لیکن باطنیت کی دنیا میں ایسے ایسے نگاہ فریب مناظر آتے ہیں کہ ان میں جذب ہو کر انسان کو احساس تک بھی نہیں ہونے پاتا کہ وہ جس راستہ پر گامزن ہے وہ ہلاکت اور بربادی کے کن عمیق گڑھوں کی طرف لئے جا رہا ہے۔

نگۂ بازگشت

اب آگے بڑھئے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ راستہ کی دشوار گزاری سے آپ کا رہروِ فکر شاید تکان محسوس کر رہا ہو۔ اس لئے بہتر ہو گا کہ اگلی منزل تک پہنچنے سے پہلے ذرا سُستا لیا جائے۔ فرصت کے ان لمحات میں قطع کردہ منزل پر نگاہِ بازگشت ڈال لئے اور عالمِ تصوّر میں دیکھئے کہ ہم کہاں سے چل کر کہاں پہنچ گئے ہیں۔

ہمارا آغازِ سفر اس مقام سے ہوا تھا کہ انسان کے سامنے ایک سوال ہے جس کے حل کی تلاش میں ہمیشہ حیران و سرگرداں رہا ہے۔ اس سوال کا حل حقیقتِ ادراک کے بغیر ممکن نہیں۔ اس ادراک کا ذریعہ علم ہے۔ علم کی دنیا میں ہمارے سامنے سب سے پہلے عالمِ محسوسات آتا ہے جہاں عقلِ استدلال

کے راستے، جزئیات سے کلّیات تک پہنچتی ہے۔ عقل کا بھی جی چاہتا ہے کہ وہ حقیقت کا ادراک کرے۔ لیکن حقیقت، لامتناہی ہے اور استدلال کا دائرہ تناہیت سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لئے کُلّی حقیقت کا ادراک، عقل کے بس کی بات نہیں۔ عقل کے مختلف دوائر میں وحدتِ حقیقت، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ملتی ہے۔ اس کے ذریعے وحدت پر تماماً احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری منزلِ علم غیر استدلالی ہے جس میں سب سے پہلے جبلّت (INSTINCT) یا ضمیر (CONSCIENCE) کا مقام سامنے آتا ہے۔ ضمیر، وراثت اور ماحول وغیرہ کے خارجی اثرات سے اس درجہ متاثر ہوتی ہے کہ یہ حق و باطل کی تمیز کا ذریعہ قرار ہی نہیں پا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ضمیر کی آواز کبھی ایک نتیجہ پر نہیں پہنچتی۔

ضمیر کے بعد وجدان (INTUTION) کی وادی سامنے آتی ہے۔ جس میں سب سے وسیع اور وقیع میدان نابغہ کی تخلیق کا ہے۔ وجدان، شدّتِ ذوق کا نام ہے اور ذوق کا اختلاف ہمارا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے! اس لئے ذوق (وجدان) کو بھی حق و باطل کی تمیز کا معیار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس میں شُبہ نہیں کہ ایک نابغہ (GENIUS) اپنے فن کے انتہائے کمال پر ہوتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ کمال، اس کی سیرت پر بھی اسی طرح اثر انداز ہو۔ اس لئے نابغہ، انسانوں کی دنیا میں کوئی انقلاب نہیں پیدا کر سکتا۔ لہٰذا وجدان بھی ادراکِ حقیقت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

اس کے بعد باطنیت (MYSTICISM) کا میدان سامنے آتا ہے۔ اگرچہ اس کے نتائج غیر استدلالی دنیا سے متعلق ہیں لیکن یہ فن اکتسابی ہے اور قوّتِ ارادی کے پختہ اور مرتکز کرنے کا ذریعہ۔ اس میں اربابِ کشف کے نتائج ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہوتے ہیں۔ اس لئے ضمیر اور وجدان کی طرح یہ علم بھی حقیقت کے ادراک سے قاصر ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس راستے میں حق و باطل کی تمیز بڑی مشکل ہے۔ اس لئے اس میں ضلالت و غوایت کے امکانات اور راہوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ پھر یہ بھی کہ اس میں صاحبِ تجربہ کا نتیجہ یکسر انفرادی ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ عام دنیائے انسانیت کے لئے کوئی پیغام اپنے اندر نہیں رکھتا اور اسی لئے ہماری فکر و تہذیب کی دنیا میں کسی انقلاب کا موجب نہیں بن سکتا۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد ہم ستانے بیٹھے تھے۔

آخری مقام

اب آگے بڑھئے اور تاریخ کے اوراق کو ایک مرتبہ پھر الٹئے. اب ہمارے سامنے مدعیانِ حقیقت کا ایک ایسا گروہ آتا ہے جن میں وہ تمام خصوصیاتِ حسنہ بھی بھی موجود ہیں جو متذکرہ سابقہ گروہوں کے انسانوں میں جھلک رہی تھیں لیکن ان کے علاوہ ایک خصوصیتِ کبریٰ ایسی بھی ہے جو اور کہیں نہیں مل سکی. تاریخ بتاتی ہے کہ ایک ایسے دور میں جبکہ لطافتِ فکر و نظر اور نظافتِ کردار و عمل کا کوئی نشان تک نہ ملتا ہو. انسانی تصورات و معتقدات کی دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہے جس پر ابالیسِ دہر کے عساکرِ ضلالت اور شیاطینِ عصر کے جنودِ بطالت مسلّط نہ ہو چکے ہوں. زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ ہو جس میں ایمان و یقین کی جگہ شکوک و ظنون اور نصوصِ صریحہ و حجج بالغہ کی جگہ تلبیس و تحریف نے نہ لے لی ہو. ہر جگہ اور ہر مقام پر فساد ہی فساد دکھائی دیتا ہو. شرفِ انسانیت اپنے تمام مدارج و معارج کھو کر تنزّل و تسفّل کے عمیق جہنّم میں گر چکا ہو. ایسے وقت میں جبکہ کشف و ابرازِ حقیقت کے لئے انفس و آفاق کے کسی گوشے میں شعاعِ ہدایت و سعادت نہ دکھائی دیتی ہو. ظلمت و غوایت کے اس مرکز میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے. ظاہر ہے کہ ماحول اور وراثت کے ان اصول و ضوابط کے ماتحت جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اس بچہ کو وہی کچھ ہونا چاہیئے جو اس کا گردوپیش ہے. لیکن دیکھنے والی نگاہیں دیکھتی ہیں کہ وہ اپنے خاندان اور ماحول سے بالکل الگ تھلگ نظر آتا ہے. وہ ان تمام غلط نظریاتِ حیات سے' جو مہلک جراثیم کی طرح' فضا کی پہنائیوں میں غیر محسوس طور پر پھیلے ہوئے ہیں' محترز و متنفر دکھائی دیتا ہے. وہ بچپن ہی میں اس غلط روشِ کہن سے جس پر اس کے آباء و اجداد ایک زمانہ سے چلے آرہے ہیں اور جنہیں قدامت پرستی کی سند نے تحقیق و تفتیش اور تنقید و تنقیب کی حد سے بالاتر قرار دے رکھا ہے، تبرّی اور بیزاری کا اعلان کرتا ہے. وہ ہر شے پر غائرانہ نگاہ ڈالتا اور ہر چیز کو متجسّسانہ نظر سے دیکھتا ہے. اس کی نگہِ بصیرت انعکاسی شعاعوں (X-RAYS) کی طرح' تمام نظر فریب پردوں سے گزر کر حق و باطل میں تمیز کر لیتی ہے. وہ عقل و دانش میں بھی ایسا ممتاز ہوتا ہے کہ قبیلہ اور خاندان کے سن رسیدہ بزرگ بڑے بڑے اہم معاملات کے تصفیہ کے لئے اس سے استصوابِ رائے کرتے اور اسے حَکم قرار دیتے ہیں. بایں ہمہ' نہ اسے عقلِ حیلہ جو کسی مغالطہ میں رکھتی ہے نہ ضمیر کی آواز اسے دھوکا دیتی ہے اس کی پیدائش ایک نابغہ (GENIUS) کی طرح ہوتی ہے (جس کے متعلق ہم گذشتہ صفحات میں تفصیلاً بحث کر چکے ہیں) لیکن ایک عام نابغہ کے خلاف وہ بلندیٔ سیرت کے اس معراجِ کبریٰ پر تبسّم فشاں ہوتا ہے

جو مکارمِ اخلاق کا معیار قرار پاتی ہے۔ اس کی یہ سیرت نہایت متوازن اور اس کی زندگی پورے پورے اعتدال کی مظہر ہوتی ہے۔ وہ اس ماحول میں جس میں سلب ونہب ایک اصولِ زندگی اور لوٹ کھسوٹ عام اندازِ حیات ہوتا ہے۔ سارے علاقہ میں "الامین" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اور بڑی سے بڑی امانت اس اعتماد اور بھروسے سے اس کے سپرد کر دی جاتی ہے جس طرح انسان اپنا راز اپنے دل سے کہہ دیتا ہے۔ اور اس کی دیانت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب وہی لوگ اسے اس قدر امین جانتے ہیں۔ اس جرم کی پاداش میں اسے قتل کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ انہیں حق کی طرف کیوں دعوت دیتا ہے اور ایک اندھیری رات میں اس کے مکان پر گھیرا ڈال دیتے ہیں، تو اس "امین محصور" کو رات بھر یہ فکر غلطاں و پیچاں رکھتی ہے کہ اگر میں یہاں سے چپکے سے نکل گیا تو ان کی امانتیں جو میرے پاس ہیں انہیں کس کے سپرد کر کے جاؤں گا۔ اس کی صداقت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ جب اپنی قوم کو حق وانصاف کی طرف سب سے پہلی دعوت دیتا ہے تو ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر ان سے کہتا ہے کہ کہو! اگر میں کہوں کہ اس پہاڑی کے اس پار دشمن کا ایک عظیم لشکر ہے جو تمہاری بستیوں پر حملہ کرنے کے لئے بڑھے چلا آ رہا ہے، تو میری بات کو صحیح مانو گے یا غلط۔ تو سب بیک زبان پکار اٹھتے ہیں کہ ہم غلط کیوں مانیں گے۔ تم نے آج تک کبھی جھوٹ ہی نہیں بولا! اس کے کیرکٹر کی پختگی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ مخالفت کے طوفان میں جب دشمن کی طرف سے یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اپنی صداقت کا کوئی ثبوت پیش کرو، تو وہ نہایت بلند آہنگی سے بیباکانہ کہہ دیتا ہے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (۱۰/۱۶) "میں نے اس سے پیشتر تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے نہیں جان سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا۔" کیسا عظیم الشان ہے یہ دعویٰ! اور پھر دعوے بھی کس جگہ؟ دشمنوں کے ہجوم میں۔ لیکن بلندیٔ سیرت کا جلال ایسا صاعقہ فگن ہے کہ تمام مخالفتوں کے باوجود، اس دعوے کے خلاف، کسی گوشے سے کوئی دھیمی سی آواز بھی تو نہیں اٹھتی؛ یہی نہیں کہ اس کے سامنے مروت اور حجاب کی بنا پر کوئی کچھ نہیں کہتا بلکہ اس کی غیبت میں بھی ایک حرف اس کی سیرت کے خلاف کسی کی زبان تک نہیں آتا[1] وہ نہایت سادگی اور اطمینان

بلند سیرت نابغہ

---

[1] ابوسفیان، ہرقل کے دربار میں جاتا ہے کہ اُسے اس نئے داعیٔ انقلاب کے خلاف بھڑکائے اور اس سے مدد لے

(بقیہ اگلے صفحے پر)

کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اور بظاہر کوئی بات اس کے لئے وجہ تشویش نہیں ہوتی۔ لیکن دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ وہ کسی اہم مسئلہ کے حل کی تلاش میں حیران و سرگرداں رہتا ہے (وَوَجَدَكَ ضَالاًّ فَهَدٰى ٥ (۹۳/۷)۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی عظیم المرتبت فکر و خیال ہے جو اس کے قلب کی گہرائیوں میں پہلو بدل رہا ہے۔ لیکن ہنوز آب و تاب سے موزوں نہیں ہو سکا[1]۔ لیکن حیرت یہ کہ اسے خود بھی علم نہیں ہوتا کہ یہ فکر و خیال کیا ہے اور اس کا قلب، کن انکشافات و تجلیات کا مہبط بننے والا ہے؟ (مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ (۴۲/۵۲)۔ حتّٰی کہ وہ وقت آجاتا ہے جب حقیقت تماماً و کمالاً اپنے آپ کو اس منتخب و برگزیدہ شخصیت پر، جسے اس غرض و مقصد کے لئے تیار کیا جا رہا تھا، منکشف (REVEAL) کر دیتی ہے۔ حیات (LIFE) کے تمام سربستہ راز اس پر کھل جاتے ہیں اور وہ قلبِ کائنات کی انتہائی گہرائیوں میں اُتر کر اس سوال کا حل اپنے سامنے پاتا ہے جس تلاش میں انسان یوں مضطرب و بیتاب چلا آ رہا تھا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں

> حیاتِ کائنات وجدانی طور پر اپنے تقاضوں کو محسوس کرتی ہے اور نازک اوقات پر اپنا رُخ آپ متعین کر لیتی ہے اسی کو ہم مذہب کی زبان میں وحیٔ نبوّت کہتے ہیں۔
>
> (خطبات، صفحہ ۱۴۰)

مقامِ نبوّت

یہ ہے مقامِ نبوّت۔ مغربی دنیا چونکہ مقامِ نبوّت سے پورے طور پر آشنا نہیں اس لئے ان کے ہاں اس کے لئے (PROPHET) کا لفظ آتا ہے جو یقیناً اس

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) کہ اس اٹھنے والے "شعلے" کو دبائے۔ ہرقل پوچھتا ہے کہ اس شخص نے تمہارے اندر زندگی بسر کی ہے اور وہ تمہیں میں سے ایک ہے۔ کہو کہ اس کی زندگی کس نہج سے گزری ہے؟ غور کیجئے! حضورؐ سامنے نہیں۔ آپ کا کوئی طرفدار بھی وہاں موجود نہیں جس سے جھجک پیدا ہو جائے۔ مقصد پیشِ نظر ہرقل کو مشتعل کرنا ہے۔ اس کی حمایت حاصل کرنے کا بڑا عمدہ موقع ہے۔ لیکن حضورؐ کی بلندیٔ سیرت کا یہ رعب ہے کہ وہ ایک لفظ بھی حضورؐ کے خلاف زبان تک نہیں لا سکا اور کہا تو اتنا ہی کہا کہ بس ایک دعوت کے علاوہ اس کی زندگی میں کوئی چیز قابلِ اعتراض نہیں۔

[1] یکے در معنیٔ آدم نگر از من چہ می پرسی ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے کہ یزداں را دل از تاثیر او پر خوں شود روزے

مقام کی صحیح تعبیر نہیں کر سکتا۔ اس سے ذہن پیشگوئیوں (PROPHECIES) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس میں کہانت کا تصور لازمی طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک نبیؑ، وحی کے عطا فرمودہ علم کی حدود تک غیب کی باتوں سے بھی واقفیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ مقام نبوت کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس مقام کی صحیح تعبیر وحی کے تصور ہی سے ہو سکتی ہے۔ چونکہ وحی کا تعلق (غیر استدلالی دنیا) سے ہے۔ اس لئے اس اعتبار سے یہ اور وجدان (INTUTION) کے دوسرے تجربے (مثلاً باطنیت (MYSTICISM) وغیرہ ایک شق میں آسکتے ہیں۔ لیکن اتنی سی مشارکت و مشابہت کے علاوہ ان میں اور کوئی چیز مشترک نہیں ہوتی۔ وحی اپنی دنیا کا الگ اور منفرد تجربہ ہے جس کی مثال و نظیر کسی اور تجربے میں نہیں مل سکتی۔ باطنیت کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ

(i) وہ اکتسابی فن ہے۔

(ii) اس میں دھوکا اور فریب، انسان کو مغالطے میں رکھ سکتا ہے۔

(iii) اور وہ ایک یکسر انفرادی تجربہ ہے جسے انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے مسائل سے کچھ تعلق نہیں۔

اس کے برعکس نبوت یکسر وہبی ہوتی ہے جس میں کسب و ہنر کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ پھر نبوت ایک حتمی اور یقینی ذریعۂ علم ہے جس میں فریب و مغالطہ تو ایک طرف، ظن و قیاس تک کو بھی دخل نہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ وہ حقیقت کو تماماً و کمالاً پا کر انسانیت کے معراجِ کبریٰ پر پہنچ جاتا ہے جہاں انسان کا ئنات اور خدا کا صحیح اور اصلی تعلق اس کے دل کی گہرائیوں پر بے نقاب ہو جاتا ہے۔ پھر سب سے بڑی چیز یہ کہ اس کا یہ تجربہ انفرادی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اس عدیم النظیر تجربہ کے بعد دنیائے انسانیت کی طرف لوٹتا ہے اور ایک عظیم الشان، قیامت در آغوش انقلاب آفریں پیغام کا داعی بن کر ان کے فکر و عمل کی سوئی بستیوں میں صورِ اسرافیل

۱ے تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی۔

۲ے اسی سے "روح اور مادہ" کی ثنویت ٹوٹ کر ان میں باہمی توافق و امتزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ "پیدا" کیا ہو جاتا ہے؟ بلکہ ان کی اصل و بنیاد کی یگانگت سامنے آجاتی ہے اور یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ روح جب محسوس و مرئی پیکر میں اپنا نمود چاہتی ہے تو اسے مادہ کہتے ہیں۔

پھونکتا ہے اور اس طرح اپنے غیر متزلزل ایمان (جو آنکھوں دیکھی حقیقت پر مبنی ہوتا ہے) اور بے پناہ عمل سے (جو اس ایمان کا محسوس مظاہرہ ہوتا ہے) ذہنوں کے تصورات، نگاہوں کے زاویے، اشیاء کی اقدار، فکر و نظر کے اسلوب۔ غرضیکہ انفس و آفاق کی دنیا کے نقشے بدل دیتا ہے۔ علامہ اقبالؒ اس حقیقت کی تبیین کے لئے اپنے پانچویں خطبہ کو ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں۔

"محمدؐ عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ میں اگر اس مقام تک پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ لوٹتا" یہ الفاظ ایک بہت بڑے مسلمان صوفی بزرگ (حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔ تصوف کے لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے۔ جو ایک فقرہ کے اندر شعورِ نبوت اور تصوف کے لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لئے کہ اسے آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ایک نبی کی مراجعت تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانہ کے طوفان پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد و مطامح کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ، آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس کی آنکھ نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لئے، ایک صاحبِ وحی کے "تجربہ" کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی رو سے جس قسم کی دنیائے ثقافت اُبھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔ (خطبات، صفحہ ۱۱۸)

دعوائے نبوت پر کھنے کا یہ استنتاجی طریق (PRAGMATIC TEST) ہے جس سے وحی کی صداقت کے ساتھ ساتھ یہ حیثیت بھی سامنے آجاتی ہے کہ ایک نبی کی بعثت، نابغہ (GENIUS) کی طرح محض اتفاقی نہیں ہوتی بلکہ وہ نظامِ کائنات کے عظیم الشان مقصد اور تدبیر کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہوتی

ہے جو ٹھیک اپنے وقت پر ایک خاص مقصد کو پورا کرنے کے لئے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس کے لئے علامہ

مقصدِ عظیم کے لئے

اقبالؒ کے ان الفاظ کو ایک مرتبہ پھر سامنے لے آئیے جنہیں پیچھے درج کیا جا چکا ہے کہ "حیات کائنات وجدانی طور پر اپنے تقاضوں کو محسوس کرتی ہے اور نازک اوقات پر اپنا رُخ آپ متعین کر لیتی ہے۔ اسی کو مذہب کی زبان میں وحیِ نبوّت کہا جاتا ہے۔" ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ (EDDINGTON) کی پیش کردہ تصریحات کے مطابق، دنیائے سائنس میں ہم اشیاء کی حقیقت سے باخبر نہیں ہو سکتے۔ فقط ان اشارات (SYMBOLS) سے آشنا ہو سکتے ہیں جو ہمارے حواس ہمارے ذہن پر مرتسم کرتے ہیں۔ لیکن جب حقیقت اپنے آپ کو اس طرح منکشف کرتی ہے تو اس (وحی) کی روشنی میں اشیاء کی حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے۔ ایڈنگٹن لکھتا ہے:۔

> قوت، توانائی، ابعاد، یہ سب اشارات (SYMBOLS) کی دنیا سے متعلق ہیں یہی وہ تصورات ہیں جن سے ہم نے طبیعیات کی خارجی دنیا کی تخلیق کی ہے۔ ان کے علاوہ ہمارے پاس اور تصورات ہیں کون سے؟ (لیکن) طبیعیات کی دنیا کے اسباب و ذرائع ختم کر چکنے کے بعد جب ہم اپنے شعور کی دنیا کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچتے ہیں[1]۔ وہ دنیا جہاں سے ہماری ذات کا اعلان ہوتا ہے۔ وہاں ہم ایک نئے منظر میں داخل ہوتے ہیں اور خود اپنی ذات سے اشارات (SYMBOLS) لے کر ایک نئی دنیا کی تخلیق کرتے ہیں جس بنیاد (ماوراء المادہ) روحانیت پر ہوتی ہے۔"

(SCIENCE AND THE UN-SEEN WORLD)

نبی اس نئی دنیا کی تخلیق کرتا ہے اور پھر اس کی وحی کی روشنی سے مکتسب اور مستنیر ہونے والے افراد ان اشیاء کی حقیقت و ماہیت سے بہرہ یاب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اس "مادی دنیا" کی بنیاد خالص "روحانیت" پر قرار پا جاتی ہے جس سے نگاہوں کے زاویے بدل جاتے ہیں۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شُد جہاں دیگر شود

---

[1] قرآن کی رُو سے یہ مقام صرف نبی کو حاصل ہوتا ہے۔ غیر نبی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

ایک پیغام

ہم ضمیر، وجدان اور باطنیت کی دنیا میں دیکھ چکے ہیں کہ ان تجارب کے نتائج مختلف ہوتے ہیں. ضمیر کی آواز مختلف مقامات میں مختلف ہے. وجدان (ذوق) کا باہمی تباین و تخالف ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے. باطنیت کے "کشفی" نتائج میں واضح تضاد ہوتا ہے لیکن نبوت کی دنیا میں ہر صاحبِ تجربہ کے نتائج اساساً اور اصولاً ایک ہوتے ہیں. ان میں کہیں، کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوتا. حتیٰ کہ زمان و مکان کا بُعد بھی اس پر کچھ اثر نہیں کر سکتا اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک پر حقیقت تماماً و کمالاً اپنا انکشاف کرتی ہے. اس لئے ان میں سے ہر ایک کا تجربہ ایک ہی ہوتا ہے. اس لئے ان میں سے ہر ایک، دوسرے کی تائید و تصدیق کرتا ہے اور اپنے دعوے کی صداقت تسلیم کرانے کے ساتھ ہی اس حقیقت کا بھی اعتراف کراتا ہے کہ اس سے پہلے جس قدر نبی گزرے ہیں وہ بھی اسی حقیقت کے بیان کرنے والے تھے.

وحی کی حقیقت ہمارے سامنے آگئی. لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم عام طور پر وحی کی ماہیت کو (جو یکسر غیر استدلالی دنیا سے متعلق ہے) عقل یعنی استدلالی علم کی رُو سے سمجھنا چاہتے ہیں اور جب عقل اپنی تناہیت سے آگے نہیں بڑھ سکتی تو بجائے اس کے کہ اس کی محدودیت کا اعتراف کیا جائے وحی کے متعلق ظنون و شکوک پیدا کر لئے جاتے ہیں. وحی تو خیر بہت بلند چیز ہے، ہماری حالت تو یہ ہے کہ وجدان کی معمولی کیفیات کو بھی استدلال کی رُو سے نہ سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں. لوہے کی چند تاروں کو مضراب سے جنبش دی جاتی ہے جس سے فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے. لیکن یہ ارتعاش ہمارے

مقامِ وحی اور عقل

دل کی دنیا میں جذب و مستی کی ایک ایسی والہانہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے جسے نہ عقل کی رُو ہم خود سمجھ سکتے ہیں نہ کسی کو بتا سکتے ہیں کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوتا ہے؟ لہٰذا یہ اصول ہی غلط ہے کہ جس چیز کو ہم عقلاً نہ سمجھ سکیں اس کے وجود سے انکار کر دیا جائے. جن لوگوں میں موسیقی کا ذوق (EAR FOR MUSIC) نہیں ہوتا انہیں قیامت تک سمجھ میں نہیں آسکتا کہ تاروں کے اس ارتعاش یا گلے کے چند سروں سے ہو تا کیا ہے کہ جو لوگ اس طرح سر دھننے لگ جاتے ہیں. جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے. علمائے نفسیات، نفسِ انسانی کی کیفیات دماجریات اور امیال دعواطف سے بحث کرتے ہیں اور ان ہی مباحث پر ان کے پورے علم کی عمارت قائم

ہو رہی ہے لیکن آج تک کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بالآخر نفسِ انسانی ہے کیا؟ طبیعیات کی دنیا میں دیکھئے ایتھر کے وجود کے سب قائل ہیں۔ اس کے خواص و کوائف اور مشاہد و مظاہر ہر ایک کی زبان پر ہیں، لیکن ایتھر کی ماہیت کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بجز اس کہ ایک مجہول الکیف توانائی ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ وحی از قبیل ایتھر وغیرہ ہے۔ مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ یہ اصول کہ جس چیز کی ماہیت ہم عقلاً دریافت نہیں کر سکتے اس کے وجود سے انکار کر دیا جائے درست نہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق[1] (PASCAL) کہتا ہے۔

"ناقابلِ ادراک!

لیکن اگر تم کسی چیز کو نہیں سمجھ سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں

کہ اس کا وجود ہی نہیں۔"

(QUOTED BY HUXLEY IN "RELIGION WITHOUT REVELATION")

اور تو اور، اب تو سائنس بھی وحی کے امکانات کی تردید نہیں کرتی (SAMUEL) لکھتا ہے:-

سائنس، بیرونی دنیا سے آنے والے مستند پیغامات کے امکان کو خارج نہیں کرتی۔
لیکن چونکہ وہ خود اپنے دائرہ کے اندر نظریات کے ردّ و قبول کے معاملہ میں بھی بہت محتاط
واقع ہوئی ہے اس لئے وہ ان دوائر سے متعلق نظریات کو جو اس کی حدود سے باہر ہیں
مسترد یا قبول کرنے میں اس سے بھی زیادہ احتیاط برتے گی۔

وحی اور سائنس

لہٰذا، وحی کے متعلق اب سائنس کی روش، احتیاط کی روش ہے کھلے ہوتے انکار کی نہیں۔ زمانہ کو اور آگے بڑھنے دیجئے۔ رفتہ رفتہ یہ احتیاط، ہم دوشِ اقرار ہو جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی اور عقل (یعنی مذہب و سائنس) کے تصادم کی داستانیں علم

---

[1] وجدانی دنیا سے متعلق سب سے لطیف علم، علمِ نفسیات ہے۔ لیکن وحی کی ماہیت علم النفس کی رُو سے بھی دریافت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ علم تحلیلِ نفسی کے مشہور عالم (JUNG) اس چیز کا کھلے کھلے الفاظ میں اعتراف کرتا ہے۔ (دیکھئے خطبات صفحہ ۱۸۰)

انسانی کے عہدِ طفولیت کی یادگار ہیں۔ وحی کبھی علم وعقل کی نقیض نہیں ہو سکتی۔ سائنس (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) ادراکِ حقیقت کا ناقص یا جزئی طریقہ ہے۔ اور وحی کامل ومکمل۔ علامہ اقبالؒ اس فرق کے متعلق لکھتے ہیں۔

> جسے ہم سائنس کہتے ہیں وہ حقیقت کا کلّی اور منظم مشاہدہ نہیں ہوتا۔ وہ حقیقت کے مختلف گوشوں کے مشاہدات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایک مکمل تجربہ کے ٹکڑے جو اکٹھے کرنے سے فٹ نہیں بیٹھتے۔ علمِ فطرت (NATURAL SCIENCE) مادہ، زندگی اور شعور سے بحث کرتا ہے۔ لیکن آپ جونہی یہ سوال کریں کہ مادہ، زندگی اور شعور کا باہمی تعلق کیا ہے؟ تو آپ کے سامنے وہ علوم آتے جائیں گے جو ان مختلف حصص سے متعلق ہیں۔ لیکن ان علوم کو یکجا کر دینے سے بھی آپ کے سوال کا مکمل جواب نہیں مل سکے گا۔ (خطبات صفحہ ۴۲)

دوسرے مقام پر ہے۔

> سائنس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مطالعہ کے لئے حقیقت کے بعض مخصوص پہلوؤں کو منتخب کرے اور باقیوں کو خارج کر دے۔ سائنس کا یہ دعویٰ بے دلیل عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ حقیقت کے جن گوشوں کو اس نے منتخب کر لیا ہے۔ وہی گوشے مطالعہ کے قابل ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان ایک مکانی پہلو (SPATIAL ASPECT) بھی ہے لیکن انسان کا صرف یہی پہلو تو نہیں۔ اس کے دوسرے پہلو بھی ہیں...... جنہیں سائنس کو لازماً اپنے دائرۂ تحقیق سے خارج کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ ان کے سمجھنے کے لئے ان سے الگ ذرائع کی ضرورت ہے جو سائنس کے ہاں مستعمل ہیں۔ (خطبات ص ۱۰۱)

اس حقیقت کو پروفیسر ایڈنگٹن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

> ہم اس امر کا اعتراف کر چکے ہیں کہ طبیعیات کی دنیا حقیقت کا صرف ایک جزوی سا گوشہ ہے۔ (اب سوال یہ ہے کہ) ہم حقیقت کے دوسرے گوشے کے متعلق کس طرح بحث کریں؟ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس دوسرے حصے کا ہم سے ایسا واسطہ نہیں جیسا طبیعیات سے متعلق حصہ کا ہے۔ ہمارا شعور، احساس، مقصد اور اقدار سے بھی اسی طرح مرتب ہوتا ہے جس طرح حسّی نقوش سے۔ ہم حسّی نقوش (SENSE IMPRESSION)

کا تتبّع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ ہمیں اس خارجی دنیا میں لے جاتے ہیں جس کا تعلق سائنس سے ہے۔ اسی طرح جب ہم اپنی ذات کے دوسرے عناصر کا اتباع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہمیں زمان و مکان کی دنیا سے کہیں الگ لے جاتے ہیں[1]

اس سے ظاہر ہے کہ سائنس حقیقت کے صرف ایک گوشے سے بحث کرتی ہے۔ اس لئے اس کا دائرہ محدود ہے۔ لیکن اس کے برعکس دین (وحی) حقیقت کو تماماً وکمالاً دیکھتا ہے۔ اس لئے اس کُل کے اندر دنیائے سائنس کا جزو خود بخود شامل ہوتا ہے۔

لہٰذا مذہب کے لئے حقیقت کے جزئی علم (یعنی سائنس) سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔

(خطبات ۴۰)

علاوہ بریں، ایک اور جہت سے بھی دین، سائنس کی دنیا سے آگے نکل جاتا ہے۔ سائنس کا مقصد فقط اتنا ہوتا ہے کہ وہ اشیاء کے متعلق تصور (CONCEPTION) قائم کر سکے (اس کی تفصیل شروع میں گزر چکی ہے) اس کے برعکس

دین محض تصور سے مطمئن نہیں ہو جاتا۔ وہ جس شے کی تلاش میں نکلتا ہے چاہتا ہے کہ اس کے متعلق گہرا علم حاصل کرے اور اس سے ربط و ضبط بھی پیدا کرے۔

(خطبات ص۶۴)

سائنس صرف معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ لیکن وحی کا مقصود یہ ہے کہ حقیقت کے متعلق نہ صرف معلومات بہم پہنچائے بلکہ یہ بھی کہ انسان کی ذات کی اس طرح نشوونما ہوتی جائے کہ اس میں (علیٰ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی منعکس ہوں۔ سائنس، معلومات کے ذریعے تسخیرِ فطرت کے امکانات میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ لیکن وحی کی وساطت سے انسانی خودی حدود ناآشنا ہو جاتی ہے۔

---

[1] وحی کے امکان بلکہ اس کی ناگزیر ضرورت کے متعلق دورِ حاضرہ کے سائنسدانوں اور مفکرین کی مزید شہادات کے لئے سلسلۂ معارف القرآن کی آئندہ کڑی "انسان نے کیا سوچا؟" کا مطالعہ کیجئے۔ اس میں انسانی فکر کے مختلف گوشوں کی تاریخ آگئی ہے اور اس کا آخری باب وحی سے متعلق ہے۔

وحی اور رہبانیت

جب طبیعیات کی دنیا، خود وحیؔ (دین) کے دائرہ کے اندر شامل ہے تو رہبانیت[1] کا مسلک مبنی علی الحقیقت نہیں قرار پاسکتا۔ رہبانیت کی تعلیم درحقیقت روح اور مادّہ کی ثنویت (DUALISM) کے غلط نظریہ پر مبنی ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ انسانی خودی کا ارتقاء اس کی "داخلی دنیا" کی تہذیب و تنظیم سے وابستہ ہے۔ خارجی دنیا کی قوتوں سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ لیکن وحی کا ارشاد ہے کہ اس نظریہ کا اتنا حصّہ درست ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس اضافہ کی بھی ضرورت ہے کہ انسان کے اندر جس "داخلی دنیا" کا انکشاف ہوتا ہے وہ مادہ کی خارجی دنیا کی حریف نہیں ہوتی بلکہ وہ تو مادّی دنیا کے رگ و پے میں جذب ہوتی ہے۔ اس لئے خودی کا استحکام مادّی دنیا کی قوّتوں کے ترک سے نہیں بلکہ داخلی دنیا اور خارجی دنیا کی باہمی تطبیق و توفیق سے ہوگا (خطبات ص۹)۔ وحیؔ "انسان کے اس بلند شعور کو بیدار کرتی ہے جس سے اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کا خدا اور کائنات سے کیا تعلق ہے" (خطبات ص۱۵۷)۔ جب انسان اس تعلق کو صحیح معنوں میں سمجھ لیتا ہے تو اس کی رُو سے ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے جس میں یہ تمام قوتیں اس مقصد کے بروئے کار لانے میں صرف ہوتی ہیں جو حیات کے سرچشمہ کا تقاضا ہے۔ اس طرح "اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ[2]" ہوجاتا ہے۔ علاّمہ اقبالؒ لکھتے ہیں۔

> خدا کی تمام مخلوق میں انسان ہی اس قابل ہے کہ وہ شعوری طور پر اپنے خالق کی حیاتِ تخلیقی میں شرکت کرسکے اس میں یہ جوہر ودیعت کیا گیا ہے کہ یہ ایک بہتر دنیا کا تصور کرسکے اور جو کچھ موجود ہے اسے وہ کچھ بنادے جو اسے ہونا چاہیئے۔　　　(خطبات ص۱۲)

مقصود و مطلوب

جو کچھ موجود ہے (WHAT IS) اسے کیا ہونا چاہیئے؟ (WHAT OUGHT TO BE) اس کا تعین اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ انسان کائنات کی مختلف اشیاء کی حقیقت معلوم کرسکے۔ اور ایسا ہونا وحیؔ کی روشنی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے کہ اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نہیں جس سے حقیقت کا ادراکِ کلّی ہوسکے۔ یہی وہ روشنی ہے جس سے انسان، قلبِ کائنات کی گہرائیوں پر اُتر کر اس کی تمام وسعتوں پر چھاجاتا ہے۔ اس مقام پر سب سے پہلے اسے اپنی

---

[1] رہبانیت درحقیقت کشمکشِ حیات سے گریز و فرار کی راہ ہے (تفصیل "خلاصۂ مبحث" میں دیکھئے)۔

[2] وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸/۱۷)

ذات کے اثبات کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس طرح اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ "دنیا فی الحقیقت وہی ثابت (REAL) ہے جسے اپنے اثبات کا براہِ راست شعور ہے (خطبات ص۶۸)۔ اس سے انسان اپنے آپ کو بہ حیثیتِ انسان پہچانتا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی کے تمام گوشے جگمگا اٹھتے ہیں۔ اس طرح وحی اس کی زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی راہ نمائی کرتی ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ:۔

مذہب کسی ایک شعبۂ زندگی کا نام نہیں۔ یہ نہ تو محض خیال ہے، نہ محض احساس، نہ محض عمل۔ بلکہ یہ انسان کا تمام تر ترجمان ہے۔ (خطبات ص۲)

بقائے نفس کا راز

ایک مرتبہ عنوان زیرِ نظر کا پہلا صفحہ پھر الٹئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انسانی خودی (EGO) حیاتِ جاوید کی آرزو مند تھی۔ وہ اپنا استہلاک نہیں چاہتی تھی۔ وہ فنا کے تصور سے خوف کھاتی تھی۔ ابلیس نے اسے شجرۃ الخلد کی طرف اشارہ کیا اور یوں اسے یہ سمجھایا کہ بقا کا مسئلہ حسی (استدلالی) علوم کے ذریعے حل ہو سکتا ہے اور انسان اپنی اولاد کی وساطت سے ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کے برعکس ندائے آسمانی نے کہا کہ یہ گمراہی کی طرف دعوت ہے۔ فنا کی طرف بلاوا ہے۔ بقا کا راز کچھ اور ہے۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ (۲/۳۸)۔ اگر تباہی و بربادی کے خوف سے مامون ہونا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریق ہے کہ "میری طرف سے بھیجی ہوئی ہدایت" کے مطابق زندگی بسر کرو۔ یہ تمہیں سلامتی کے گھر کی طرف لے جائے گی۔ يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (۵/۱۶)۔ تاریخِ انسانیت پر نگاہ ڈالیے وہ ایک داستان نظر آئے گی اسی کشمکشِ پیہم کی کہ نشیدِ کامرانی، استدلالی علوم (تنہا عقلِ انسان) سے فردوس گوش ہو سکتی ہے یا اس کے لئے وحیِ خداوندی کی ندائے جمال بھی ضروری ہے۔ مدعیانِ علمِ استدلالی نے کیا کیا؟ سب سے پہلے تنہا عقل کی رُو سے یہ فیصلہ کیا کہ نوعِ انسانی کے سامنے مسئلہ (PROBLEM) ہے کیا؟ اور پھر اس مسئلہ کا حل بھی عقلِ انسانی سے تلاش کرنا چاہا۔ آپ دیکھیں گے کہ علمِ استدلالی نے انسان کے مسئلہ کو اس کی طبیعیاتی زندگی سے آگے دیکھا ہی نہیں اس لئے کہ علمِ استدلالی خود متناہی ہے اور اس کی نگاہ متناہیت کی حدود سے آگے جا ہی نہیں سکتی۔ اس نے انسان کو انسان کی حیثیت سے پہچانا ہی نہیں۔ اس لئے اس نے جو نظام بھی قائم کیا وہ انسانی ذات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے خلش و اضطراب کا جہنم بن کر مسلّط ہو گیا۔ اس کے برعکس وحی کی روشنی نے اس کی راہ نمائی اس راستے کی طرف کر دی جو حسن و توازن کو ساتھ لئے ہوئے اسے اس جنت کی طرف لے جائے جس کی بہاریں خزاں ناآشنا اور جس کی شادابیاں افسردگی نادیدہ ہیں۔ (جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا)۔

بابِ دوم

گذشتہ صفحات میں ہم نے علمِ انسانی کے مختلف ذرائع اور اس کے حدود و قیود اور لزومات و تضمنات کے متعلق فکری طریق سے بحث کی ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پس منظر میں قرآنی تصریحات کا بھی مطالعہ کیا جائے اور استنتاجی طریق (PRAGMATIC TEST) کی رُو سے اس کی پیش کردہ تعلیم کو جانچا جائے۔ باب اوّل میں سب سے پہلے عقل (یا علمِ استدلالی) سے بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کے لئے عقل کس قدر شرف و عزّت کا باعث ہے اور قرآنِ کریم اس کی اہمیت پر کس قدر زور دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ عقل کا اپنا دائرہ اثر و نفوذ اور حیطۂ تحقیق و تفتیش ہے جس سے آگے

باندازِ دِگر

یہ بڑھ نہیں سکتی اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ یہ وحی کا دامن پکڑ لے[1] اسی کی روشنی میں زندگی کی مسافت طے کرے۔ یعنی وحی اور عقل کا وہی تعلق ہو جو سورج کی روشنی اور انسانی آنکھ کا تعلق ہے۔ جس طرح سورج کی روشنی کے بغیر انسانی آنکھ کا عدم اور وجود برابر ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کے پاس دیدۂ بینا نہ ہو تو اس کے لئے سورج کی روشنی کا ہونا اور نہ ہونا بھی کچھ فرق نہیں پیدا کرتا۔ لہٰذا شاہراہِ زندگی پر گامزن ہونے کے لئے انسانی عقل اور وحی کی روشنی، دونوں کی ضرورت لاینفک ہے۔

قرآن اور عقل

قرآنِ کریم کو شروع سے اخیر تک دیکھئے، ہر صفحہ پر عقل و بصیرت کی طرف دعوت نظر آئے گی۔ قرآنِ کریم کا تخاطب ہی عقل و دانش

---

[1] اسی طرح ضمیر، وجدان اور باطنیت کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو وحی کے سایۂ عاطفت میں لے آئیں جب ضمیر و وجدان، وحی کی پیدا کردہ فضا میں پرورش پائیں گے تو ان کے فیصلے وحی کی روشنی میں ہوں گے۔ اسی طرح جب نفس کی قوتیں اس نظام کے عملی قیام میں صرف ہوں گی جو وحی کا منشا ہے تو پھر کشمکشِ حیات سے فرار کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ انسان کی تمام داخلی اور خارجی قوتیں وحی کے تابع ہوں اور اس کے عطا فرمودہ ضابطۂ حیات کو ایک جیتے جاگتے نظامِ زندگی کی صورت میں متشکل کرنے میں صرف کی جائیں۔

سے ہے۔ وہ حق و صداقت سے انکار کرنے والوں کے خلاف سب سے بڑا الزام یہی عائد کرتا ہے کہ وہ عقل وفہم سے کام نہیں لیتے۔ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ (۲/۱۷۱)۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ یکسر اندھیرے میں ہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ۭ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ۭ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۶/۳۹)

اور جن لوگوں نے ہمارے قوانین کو جھٹلایا، تو (ان کا حال ایسا ہوگیا ہے گویا) بہرے گونگے تاریکیوں میں گم ہوں! سو جو شخص غلط راستوں پر چلنا چاہے، خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ بھٹکا ہوا رہے گا اور جو سیدھے راستے پر چلنا چاہے (وہ کامیابیوں کی طرف بڑھ جائے گا)۔ یہی خدا کا قانون ہے۔

وہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو بدترین خلائق قرار دیتا ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ (۸/۲۲)

یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے بدتر حیوان وہ (انسان) ہیں جو بہرے گونگے ہوگئے، جو کچھ سمجھتے ہی نہیں!

وہ کہتا ہے کہ ایسے لوگ انسان نہیں ڈھور ڈنگر ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گزرے کہ حیوانات (مجبوراً ہی سہی) اپنی جبلّت پر تو قائم رہتے ہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ڮ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (۷/۱۷۹)

اور کتنے ہی شہری اور بدوی لوگ ہیں جن کا انداز زیست بتا دیتا ہے کہ وہ جہنمی ہیں۔ (یعنی قانونِ مکافات کی رُو سے ان کا ٹھکانا جہنم ہونے والا ہے اس لئے کہ) ان کے پاس عقل ہے مگر اس سے سجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں، مگر اُن سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کے پاس کان ہیں، مگر اُن سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ وہ (عقل و بصیرت کا استعمال کھو کر) چارپایوں کی طرح ہوگئے۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ کھوگئے ایسے ہی لوگ ہیں جو یک قلم غفلت میں ڈوب

گئے ہیں۔

قرآن اپنی دعوت کو علیٰ وجہ البصیرت پیش کرتا ہے۔ اندھی عقیدت کی بنا پر نہیں منواتا۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ قف عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ ط وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۱۲/۱۰۸)

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو میری راہ تو یہ ہے کہ میں تمہیں جو خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو وہ دعوت علیٰ وجہ البصیرت دیتا ہوں۔ اور (اس راہ میں) جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا ہے ان کا مسلک بھی یہی ہوگا۔ اللہ اس سے بہت بلند ہے (کہ اسے جہالت اور بے علمی کے زور سے منوایا جائے) نہ ہی وہ ایسا ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور قوت کو شریک کیا جائے۔

اس لئے وہ ضد اور انکار کرنے والوں سے کہتا ہے کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلیل و برہان لاؤ۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا........ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ (۶/۱۴۹)

جن لوگوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا ہے وہ کہیں گے کہ اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک نہ کرتے اور نہ کسی چیز کو (اپنے خیال کے مطابق) حرام ٹھہراتے۔ سو (دیکھو) اسی طرح ان لوگوں نے بھی (سچائی کو) جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں یہاں تک کہ (بالآخر) ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا۔ (اے پیغمبر!) تم کہو کیا تمہارے پاس (اس بارہ میں) کوئی علم و یقین ہے۔ جسے ہمارے سامنے پیش کر سکتے ہو؟ (اگر ہے تو پیش کرو!) اصل یہ ہے کہ تم پیروی نہیں کر رہے ہو مگر محض وہم و گمان کی۔ اور تمہارا یہ دعویٰ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ بے سمجھے بوجھے باتیں بناتے ہو!

لیکن دلیل ایسی جو حق و یقین پر مبنی ہو۔ ظن و قیاس پر اس کا مدار نہ ہو۔ کیونکہ حقیقت کے مقابلہ میں ظن و تخمین کا کچھ کام نہیں۔

وَ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ط اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ج وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۝ (۵۳/۲۸)

اور (دیکھو) انہیں حقیقت کے متعلق کچھ بھی علم نہیں ہے۔ وہ محض ظن و قیاس کی پیروی کر

رہے ہیں اور بلا شبہ حق کے مقابلہ میں ظن و تخمین (کے گھوڑے دوڑانا) کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتا.

اسی لئے اس نے حکم دے دیا ہے کہ بلا علم و یقین کسی چیز کی پیروی مت کرو.

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ؕ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝ (۱۷/۳۶)

اور دیکھو، جس بات کا تمہیں علم و یقین نہیں، اس کے پیچھے نہ لگا کرو. یاد رکھو، کان، آنکھ، قلب، ان سب کے بارے میں پوچھا جائے گا.

اس لئے کہ میزانِ خداوندی میں اندھا اور آنکھوں والا، بہرہ اور سننے والا کبھی برابر نہیں ہو سکتے.

مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ؕ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ (۱۱/۲۴)

ان دو فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے اندھا بہرا، اور دیکھنے سننے والا. پھر بتلاؤ کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے؟

قرآن کریم نے علم و عقل پر کس قدر زور دیا ہے. یہ ایک مستقل موضوع ہے جس کا تفصیلی تذکرہ کسی آئندہ جلد میں آئے گا لیکن متذکرہ صدر اجمالی اشارات سے اس حقیقت کی ایک جھلک سی ضرور سامنے آگئی ہوگی. ان حقائق کی روشنی میں کون دیدہ در کہہ سکتا ہے کہ اسلام علم و عقل کا مخالف ہے! اُس نے تو اس زمانہ میں عقل و بصیرت کی عظمت کو دنیا کے سامنے پیش کیا جب دنیا جہالت اور توہم پرستی کو انسانیت کے لئے مایۂ ناز سمجھا کرتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کریم ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ عقل کا اپنا دائرہ ہے

عقل کا دائرہ محدود ہے

اور اس کی فضیلت و افادیت اسی دائرہ کے اندر رہے اس دائرہ سے آگے اس کے لئے وحی کی قندیلِ آسمانی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے. یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ آنکھ کی قوت کو بڑھانے کے لئے خارجی امداد کی ضرورت ہے. اندھیرے میں آنکھ بالکل نہیں دیکھ سکتی. تھوڑی سی روشنی (جو خارج سے آتی ہے) قوتِ بینائی کو بڑھا دیتی ہے. جوں جوں روشنی تیز ہوتی جائے حدِ نگاہ وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے. پھر اگر اس روشنی کے ساتھ دوربین بھی ہو تو ان حدود کی وسعت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے. جو چیزیں تنہا آنکھ کو کبھی نظر نہیں آ سکتیں وہ خوردبین اور دُوربین کی مدد سے کھلی کھلی اور نکھری نکھری سامنے آجاتی ہیں. اسی

طرح قوتِ سماعت کے حدود، آلات مکبّر الصوت (LOUD SPEAKERS) سے وسیع سے وسیع تر ہوجاتے ہیں. جس طرح خارجی اثرات سے اُن ذرائع احساس کی حدود وسیع ہوجاتی ہیں اسی طرح قوتِ فکر کی حدود بھی وحی کی روشنی سے کشادہ دامن ہوجاتی ہیں. تنہا عقل ظن و تخمین کی وادیوں میں محوِ حیرت سرگرداں رہتی ہے. لیکن وحی کی روشنی میں یقین کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے. اس لئے کہ وحی علم و یقین ہے اور دلیلِ محکم!

عقل اور وحی

ہم نے کہا یہ ہے کہ وحی کی روشنی میں (۱) عقل کی حدود بہت زیادہ وسیع ہوجاتی ہیں. اور (۲) وہ ظن و تخمین کی وادیوں میں بھٹکنے کے بجائے علم و یقین کے محکم نقطہ پر پہنچ جاتی ہے. وحی انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے لئے اصول متعین کرتی ہے اور پھر عقل سے کہتی ہے کہ وہ ان اصولوں کی جزئیات متعین کرے اور ان کی تنفیذ و ترویج کے لئے اسباب و ذرائع تلاش کرے. مثلاً وحی کا ارشاد ہے کہ سود حرام ہے. اب عقل کا کام یہ ہے کہ وہ ایسا نظامِ معاشی وضع کرے جس میں سود کے بغیر کاروبار چل سکے. ظاہر ہے کہ جب دنیا میں ایسے بین الاقوامی نظامِ معاشی رائج ہوں جن کی بنیادیں سود پر ہوں تو ان کے علی الرغم ایک ایسا نظام وضع کرنا جو اپنی اساس و بنیاد میں ان تمام نظامہائے معاشی سے مختلف ہو، لیکن اس کے باوجود دنیا میں نہایت آسانی سے رائج بھی ہوسکے، کارے باشد. سوچئے کہ ایسا نظام وضع کرنے کے لئے عقل کی حدود میں کس قدر کشادگی اور اس کی پہنائیوں میں کس درجہ وسعت پیدا ہوجائے گی.

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اگر عقل کے سامنے کوئی خاص اصول متعین نہ ہو تو اس کا جہاں جی چاہے گا رُک کر بیٹھ جائے گی اور اسی نقطہ کو منزل قرار دے دے گی. آپ کے پاس کوئی معیار نہ ہوگا جس کی رُو سے آپ یہ کہہ سکیں کہ عقل، مقامِ مقصود تک نہیں پہنچی. راستہ میں ہی تھک کر بیٹھ گئی ہے. یہی وجہ ہے کہ وہ اقوام جنہوں نے تنہا عقل کی رُو سے حیاتِ اجتماعیہ کے قوانین وضع کئے اُن کی حالت یہ رہی (اور آج بھی یہی حالت ہے) کہ عقل نے جس مقام کو منزل کہہ دیا، وہ اسے منزل سمجھ کر بیٹھ گئے. لیکن تھوڑے سے عرصہ کے بعد مزید تجربات و مشاہدات، یا یوں کہئے کہ داعیاتِ حیات نے یہ حقیقت واضح کردی کہ جس مقام کو منزل سمجھ لیا گیا تھا وہ منزل نہ تھا. یہ صرف فریبِ عقل تھا کہ اس نے اپنی خستگی و درماندگی کو منزل کی غلط تعبیر میں چھپا دیا. لیکن اگر انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے لئے اس کے اصول متعین ہوں (یعنی

منزل کا تعین پہلے کر دیا گیا ہو) تو عقل حیلہ جو آپ کو کبھی فریب نہ دے سکے گی۔ اس لئے کہ آپ جب تک منزل تک نہ پہنچ جائیں گے، اسے چین نہ لینے دیں گے۔ اس لئے اسے ظن و قیاس کے بجائے علم یقین تک پہنچنا لازمی ہوگا۔ مثلاً آپ کسی بچے کو حساب کا سوال حل کرنے کے لئے دیتے ہیں اگر آپ نے اس کا صحیح جواب متعین کر کے اس کے سامنے نہیں رکھ دیا تو وہ جو جواب نکالے گا اسے صحیح تصور کر کے مطمئن ہو کر بیٹھ جائے گا۔ لیکن اگر آپ نے اس کا جواب متعین کر کے دے دیا ہے تو وہ اپنی عقل کو کبھی اطمینان سے نہیں بیٹھنے دے گا جب تک وہ اس جواب تک نہ پہنچ جائے جو آپ نے متعین کر کے دے دیا ہے۔ یہی صورت عقل کی ہے۔ آپ اس کے سامنے اصولی قوانین نہ رکھئے تو وہ ہر مقام پر کہہ دے گی کہ صحیح جواب یہی ہے اور اس پر قناعت کر کے بیٹھ جائے گی۔ لیکن اگر اس کے سامنے اصولی قوانین موجود ہیں تو اسے طوعاً و کرہاً وہاں تک پہنچنا پڑے گا۔ اس طرح عقل، ظن و تخمین کے فریب راہ کے بجائے علم و یقین کے صحیح مقامِ محمود تک پہنچ جائے گی۔ عقل کی راہ نمائی اور 'عشق' کی راہ نمائی میں یہی فرق ہے۔

ہر دو بہ منزلے رواں، ہر دو امیرِ کارواں — عقل بہ حیلہ می برد، عشق برد کشاں کشاں
عشق زپا درآورد خیمۂ شش جہات را — دست دراز می کند تا بہ طنابِ کہکشاں

یہ ہے وحی اور عقل کا تعلق۔ یعنی وحی، عقل کی حدود کو وسیع تر کرنے اور اس کے ظن و تخمین کو حتم و یقین میں تبدیل کرنے کے لئے ہے۔ جیسے روشنی آنکھ کی وسعتوں کو وسیع تر کرنے اور اس کے نتائج کو ظن و تخمین سے مبدل بہ یقین کرنے کے لئے ہے۔ لیکن ہمارے ہاں جس طرح اور معاملات میں افراط و تفریط کی راہیں اختیار کی جاتی ہیں اور مسلکِ اعتدال و اقتصاد پر کبھی قائم نہیں رہا جاتا، عقل کے معاملہ میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ایک طرف اگر محسوسات کی خوگر مغرب زدہ ذہنیتیں عقل سے آگے کسی اور سرچشمۂ علم کو تسلیم

عقل کی تحقیر غلطی ہے

ہی نہیں کرتیں تو دوسری طرف وہ ذہنیتیں بھی موجود ہیں جو عقل کی اس درجہ تنقیص و تذلیل کرتی ہیں گویا یہ نوعِ انسانی پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اس سے بچنا انتہائی تقدس و تورع کی نشانی۔ اور تماشا یہ کہ یہ لوگ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلیل یہ لاتے ہیں کہ دیکھئے خود مغرب کے عقل پرست بھی سائنس کی محدودیت اور عقل کی ناقصیت کے قائل ہیں۔ حالانکہ عقل و سائنس کی محدودیت اور شے ہے اور اس کا قابلِ مذمت قرار دیا جانا اور شے۔ سائنس ماورائے مادہ اپنی تحقیقات کو نہیں بڑھا سکتی یہ اس کی محدودیت ہے۔ لیکن اپنے دائرہ کے اندر اس

کی علمی کاوشیں یقیناً سزا وارِ تحسین و تبریک ہیں. عقل کا دائرہ استدلال کی دنیا ہے. وہ اس سے آگے وحی کی دنیا میں قدم نہیں رکھ سکتی. یہ اس کی ناقصیت ہے. لیکن اس سے ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ اسے اس کے اپنے دائرہ کے اندر بھی قابلِ نفرت قرار دے دیا جائے. وحی ان دوائر کی حدود متعین کر کے ہر شے کو اس کی اصل پوزیشن عطا کر دیتی ہے. یہی اربابِ حق و اعتدال کا مسلک ہے جن کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے.

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ .... رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ (۱۹۰-۱۸۹/۳)

یقیناً تخلیقِ ارض و سما اور اختلافِ لیل و نہار میں اربابِ دانش و بینش کے لئے (بڑی بڑی) نشانیاں ہیں. وہ (اربابِ دانش) جو کھڑے بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے) قوانینِ خداوندی کو ہر وقت اپنے سامنے رکھتے ہیں اور تخلیقِ ارض و سمٰوٰت میں غور و تفکر کرتے رہتے ہیں اور (کامل تحقیق و تدقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ نظامِ کائنات تخریبی نتائج کے لئے نہیں پیدا کر دیا. تیری ذات (اس سے بلند اور پاک ہے (کہ کائنات کا انجام تخریب ہو جو ایسا سمجھتا ہے اس کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جاتی ہیں) اے ہمارے نشوونما دینے والے تو ہمیں اس قسم کے انجام سے محفوظ رکھنا.

یہ ہیں وہ منازل جہاں استدلال اور وحی یعنی عقل و عشق آپس میں بغلگیر ہوتے ہیں. یا یوں کہیئے کہ عشق (ایمان یا وحی کا وسیع دائرہ) عقل کے چھوٹے دائرہ کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے. اور عقل اپنے فیصلوں کو عشق کی بارگاہ میں پیش کر کے سندِ حقیقت حاصل کرتی جاتی ہے جس کے بغیر اس کی قیمت کچھ بھی نہیں. اس لئے کہ

ہزار بار نکوتر متاعِ بے بصری
ز دانشے کہ دل اُو را نمی کند تصدیق

اس کے بعد ایک اور چیز ہمارے سامنے آتی ہے. باب اوّل میں بتایا جا چکا ہے کہ اس قلبِ مطہر

حقیقت منکشف ہوتی ہے

پر جسے اس عظیم الشان رازِ کائنات کی امانت گاہ بنانا مقصود ہوتا ہے حقیقت اپنے آپ کو منکشف کر دیتی ہے۔

قوانینِ فطرت، کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں موجود ہوتے ہیں۔ انسان اپنے علم، مطالعہ، تجربہ، اور مشاہدہ سے ان قوانین کو (DISCOVER) کرتا ہے۔ یعنی ان پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھا کر انہیں بے نقاب کر دیتا ہے اور یوں وہ قوانین "غیب" سے مشہود ہو جاتے ہیں۔ یہ انکشافات انسانی کسب و ہنر کا نتیجہ ہیں۔ جوں جوں انسان اپنے علم اور مشاہدات میں ترقی کرتا جاتا ہے، فطرت کی مضمر قوتیں بے نقاب ہوتی چلی جاتی ہیں۔

لیکن وحی کی یہ کیفیت نہیں۔ اس میں صاحبِ وحی، مضمر حقیقت پر سے خود پردے نہیں اٹھاتا ۔ وہ ایسا کر نہیں سکتا۔ بلکہ حقیقت خود اپنے آپ کو اس پر منکشف کر دیتی ہے اور وہ ایسا صاحبِ وحی کے سوا کسی اور کے ساتھ نہیں کرتی۔ یہ وجہ ہے کہ وحی نہ انسانی کسب و ہنر کا نتیجہ ہوتی ہے اور نہ ہی غیر از نبی کوئی انسان اس میں شریک ہو سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، وحی، نبی کی اپنی داخلی قوتوں کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ وہ اس پر خارج سے نازل ہوتی ہے۔ یہ ہے انسانی فکر اور وحی میں بنیادی فرق۔ وحی کی خصوصیت اس کی (OBJECTIVITY) ہوتی ہے۔ اسے قرآنی اصطلاح میں "تنزیل" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وحی کی خارجیت

آپ قرآنِ کریم کو شروع سے آخیر تک دیکھ جایئے ہر مقام پر وحی کی خارجیت پر زور دیا گیا اور اسے غیر مبہم الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔ یعنی وحی کا خدا کی طرف سے نزول ہوتا ہے۔

تَنۡزِیۡلَ الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ (۳۶/۵)

خدائے رحیم کی طرف سے منزل۔

اور

تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ○ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ فَاعۡبُدِ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ○ (۳۹/۲-۱)

(اور دیکھو) یہ کتاب اس خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو بڑے غلبہ اور حکمت والا ہے۔

(اے پیغمبرِ اسلام!) ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب (قرآن) سچائی کے ساتھ اتاری ہے۔ تم اپنے

نظامِ زندگی کو خدا کے لئے خالص رکھتے ہوئے صرف اس کے قوانین کی اطاعت و
فرماں پذیری اختیار کرو (اور بس!)

اسے جبریل امین لے کر نازل ہوئے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ٥ (۲/۹۷)

(اے پیغمبرِ اسلام!) جو جبریل کے دشمن ہوں ان سے کہہ دو کہ یہ اللہ کا کلام ہے جو جبریل نے اس کے حکم سے تمہارے قلب میں اتارا ہے اور یہ ان تمام صداقتوں کو سچ کر کے دکھا دے گا جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اس میں نوعِ انسانی کے لئے ہدایت ہے اور ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں (فلاح و کامیابی کی) بشارت۔

اللہ تعالیٰ کی ذات جہت اور سمت کی تمام نسبتوں سے پاک ہے۔ اس لئے نزولِ وحی سے مراد یہ نہیں کہ کوئی شے سچ مچ اوپر کی سمت سے نیچے کی سمت کو آتی ہے۔ خدا تو رگِ جان سے بھی قریب[ل] ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ٥ (۵۰/۱۶)

اور بلاشبہ ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور جو کچھ اس کا نفس (اس کے دل میں) وسوسہ ڈالتا ہے ہم انہیں بھی خوب جانتے ہیں (ہم اس سے کچھ دُور تھوڑا ہی ہیں) ہم تو اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ (اس لئے اس کا ظاہر و باطن سر و علانیہ کچھ بھی ہم سے چھپا نہیں رہ سکتا)۔

ل خدا کے متعلق 'اوپر کی سمت' کا تصور کچھ اس طرح انسان کے قلب کی گہرائیوں میں راسخ ہو چکا ہے کہ خدا کے نام کے ساتھ ہی انگلی اوپر کو اُٹھ جاتی ہے حتّٰی کہ اگر زبان سے کچھ نہ کہا جائے اور محض انگلی یا آنکھ سے اوپر کی طرف اشارہ کر دیا جائے تو بھی مخاطب سمجھ لیتا ہے کہ مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کی علوِ مرتبت کا تقاضا تھا کہ اس کے لئے بلندیوں کا تصور ذہن میں قائم ہوتا۔ لیکن اس سے مقصود یہ نہیں کہ وہ سچ مچ کہیں اوپر کی سمت میں جا گزیں ہے۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ تَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ٥

اس لئے وحی کی خارجیت سے اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ ذہنِ انسانی کی پیداوار نہیں. اور نہ ہی اس میں صاحبِ وحی کے کسب و ہنر کو کوئی دخل ہے۔

وحی اکتسابی ملکہ نہیں جیسا کہ باب اوّل میں لکھا جا چکا ہے۔ وحی اگر کسب و ہنر سے حاصل کی جا سکے تو جس ماحول میں رسول پیدا ہوتا، پرورش پاتا، بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے، اس ماحول میں اور لوگ بھی تو ہوتے ہیں. اگر ایک انسان میں اکتساباً حصولِ وحی کا امکان ہو تو دوسرے انسانوں میں بھی اس کا امکان ہو سکتا ہے. لیکن وحی اکتسابی چیز نہیں ہے. ایسی وہبی ہے کہ اس منصبِ جلیلہ کے لئے اُسی ماحول میں سے مشیّتِ خداوندی ایک خاص برگزیدہ ذات کا انتخاب کرتی ہے اور اس کے قلبِ مطہر کو وحی کی روشنی کا مہبط بناتی ہے۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ؁ (۲۲/۷۵)

اللہ نے ملائکہ میں سے بعض کو پیام رسانی کے لئے منتخب کر لیا. اسی طرح بعض انسانوں کو بھی. بلاشبہ اللہ ہی سننے والا دیکھنے والا ہے!

حضرت یونسؑ کے متعلق ارشاد ہے۔

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ؁ (۶۸/۵۰)

چنانچہ (یونس کو) اس کے پروردگار نے منتخب کر لیا اور اسے نیک کردار لوگوں میں سے بنا دیا (جو نبوّت و رسالت کی صلاحیت رکھتے ہوں)۔

حضرت موسیٰؑ کے متعلق فرمایا۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِىْ ؁ (۲۰/۴۱)

اور (دیکھ اے موسیٰ!) تجھے میں نے اپنی ذات کے لئے (آسمانی ہدایات اور بنی اسرائیل کی راہ نمائی کے لئے جو ایک مقصدِ الٰہی ہے) چن لیا ہے۔

رسول جب پیغامِ وحی کی تبلیغ کرتا ہے تو اس کے گرد و پیش کے لوگوں کو حیرت ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ ایسی باتیں کہتا ہے جن کی انہیں قطعاً اس سے توقع نہیں ہوتی وہ اسے اپنے میں سے ہی ایک سمجھتے اور اس سے اسی قسم کی امیدیں وابستہ رکھتے ہیں. لیکن وہ نزولِ وحی کے ساتھ ہی کسی اور دنیا کی باتیں کرنے

لگتا ہے۔ جب حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو اس شرک سے روکا جو ان کے آبا و اجداد سے ان میں متوارث چلا آرہا تھا تو وہ فرطِ حیرت سے پکار اٹھے کہ

قَالُوْا یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ٥ (۱۱/۶۲)

لوگوں نے کہا "اے صالح! پہلے تو تُو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی امیدیں تجھ سے وابستہ تھیں۔ پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ ان معبودوں کی اطاعت کریں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں (یہ کیسی بات ہے؟) ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ ہمارے دل میں اُترتی نہیں۔

یہ موہبتِ کبریٰ نسبی اور قومی بھی نہیں ہوتی۔ حضرت ابراہیمؑ کے تذکرۂ جلیلہ کے ضمن میں فرمایا:

وَ اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ٥ (۲/۱۲۴)

اور (پھر غور کرو، وہ واقعہ) جب ابراہیم کو اس کے پروردگار نے مختلف قوانین کے ذریعے اسے زندگی کے مختلف مراحل میں گردش دی تھی اور اس نے ہر قانون کی پوری پوری اطاعت کی تھی۔ جب ایسا ہوا تو خدا نے فرمایا "اے ابراہیم! میں تجھے نوعِ انسانی کا امام بنانے والا ہوں"۔ ابراہیم نے عرض کیا جو لوگ میری نسل سے ہوں گے (ان کی نسبت کیا حکم ہے؟) ارشاد ہوا "جو ظلم و معصیت کی راہ اختیار کریں، تو ان کا میرے عہد میں کوئی حصہ نہیں!"

وحی صرف مشیّت پر مبنی ہے

وحی، اللہ کی رحمت ہے جو صرف مشیّت پر مبنی ہوتی ہے۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ٥ (۲/۱۰۵)

اہلِ کتاب میں جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ اور مشرکینِ مکہ، دونوں نہیں چاہتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر خیر و برکت (یعنی وحیِ الٰہی) نازل ہو۔ (اور اس لئے

وہ طرح طرح کے شکوک پیدا کر کے تمہیں اتباعِ حق سے باز رکھنا چاہتے ہیں، لیکن اللہ (کا قانون اس بارے میں انسانی خواہشوں کا پابند نہیں ہو سکتا۔ وہ) جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے چن لیتا ہے۔ اور وہ بڑا فضل رکھنے والا ہے!

اس کا علم صرف اللہ کی ذات ہی کو ہوتا ہے کہ اس منصبِ گرامی کے لئے کس ذاتِ اقدس کو منتخب کیا جائے گا۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسٰلَتَهٗ ۝ (۶/۱۲۵)

اللہ ہی اس بات کو بہتر جاننے والا ہے کہ منصبِ رسالت کس کے سپرد کرے۔

سورۂ نحل میں ہے۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝ (۱۶/۲)

وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اس غرض کے لئے چن لیتا ہے کہ اپنے حکم سے ملائکہ، وحی کے ساتھ اس پر بھیجے، اور اسے حکم دے کہ لوگوں کو اس حقیقت سے خبردار کر دو "میرے سوا کوئی معبود (قابلِ اطاعت و فرمانبرداری) نہیں ہے۔ لہٰذا میرے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو۔"

سورۂ مومن میں ہے۔

رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۝ (۴۰/۱۵)

اور (دیکھو، وہ ہی) بلند مرتبوں والا اور صاحبِ عرش (حکومت) ہے (اس کے سوا کسی کی بادشاہت نہیں) وہ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے الروح (یعنی وحی) بھیجتا ہے۔ تاکہ وہ (خدا کے) سامنے ہونے کے دن سے (لوگوں کو) آگاہ کرے۔

چونکہ یہ موہبت مشیت پر مبنی ہے اس لئے اگر مشیت اسے سلب کر لینا چاہے تو اُسے کوئی واپس نہیں لا سکتا ہے۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ

لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝ (۱۷/۸۶)

اور (اے پیغمبر!) جو کچھ ہم نے تجھ پر وحی کی ہے اگر ہم چاہیں تو اسے سلب کر لیں. پھر تجھے کوئی نہ ملے جو اس کے لئے ہم پر وکالت چلائے.

اس اختصاص و اجتباء کی تو یہ حالت ہے کہ، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، خود رسول کو بھی رسالت سے پہلے اس کا علم نہیں ہوتا کہ وہ اس منصبِ جلیل کے لئے تیار کیا جا رہا ہے.

خالص موہبت

حضرت موسیٰؑ جب اپنے اہلِ خانہ کے لئے آگ کی تلاش میں نکلے ہیں تو انہیں دُور سے ایک شعلۂ نور دکھائی دیا. انہوں نے اسے آگ ہی کا شعلہ سمجھا اور نہایت سادگی سے اس کی طرف لپکے. قریب پہنچے تو خطیرۂ قدس سے آواز آئی.

وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ (۲۰/۱۳)

اور دیکھ! میں نے تجھے (رسالت کے لئے) چُن لیا ہے. پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اسے کان لگا کر سُن!

خود وہ ذات اعلم الناسؐ، معلّم الحکماء (فداہ ابی و امّی)، جو شرف و رشدِ انسانیت کے معراجِ کبریٰ پر فائز اور علم و عقل کے افقِ اعلیٰ پر جلوہ ریز تھی اسے بھی وحی سے پہلے اس کا علم نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں.

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۴۲/۵۲)

اور (دیکھ اے پیغمبرِ اسلام!) اسی طرح ہم نے تیری طرف بھی اپنے حکم سے الرّوح (وحیِ الٰہی) بھیجی (ورنہ اس سے پہلے، تو (قطعاً) ناآشنا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں؛ مگر ہم نے اس (الرّوح. یعنی قرآن) کو ایک نور بنا دیا جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں اپنے قانونِ ہدایت کے مطابق رہنمائی کر دیتے ہیں. اور اسی کے ذریعہ سے تو بھی (اے پیغمبر! لوگوں کو) سیدھے راستے کی طرف رہبری کر رہا ہے.

نہ جانتے ہی تھے اور نہ ہی اس کی توقع تھی کہ آپ کو نبوّت مل جائے گی.

وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ؁ (۲۸/۸۶)

اور (دیکھ اے پیغمبر!) تجھے کوئی امید نہیں تھی کہ تیری طرف الکتٰب (یعنی قرآن) بھیجی جائے گی۔ مگر یہ تو صرف تیرے پروردگار کی (تجھ پر) رحمت تھی (کہ اس منصب جلیل کے لئے اس نے تجھے چن لیا)۔ تو یاد رکھ! ایسا کبھی نہ ہو کہ تُو نافرمان لوگوں کا مددگار بن جائے۔

وحی سے پہلے نہ لکھنا جانتے ہیں نہ پڑھنا۔ لیکن مہبط اس نور کے بنائے جارہے ہیں جس سے اکتسابِ ضیاء کرنے والے ساری دنیا میں علم وحکمت کے امام تسلیم کئے جائیں۔

وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ؁ (۲۹/۴۸)

اور (دیکھ اے پیغمبر!) تُو نہ تو اس (قرآن) سے پہلے کوئی کتاب پڑھتا تھا۔ نہ ہی اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتا تھا جس کی بنا پر یہ بیہودہ لوگ شک کر سکتے ہوں (پھر ان کا یہ بلاوجہ شک وشبہ کس لئے ہے؟)

اسی لئے گرد وپیش کے لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ یہ تو ہم میں سے ایک آدمی تھا۔ اس پر وحی کس طرح آنے لگ گئی!

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ؁ (۱۰/۲)؛ (۳۸/۴)

کیا لوگوں کو اس بات پر اچنبھا ہوا کہ ان ہی میں سے ایک آدمی پر ہم نے وحی بھیجی؛ اس بات کی وحی کہ لوگوں کو (انکار وبدعملی کے نتائج سے) خبردار کردے اور ایمان والوں کو خوشخبری دے دے کہ پروردگار کے حضور ان کے لئے اچھا مقام ہے؟ کافروں نے کہا۔ بلاشبہ یہ شخص کھلا ہوا جھوٹا ہے!

اسی لئے یہ لوگ جو حقیقتِ وحی سے ناواقف تھے کہتے تھے کہ خدا ہم سے ہمکلام کیوں نہیں ہوتا؟

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ (۲/۱۱۸)

اور جو لوگ وحی کی حقیقت سے بے خبر ہیں وہ کہتے ہیں (اگر یہ تعلیم خدا کی طرف سے ہے تو) کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ خدا ہم سے براہِ راست بات چیت کرے' یا اپنی کوئی (عجیب وغریب) نشانی ہی بھیجدے' تو (دیکھو' گمراہی وجہالت کی) جیسی بات یہ کہہ رہے ہیں' ٹھیک ٹھیک ایسی ہی بات ان لوگوں نے بھی کہی تھی' جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں. اس بارے میں پہلوں اور پچھلوں' سب کے دل ایک ہی طرح کے ہوتے (بہرحال' اگر یہ لوگ نشانیوں ہی کے طلبگار ہیں' اور نشانیوں کی پہچان رکھتے ہیں' تو دیکھ لیں) ہم نے ان لوگوں کے لئے جو ماننے والے ہیں کتنی ہی نشانیاں نمایاں کردی ہیں.

یہ انتخاب کیسے ہوتا ہے؟

لیکن اجتبار رسالت اور اصطفار وحی کے یہ معنی نہیں کہ (معاذاللہ' معاذاللہ) یونہی جس راہ چلتے پر نظر ٹک گئی اسی کو اس منصب کے لئے چُن لیا. آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جب قوّتِ عقل وفکر کے لئے مشیّتِ خداوندی نے انسان کا انتخاب کیا ہے تو اس آب وگل کے ہیولیٰ کو کس قدر ارتقائی منازل طے کرانے کے بعد اس جوہر کے قابل بنایا گیا تو جس برگزیدہ ہستی کو وحی جیسی موہبتِ عظمیٰ کے لئے منتخب کرنا اور اس کے قلبِ منوّر کو کائنات کے اسرار ورموز کا امین بنانا ہو وہ شرفِ انسانیت کے کس مقامِ بلند پر جلوہ فرما ہوگا. سورۂ صٓ میں حضرات انبیاء کرامؑ کے تذکرہ کے بعد فرمایا.

وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ۝ (۳۸/۴۸)

اور وہ سب' بہترین افرادِ نسلِ انسانی میں سے تھے.

وہ تمام کے تمام برگزیدہ کائنات اور خیر ترین مخلوق تھے اور جوہرِ خلقِ عظیم کے مظہر (وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸/۴)). لہٰذا اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے کہ جس ذات کو آخرالامر منصبِ نبوّت پر فائز کرنا مقصود ہوتا ہے اس کی تربیت کس طرح شروع ہی سے "خدا کی زیرِ نگرانی" ہوتی ہے اور کن کن مراحل سے گزار کر اسے مقامِ نبوّت تک لایا جاتا ہے. سورۂ طٰہٰ میں سرگذشتِ حضرت موسیٰؑ کا مطالعہ کیجئے. بات (۲۰/۳۶) سے شروع ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کن حالات ہوئی. کن حالات میں

وہ فرعون کے محلات میں پہنچے۔ وہاں ان کی تربیت کس طرح ہوئی۔ پھر کس طرح انہیں محلات کی زندگی سے نکال کر مدین کی شبانی کی طرف بھیجا گیا۔ وہاں کن کن صبر آزما مراحل سے گذارا گیا۔ ان تمام منازل و مراحل کی تفصیل کے بعد ارشاد ہے کہ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى (۲۰/۴۰) "اے موسیٰ! ان تمام مراحل کے طے کرنے کے بعد کہیں جا کر تو ہمارے پیمانے پر پورا اترا"۔ وَ اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ (۲۰/۴۱) اس طرح نبی کو مقامِ نبوت کے لئے تیار کیا جاتا ہے لیکن اسے خود کچھ علم نہیں ہوتا کہ اس کی اس طرح تربیت کس مقصد کے لئے ہو رہی ہے۔

اس سے واضح ہے کہ نبوت کسب و ہنر سے نہیں ملتی یعنی یہ نہیں کہ ایک شخص کسی خاص طریقے پر چل کر اور خاص انداز کی ریاضتیں کر کے نبوت حاصل کر سکتا ہے۔ اسی انداز سے دنیا کے اور علوم تو حاصل کئے جا سکتے ہیں لیکن نبوت کا علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علم نبوت کشف و وجدان وغیرہ سے بھی یکسر الگ ہے۔ یعنی ان دونوں میں صرف درجہ (DEGREE) کا فرق نہیں بلکہ دونوں کی نوعیتیں بالکل مختلف ہیں۔ یہ فرق کمیت (QUANTITATIVE) نہیں بلکہ کیفیت کا QUALITATIVE ہے۔ نبوت کی مثال دنیا کے کسی اور علم میں نہیں مل سکتی۔ نبوت اپنی مثال آپ ہے۔ یہ علم، انسان کے اپنے اندر کے کسی ملکہ کی بڑھی ہوئی شکل کا نام نہیں۔ یہ کوئی چیز ہی الگ ہے جسے غیر از نبی سمجھ ہی نہیں سکتا۔

اس مقام پر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، جس شخصیت کو نبوت کے منصبِ جلیلہ کے لئے منتخب کیا جانا مقصود ہوتا ہے، نگہِ فطرت شروع ہی سے اس کی نگرانی و نگہبانی کرتی ہے، اور وحی کا نزول اس پر خارج سے ہوتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ نبی میں ذاتی صلاحیتیں کوئی نہیں ہوتیں۔ وہ (معاذ اللہ) ایک ریڈیو کا سیٹ ہوتا ہے جس کے ذریعے وحی کی آواز براڈ کاسٹ کی جاتی ہے۔ بالکل نہیں۔ نبی اپنی سیرت اور کیریکٹر کے اعتبار سے بلند ترین مقام پر ہوتا ہے۔ اور خدا سے وحی پانے کے بعد جو عظیم انقلاب وہ دنیائے انسانیت میں برپا کرتا ہے، وہ سب (وحی کی روشنی میں) اس کی ذاتی صلاحیتوں کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ (تفصیل اس اجمال کی "رسالت" کے عنوان میں سامنے آئے گی)۔

ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ وحی کے پرکھنے کا ایک بڑا معیار استنتاجی طریق (PRAGMATIC TEST)

استنتاجی طریق

ہے۔ اب اس گوشہ کی طرف آیئے۔ چونکہ (جیسا کہ آیندہ چل کر تاریخی شواہد و نظائر سے بتایا جائے گا) دنیا میں وحی کا مستند اور غیر محرف صحیفہ صرف قرآنِ کریم[1] ہے۔ اس لئے اس باب میں قرآنِ کریم ہی کی تعلیم پیش کی جائے گی (اور حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں جہاں بھی وحی کی روشنی آئی تھی، اس کی تعلیم اساساً و بنیاداً وہی تھی جو قرآنِ کریم کے اندر ہے۔ وحی کی تعلیم میں اصولی طور پر کوئی فرق ہو ہی نہیں سکتا۔ فرق اس وقت پڑتا ہے جب وحی کی تعلیم میں تحریف انسانی ردّ و بدل کر دے) پھر اس تعلیم میں سے بھی چند اصولی باتیں پیش کی جا سکیں گی۔ اس لئے کہ اس کی تفصیل کے لئے معارف القرآن کی تمام کی تمام جلدیں وقف ہیں اور اس کے بعد بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکے گا کہ اس کی تعلیم مکمل ہو گئی ہے۔

آپ تاریخ کے اوراق کو چھٹی صدی عیسوی تک پیچھے الٹئے اور یہ دیکھئے کہ اس زمانہ میں تمام دنیا میں، انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی حالت کیا تھی[2]؟ اس عہد میں ایران، یونان، مصر اور روم تہذیب و تمدن کے بڑے بڑے مراکز تھے۔ سب سے پہلے عقائد کی طرف آیئے تو آپ دیکھیں گے کہ اس وقت فکر و نظر کے تمام گوشوں پر کسی نہ کسی شکل میں، شرک مستولی تھا۔ اور یہ عقیدہ جہلا کی توہم پرستی تک محدود نہ تھا بلکہ بڑے بڑے اربابِ حکمت و بصیرت اس "ظلمِ عظیم" کی تاریکیوں میں مبتلا دکھائی دیتے تھے۔ حکمتِ یونان،

شرک

علم و آگہی کی سب سے درخشندہ مثال نظر آتی ہے۔ لیکن سقراط نے اپنے مقدمۂ عدالت میں اس امر کا اعتراف کیا کہ وہ چاند اور سورج کو دیوتا مانتا ہے (PLATO'S APOLOGY)۔ آج چونکہ ہمارے سامنے بالعموم توحید کی صحیح عظمت نہیں۔ ہے اس لئے ہم شرک کو محض ایک عقیدہ کی بحث تصوّر کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ بغور دیکھیں تو شرک

---

[1] اس کے لئے دیکھئے میری تالیف "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں"۔

[2] اس کے متعلق چند ضمنی اشارات آدم کے عنوان میں بھی گذر چکے ہیں۔ اس لئے ان کے اعادہ کی ضرورت نہ تھی لیکن اس مقام پر چونکہ ذہن کو ایک اور نتیجہ کی طرف منتقل کرنا مقصود ہے اس لئے اس تکرار کو روا رکھا گیا ہے۔

مرا معنیٔ تازہ مدعا است
اگر گفتہ را باز گویم رواست

و توحید صرف علمِ کلام کے مسائل نہیں. بلکہ ان کا تعلق براہِ راست زندگی کے اصولی اور بنیادی مباحث سے ہے۔ غور کیجئے کہ جب انسان اپنے ہاتھ کی تراشیدہ مصنوعات یا مظاہرِ فطرت کے سامنے جُھک جائے تو اس میں شرفِ انسانیت کا شائبہ تک بھی باقی رہ سکتا ہے؟ دنیا میں جن قوموں کے حصّے میں سرفرازی آتی ہے انہیں سب سے پہلے قامتِ انسانیت HUMAN STATURE عطا ہوتی ہے جس کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے سے کمتر یا اپنے برابر کسی کے سامنے نہ جھکے. اس جھکنے کے معنی صرف یہ نہیں کہ پتھر یا مٹی کی کسی مورتی کے سامنے نہ جھکے. بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون بھی صرف ایک خدا کا تسلیم کرے. جس طرح کائنات میں صرف ایک قانون نافذ العمل ہے اور وہ خدا کا قانون ہے (جسے قانونِ فطرت کہا جاتا ہے) اسی طرح انسانی معاشرہ میں بھی صرف خدا کا قانون نافذ العمل ہونا چاہیئے جو وحی کے ذریعے ملتا ہے اگر کسی انسان نے کسی اور انسان کا' یا اپنا خودساختہ' قانون اپنے لئے واجب الاطاعت سمجھ لیا تو یہ شرکِ عظیم ہے.

ہیئتِ اجتماعیہ

عقائد کے بعد ہیئتِ اجتماعیہ کی طرف آیئے تو نظامِ حکومت میں ملوکیت ایک مسلّم آئین تھا اور اس کے خلاف کہیں کوئی آواز بلند نہیں ہوتی تھی. اس کی مخالفت میں آواز اٹھنا تو ایک طرف' اس نے کچھ ایسے تقدس کی صورت اختیار کر رکھی تھی کہ اسے "آسمانی حق" (DIVINE RIGHT) تسلیم کیا جاتا تھا. اس سے آگے بڑھئے تو پیشوائیت[1] (PRIESTHOOD) کی زنجیریں' قلب و دماغ کے ہر گوشے کو چاروں طرف سے جکڑے ہوئے تھیں. عمرانی زندگی میں انسانوں کی طبقاتی تقسیم پیدائش کی رُو سے کی جاتی تھی. ذاتوں اور گوتوں کی ان آہنی دیواروں کی شکست و ریخت کسی کے بس کی بات نہ تھی. رنگ و نسل اور ملک و وطن کی حدود نے نوعِ انسانی کو ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا تھا. جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ احترامِ آدمیت کا معیار' آدمیت کے بجائے مختلف اضافات و انتسابات قرار پا چکے تھے. انسان بہ حیثیت انسان کہیں پہچانا نہیں جاتا تھا بلکہ ملک و نسب اور شعوب و قبائل کی رُو سے اس کے حقوق و واجبات کا تعین ہوتا تھا. انسان کے عہدِ جہالت میں "اپنے قبیلہ میں

---

[1] اس کے ترجمہ کے لئے ہمیں کوئی موزوں لفظ نہیں مل سکا. اس لئے اسے کہیں پیشوائیت اور کہیں برہمنیت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے. جہاں کہیں یہ الفاظ آئیں. آپ ان کے مفہوم پر نگاہ رکھیں.

چوری کو جرم اور دوسرے قبیلہ میں قابلِ ستائش عمل قرار دیا جاتا تھا" لیکن یہ تخصیص وادیٔ جہالت سے آگے بڑھ کر میدانِ تہذیب میں بھی اصولِ حیات بن چکی تھی۔ چنانچہ "روما کے قانون کی رُو سے اپنے ملک کی حدود سے باہر کے انسانوں کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حدودِ سلطنت کے اندر آزاد انسان کے حقوقِ شہریت اور ان سے متعلقہ مفاد حاصل ہوتے تھے۔ لیکن ان حدود سے باہر تمام انسان، وحشی اور دشمن سمجھے جاتے تھے (SAMUEL; P-210) معاشی نظام کی طرف آیئے تو سرمایہ داری ایسا ہی مسلّم آئین تھا جیسے ملوکیّت۔ انہی غیر فطری نظامہائے زندگی کی ایک شاخ غلامی کی لعنت تھی، جو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا ایک لاینفک جزو قرار پا چکی تھی۔ ارسطو کے ہاں ستر غلام تھے اور وہ غلامی کے جواز میں ستر دلائل دیا کرتا تھا۔ غرضیکہ اس زمانہ کی مہذب دنیا کی تاریخ کے کسی گوشے پر نگاہ ڈالئے۔ ہر طرف آئینِ زندگی ایسا ہی تھا۔ اس آئینِ حیات کے خلاف زبان تک حرفِ شکایت آنا تو کجا، دل کی گہرائیوں میں بھی کہیں تنگی اور گرانی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ گویا اس نہجِ زندگی کو عین "فطرتِ انسانی" کے مطابق سمجھ لیا گیا تھا۔ غور کیجئے کہ اس فضا میں، عرب کی جاہل اور وحشی سرزمین سے ایک شخص اٹھتا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اسے وہی کچھ ہونا چاہیئے تھا جو اس کے گردوپیش کے انسان تھے اور اگر اس کی ذہنی سطح کو اس کے گردوپیش کے انسانوں سے ممتاز بھی تصور کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اسے اس زمانے کی مہذب دنیا کا ایک مردِ دانا قرار دیا جا سکے گا۔ اور اُس زمانہ کی مہذب دنیا کی جو حالت تھی اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے لیکن وہ شخص اٹھتا ہے اور اُس آئینِ حیات کے ایک ایک گوشے کے خلاف جسے

وحی کا لایا ہوا انقلاب

اُس زمانہ کی تہذیب و تمدن اور علم و دانش نے عین مطابقِ فطرت قرار دے رکھا تھا علمِ بغاوت بلند کرتا ہے۔ وہ ایک ایسے انقلاب کا داعی بن کر متعارف ہوتا ہے جس میں اس آئینِ کہن کی بنیادیں تک اکھیڑ کر رکھ دی جائیں۔ وہ ملوکیّت کو خدا کی بدترین لعنت قرار دیتا ہے، توہّم پرستی کو خلافِ شرفِ انسانیت ٹھہراتا اور (PRIESTHOOD) کو فریبِ نفس کا "مقدس" نقاب بتاتا ہے۔ ذات پات کی تقسیم کو طاغوتی قوتوں کا استبداد گردانتا ہے۔ سرمایہ داری کا نظام اس کے نزدیک ایک ایسا جذام ہے جس نے جسدِ انسانیت کو مہلک جراثیم سے بھر رکھا ہے۔ غلامی کے تصور سے اس کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ قومیت پرستی (NATIONALISM) کے متعلق اس کا اعلان ہے کہ اس سے انسان خونخوار درندوں کی صورت اختیار

کر لیتا ہے۔ وہ اٹھتا ہے اور ساری دنیا کو پکار کر کہتا ہے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا اور بندے کا تعلق براہِ راست ہے، اس کے لئے برہمنیت (PRIESTHOOD) کے کسی درمیانی واسطہ کی ضرورت نہیں، وہ اعلان کرتا ہے کہ انسانی شرف و سعادت اور تعظیم و تکریم کا معیار اس کا کیرکٹر اور اعمال ہیں۔ جن کی بنیاد ایمان پر ہے۔ پیدائش سے کسی انسان کو دوسرے پر کوئی فوقیت و افضلیت حاصل نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سرمایہ داری بجز اس نیست کہ بعض انسانوں نے قوت فراہم کر کے کمزور و ناتواں انسانوں کے حقوق کو غصب کر رکھا ہے۔ اس لئے تقاضائے عدل و انصاف یہی ہے کہ ان غصب شدہ حقوق کو ان غاصبوں کے ہاتھوں سے چھین کر ان کے اصل حقداروں تک پہنچا دیا جائے۔ وہ معاشی نظام (ECONOMIC SYSTEM) میں احتکار و اکتناز کو سنگین جرم قرار دیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ دولت کی گردش (CIRCULATION OF MONEY) اس انداز سے نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ صرف ایک خاص طبقہ کے اندر ہی پھرتی رہے۔ وہ کہتا ہے کہ آدمی کا آدمی ہونا اس کے لئے وجہ احترام ہے۔ اس لئے انسانوں کے اندر غلامی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تمام قبائلی اور قومی عصبیتوں کو توڑ کر اس انقلابِ عظیم کا اعلان کرتا ہے کہ تمام نوعِ انسانی اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہے اس لئے تمام رُوئے زمین کے انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد اور ایک شجرِ بلند و بالا کی شاخیں ہیں۔ نسل، رنگ، زبان، وطن کی غیر فطری دیواروں سے ان میں تفریق و تمیز پیدا کرنا جسدِ انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہے۔ غرضیکہ انسانی (انفرادی و اجتماعی) زندگی کے تمام غیر فطری آئین و دساتیر کے خلاف اعلان کرتا ہے اور صرف اعلان ہی نہیں کرتا بلکہ عملی طور پر انقلاب پیدا کر کے دکھا دیتا ہے کہ صحیح مقامِ زندگی کیا ہے؟ انسانوں کی داخلی اور خارجی دنیا میں اس کی طرف سے پیدا کردہ یہ انقلابِ عظیم مبنی ہوتا ہے اس انکشافِ حقیقت پر جس کی رُو سے وہ روحِ کائنات کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب کر وحدتِ حیات کے اصل الاصول کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے (خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ) حقیقت یہ ہے کہ وحدتِ

وحدتِ حیات کا تصوّر

حیات کی اصلِ عظیم کا انکشاف ہی وہ محیّر العقول انقلاب ہے جس نے انسانی فکر و نظر کے تمام غلط زاویوں کو بدل دیا اور جس کی رُو سے انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل جدید صحیح خطوط پر وجود کوش ہوئی۔ قرآن کی طرف سے

پیش کردہ یہ تصوّر، فی الحقیقت دنیائے قدیم وجدید میں ایک حدِّ فاصل ہے۔ یہاں سے نظامِ انسانیت کے دھارے کا رُخ دوسری طرف منتقل ہو گیا جس نے نسل اور وطن کی غیر فطری حدود کو توڑ کر شعورِ انسانی میں عالمگیریت کا تصوّر بیدار کر دیا۔ قرآن کریم نے اپنے پہلے فقرہ میں اس عظیم المرتبت حقیقت کو واضح کر دیا کہ جس خدا کی یہ تعلیم ہے کہ وہ (ربّ العٰلمین) تمام اقوام و مِلل کا نشوونما دینے والا ہے اس لئے اس نظام میں قومی عصبیّت اور جماعتی رجحانات کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ اس کا مخاطب "انسان" ہے۔ انسانوں کا کوئی خاص گروہ نہیں ہے۔ قرآن کریم ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۶/۹۰) تمام اقوامِ عالم کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ یہ کتابِ ہدایت نوعِ انسانی کے لئے نصابِ زندگی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ ۙ۬ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۰/۵۷)

اے نوعِ انسانی! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے ایک ایسی چیز آگئی ہے، جو موعظت ہے، دل کی تمام بیماریوں کے لئے شفا ہے، اور ہدایت اور رحمت ہے ان تمام لوگوں کے لئے جو (اس پر) یقین رکھتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جو نظامِ تمدّن و سیاست عقلِ انسانی کی رُو سے مرتّب ہوگا اس میں شعوری اور غیر شعوری طور پر کسی نہ کسی طرف جھکاؤ ضرور ہوگا۔ انسان کے سینے میں جب تک دھڑکنے والا دل ہے وہ کبھی جذبات کے میلان سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اور جذبات کا تقاضا ہے کہ وہ امیال و عواطف کی رنگینی قبول کریں۔ لیکن وحی کا سرچشمہ ان تمام میلانات و رجحانات سے پاک و بلند ہے اس لئے اس کے نزدیک تمام انسان یکساں ہیں۔ بقول اقبالؒ۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر	سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ	در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

"بینندۂ سودِ ہمہ" کے معنی ہیں ربّ العٰلمینی یعنی ربوبیتِ عامہ۔ ربوبیت سے مراد یہ ہے کہ ہر فرد کے اندر جس قدر مضمر صلاحیتیں ہیں ان سب کی نشوونما (تربیت) اس طرح ہوتی چلی جائے کہ وہ اپنی تکمیل تک پہنچ جائیں۔ یہی وہ معاشرہ ہے جسے قرآن قائم کرنا چاہتا ہے۔ یعنی ایسا معاشرہ جس میں ہر فردِ انسانیہ کی صلاحیتیں مکمل نشوونما پالیں۔ اس کے معنی تکمیلِ ذات یا انفرادیت ہے۔ اس کو (DEVELOPMENT

(OF SELF) کہا جاتا ہے. یہی قرآن کی بنیادی تعلیم ہے. یہ ظاہر ہے کہ اس نظام میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہوتا (جس طرح ایک قمقمہ اپنی روشنی اور حرارت کے لئے کسی دوسرے قمقمہ کا محتاج نہیں ہوتا). بقول علامہ اقبالؒ اس نظام کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ

انفرادی زندگی

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

لیکن یہ نظام اس سے ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ انفرادی نشو و نما کے یہ معنی نہیں کہ ہر فرد، دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جائے. وہ کہتا یہ ہے کہ جس طرح افراد کی یہ صلاحیتیں ایک اجتماعی معاشرہ کے اندر تکمیل پذیر ہوتی ہیں اسی طرح اس اجتماعی معاشرہ کی تشکیل بھی انہی افراد کے اجتماع و ائتلاف سے ہوتی ہے. اس نظام میں افراد اپنی تمام صلاحیتوں کو ہیئتِ اجتماعیہ کے استحکام کے لئے وقف کر دیتے ہیں. اور اس طرح نمودِ حیات اجتماعی شکل میں قوی سے قوی تر ہوتی جاتی ہے. اس کے ساتھ ہی افراد (کی خودی) میں بھی پختگی اور استواری آتی جاتی ہے اور یوں ایک ایسا دائرہ قائم ہو جاتا ہے جس میں یہ بتانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کس کے زور پر آگے بڑھ رہا ہے. انفرادیت اور اجتماعیت کچھ اس طرح باہمدگر پیوست ہوتی ہے جس طرح جسمِ انسانی اور اس کے اندر خلیاتِ حیات (LIFE CELLS) پورے جسم کا قیام خلیات کی زندگی پر ہے اور خلیات کی زندگی منحصر ہے جسم کی زندگی پر. جسم خلیات کو قوت عطا کرتا ہے اور خلیات جسم کو. دونوں کے وجود الگ الگ بھی ہیں اور دونوں مل کر ایک بھی. یا ایک اور مثال میں یوں سمجھئے جیسے ایک (FLY WHEEL) مشین کے پرزوں کو حرکت دیتا ہے اور مشین کے پُرزے پھر اس (FLY WHEEL) کو گھماتے ہیں اور یوں باہمی تعاون و تناصر (بلکہ نظم و ضبط) کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے جسے ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا.

زندگی انجمن آرا و نگہ دار خود است
ایکہ در قافلۂ بے ہمہ شو با ہمہ رو

افراد کے ایغو جب اس نظام کے ماتحت اجتماعیت کی شکل اختیار کرتے ہیں تو چونکہ ان کی منفرد خصوصیات میں مماثلت ہوتی ہے اس لئے اس مماثلت و مشابہت سے ان میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور اس

ہم آہنگی سے ایسی فضا وجود میں آجاتی ہے جس میں ان (EGOS) کی پرورش کا سامان ہوتا ہے. اس فضا میں ہر شخص کو اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما کا پورا پورا موقع ملتا ہے [تفصیل ان امور کی میری تصنیف "نظامِ ربوبیت" میں ملے گی]۔

میزانِ عدل اس نظام میں ہر معاملہ اصول پر مبنی ہوتا ہے اور اس کا فیصلہ ایک خاص قاعدے اور قانون کے ماتحت عمل میں آتا ہے جس میں نہ کسی کی رعایت ہوتی ہے نہ کسی پر زیادتی.

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (۵۷/۲۵)

ہم نے اپنے پیغمبروں کو یقیناً واضح دلائل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ (آسمانی) کتابیں اور میزان (عدل) بھی اتاری (تاکہ وہ احکامِ الٰہی کے مطابق کامل انصاف اور عدل کے ساتھ لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کر سکیں اور) تاکہ لوگ انصاف کو قائم کر سکیں اور (ساتھ ہی) ہم نے لوہے کو (پیدا کیا) اتارا جس میں بڑی طاقت اور لوگوں کے لئے بہت سی منفعتیں ہیں (یہ تمام چیزیں خدا نے اس لئے بھیجیں تاکہ دنیا میں امن و سلامتی کا دَور دورہ ہو جائے) اور اس طرح یہ دیکھا جا سکے کہ کون لوگ اُس (کے نظام کی) اس کے نتائج دیکھے بغیر امداد کرتے ہیں. (اور کون لوگ نہیں کرتے؟) بلاشبہ (خدا کا نظام ان لوگوں کی امداد کا محتاج نہیں ہے) وہ بڑی قوت اور غلبہ والا ہے۔

آیاتِ بالا پر غور کیجئے کہ سلسلۂ رشد و ہدایت "قانون اور میزان" وغیرہ سے مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ نوعِ انسانی میں عدل قائم رکھا جا سکے (لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ) اس لئے قرآنِ کریم کا نصب العین تمام نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود ہے وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۝ (۱۳/۱۷) (زمین میں وہی باقی رہتا ہے جو نوعِ انسانی کے لئے نفع رساں ہو) اور یہی وہ بلند و بالا نصب العین ہے جسے انسانیت کا نصب العین قرار پانا زیب دیتا ہے اور جس پر درحقیقت تمام

اعمال کی بنیاد رکھی جانی چاہیئے (SAMUEL) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

نصب العین، فلاحِ نوعِ انسانی ہے۔ اور فلاح کا انحصار کسی ایک ہی چیز پر نہیں.....
اس فلاح میں روحانی، اخلاقی، مادّی، اجتماعی، انفرادی، سب ہی قسم کے اجزاء آجاتے ہیں۔ یہ ہے حقیقی بھلائی جس کی تلاش انسان کا فریضہ ہے۔

یعنی ایسا نصابِ زندگی جس کا مطمحِ نگاہ تمام نوعِ انسانی کا مفاد ہو اور مفاد بھی کسی ایک شعبۂ زندگی کا نہیں بلکہ پوری کی پوری زندگی کا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم، عدل و انصاف کے معاملہ میں اپنے اور پرائے، یگانے اور بیگانے کی کوئی تمیز و تفریق روا نہیں رکھتا۔ حتیٰ کہ اس کا ارشاد ہے کہ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ز (۵/۸) "کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے انصاف نہ کرو۔ ہمیشہ انصاف کرو کہ یہ تقوٰے کے قریب ہے۔" اس سے اندازہ فرمالیجئے کہ وحی کی روشنی میں متعیّن کردہ نظامِ زندگی میں انسانی مساوات کس بلند مقام تک پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس عمارت کی بنیاد، وحدتِ خالق اور وحدتِ حیات کا عدیم النظیر اصول ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن، انسانوں کی تقسیم کفر و ایمان کی رُو سے کرتا ہے۔ لیکن اس تفریق میں ظلم و استبداد کا شائبہ تک نہیں۔ اس تقسیم سے مراد یہ ہے کہ جو انسان نظامِ زندگی کو مذکورۂ صدر اصول کی بنا پر متشکل کرنا چاہتے ہیں، وہ ایک جماعت کے فرد ہیں۔ اور جو اس کے خلاف، انسانوں کے خود ساختہ اصولوں کے ماتحت نظامِ حیات مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دوسری جماعت کے افراد۔ اور ظاہر ہے کہ فکر و عمل کے ایسے بنیادی اور اساسی اختلاف کی بنا پر تفریق و تمیز ضروری ہے۔ لیکن (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) اس تفریق و تمیز میں بھی بے انصافی کسی صورت میں روا نہیں رکھی جا سکتی۔ انسانیت کے بنیادی حقوق، مومن و کافر، دونوں کے لئے یکساں ہونگے۔ (تفصیل اپنے مقام پر آئے گی)۔ اسلام نے وحدتِ فکر و عمل کی اساس و بنیاد پر اس حقیقی اخوّت و مساوات کی فلک بوس عمارت قائم کی جسے دیکھ کر غیروں تک نے اعتراف کر لیا کہ فی الحقیقت مساوات اسی کا نام ہے۔ عیسائیت خود مساوات و مواخات کی مدّعی ہے۔ لیکن اسلامی مساوات اور عیسائیت کی مساوات کے فرق کے متعلق ایک عیسائی مشنری کی زبان سے سنیئے۔ (DR. MAUDE ROYDEN) اپنی کتاب (THE PROBLEM OF PALESTINE) میں لکھتی ہیں:۔

محمدؐ کے مذہب نے سب سے پہلے اس حقیقی جمہوریت کا اعلان کیا جس کا تصور ذہن انسانی میں آسکتا تھا۔ اس کا خدا ایسی بلند عظمتوں کا مالک ہے جس کے سامنے دنیا کی ہر قسم کی تفریق وتقسیم بالکل مٹ جاتی ہے حتیٰ کہ تفریقِ رنگ ونسل کی گہری خلیج بھی ناپید ہو جاتی ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح مسلمانوں میں بھی معاشرتی طبقات موجود ہیں لیکن اساسی (یعنی روحانی) طور پر سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ یہ بنیادی روحانی مساوات اس قسم کی افسانوی مساوات نہیں جیسی عام طور پر عیسائیوں کے ہاں پائی جاتی ہے۔ یہ مساوات مسلّم ہے اور حقیقی۔ مختلف اقوام میں اسلام کی عالمگیر اشاعت کی یہی وجہ ہے۔ یہی چیز افریقہ میں آج اس کی قوت کا راز ہے۔ جہاں عیسائی مشنری اس مساوات کی (ناکام) تبلیغ کرتے رہتے ہیں جس کا امتیازی نشان سفید اور سیاہ رنگ کی نمایاں تفریق کی صورت میں ہر جگہ سامنے رہتا ہے۔ یہ صرف مسلمان ہی ہے جو دیکھتا ہے کہ سفید، بھورے اور کالے رنگ کے باوجود وہ ہر جگہ بھائی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی اخوت کا راز رنگ پر نہیں مذہب پر ہے۔

اور یہ آج گئے گذرے زمانہ میں حالت ہے جبکہ اسلام کی تعلیم قصہ ماضی بن کر رہ چکی ہے کہئے کہ یہ تصورات کسی صورت میں بھی ذہنِ انسانی کی تخلیق ہو سکتے تھے؟ اور یہ تصوراتِ حیات پیش کس زمانہ میں کئے گئے؟ اُس زمانہ میں جب ساری دنیا میں ایسے تصورات قائم تھے جو اساسی طور پر ان سے یکسر مختلف تھے۔

دُنیا وہیں آرہی ہے!

اب اس سے ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ دنیا نے ان انقلابی تصوراتِ زندگی کی مخالفت کی اور جی بھر کر مخالفت کی لیکن اس کے بعد اس تیرہ سو برس میں ہوا کیا؟ یہ ہم سے نہیں، خود ان مخالفین سے پوچھئے! انسان ٹھوکریں کھا کھا کر آہستہ آہستہ، بتدریج بغیر نام لئے، ان ہی تصوراتِ حیات کی طرف بڑھ رہا ہے جن کی اس نے اس قدر مخالفت کی تھی۔ اس کی حالت یہ ہے کہ وہ تنہا عقل کے زور پر ایک نظام قائم کرتا ہے۔ لیکن اس کے ہاتھوں تنگ آکر اسے خود ہی توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ اس شکست وریخت میں اسے بڑی بڑی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں لیکن جب انسانیت آگ اور خون کی اس ہولی سے نکلتی ہے تو اس کا قدم اسی

نظام کی طرف اٹھتا ہے جس کی آواز چھٹی صدی عیسوی کی تاریکیوں میں سرزمینِ عرب سے بلند ہوئی تھی!
انقلابِ فرانس پر غور کیجئے۔ اس نے کس طرح ملوکیت کے تصور کو باطل قرار دے دیا چنانچہ آج سلاطین کے "آسمانی حقوق" کا تصور عہدِ جہالت کی یادگار قرار دیا جاتا ہے۔ (SAMUEL) عیسائیت پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

اس نے سلاطین کے آسمانی حقوق کے عقیدہ کی تائید کی۔ اس لئے یورپ کی تاریخ میں اس عقیدہ نے جس قدر برائیاں پھیلائیں، ان کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔

ملوکیت کے ساتھ ہی برہمنیت (PRIESTHOOD) کے "آسمانی حقوق" کا تصور بھی رفتہ رفتہ مٹتا چلا جا رہا ہے۔ سموئیل لکھتا ہے کہ "جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے۔ برہمنیت کا عقیدہ معاشرتی ترقی کے راستہ میں ایک سنگِ گراں بن کر حائل رہا ہے"۔ غلامی (SLAVERY) کا وجود (قریب قریب) مٹ چکا ہے۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد دنیا کے معاشی نظام میں جو انقلاب واقع ہوا ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ قومیت پرستی (NATIONALISM) کو تہذیبِ حاضرہ کا معرکہ آرار کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ جنگ (دوسری عالمگیر جنگ) میں اس کے خلاف جو کچھ دلوں کی دنیا میں اٹھ رہا ہے اس کے مظاہرے آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں۔ اقبالؒ نے کہا تھا۔

فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ (دیباچہ، پیامِ مشرق)

اس۔ نئے آدم اور نئی دنیا کی تعمیر کے دھندلکے سے خاکے آئے دن خاکِ مغرب کے ذرات سے ابھر کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ امریکہ کا مشہور سیاستدان، مسٹر ونڈل ولکی (WENDELL WILKY) ساری دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا وہ دلوں کی اس تبدیلی کا آئینہ دار ہے جو اس باب میں دنیائے انسانیت میں کروٹیں لے رہی ہے۔ اس نے لکھا تھا۔

اس سے مقصد یہ ہے کہ اگرچہ ہماری نشوونما جنگِ عظیم سے شروع ہو گئی تھی، لیکن ہم اپنی قومیت پرستی کے عہدِ طفولیت سے نکل کر جس میں تمام معاملات گھر بلو قسم کے متصور ہوتے تھے۔ اب ایک بالغ قوم کی حیثیت اختیار کر رہے ہیں جس کے پیشِ نظر بین الاقوامی مسائل اور تمام دنیا کا تصور ہے۔
(ONE WORLD; P-133)

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے یگانگت اور بیگانگت کا معیار رنگ و نسل نہیں بلکہ وحدتِ فکر و عمل ہے۔ مسٹر ولکی اس باب میں لکھتا ہے۔

> میں بارِ دگر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس کشمکش میں یہ دیکھنے کے لئے کہ کون کون سے لوگ حریف اور کون کون سے حلیف ہیں معیار رنگ اور نسل نہیں۔ (ایضاً ص ۱۲۵)

اور ذرا آگے چل کر۔

> اس جنگ کے بعد امریکہ کو تین راستوں میں سے کوئی ایک اختیار کرنا ہو گا۔ (i) تنگ قومیت پرستی جس سے لامحالہ یہ مراد ہے کہ ہم آخر الامر اپنی آزادی بھی کھو بیٹھیں ــــ یا (ii) بین الاقوامی استعماریت جس سے مطلب کسی دوسری قوم کی آزادی کی قربانی ہے اور یا (iii) ایک ایسی دنیا کی تخلیق جس میں ہر نسل اور ہر قوم کے لئے (نشو وارتقا کے) یکساں مواقع موجود ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اہلِ امریکہ بہت بڑی اکثریت سے اس آخری راستہ کو منتخب کریں گے۔ (ایضاً ص ۱۴۴)

دیکھا آپ نے کہ دنیا کس طرح قومیت پرستی کی تاریک وادیوں سے نکل کر انسانیت کی ہمہ گیر وسعتوں کی طرف چلی آ رہی ہے؟

ان حقائق کو سامنے رکھئے اور سوچئے کہ دنیا علمی و عقلی ارتقاء کے ساتھ اس نظام کی طرف بڑھ رہی ہے جو اُسے تیرہ سو برس پہلے دیا گیا تھا۔ یا اس کی مخالفت کر رہی ہے؟ آپ بلا شائبہ ظن و تخمین دیکھیں گے کہ دنیا غیر خدائی نظامِ زندگی کے ایک ایک شعبے کو آزمانے کے بعد ترک کئے جا رہی ہے اور یوں بطریق استخراج (BY PROCESS OF ELLIMINATION) صحیح نظامِ زندگی کی طرف کشاں کشاں چلی آ رہی ہے۔ اور اس طرح اس کی تمام دانش و بینش فی الحقیقت اس داعیٔ اعظم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے آستانِ عالیہ پر جھک رہی ہے جس نے انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے ایسا نظامِ خداوندی پیش کیا جو عین انسانی ارتقاء کے مطابق ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ یہ نظام میرے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ علمِ الٰہی ہے۔ کیا اس کے بعد بھی وحی کی صداقت کے متعلق کسی اور دلیل کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ اور پھر یہ کہ جب اسی ذاتِ اقدس و اعظم کے دیئے ہوئے نظام کی کڑیوں کے متعلق آپ نے عقل و بصیرت کی

رُو سے دیکھ لیا۔ تجربہ اور مشاہدہ سے پرکھ لیا کہ وہ فی الواقعہ حقیقت پر مبنی ہے تو کیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ اس تعلیم کا وہ حصّہ جس پر دنیا ابھی عمل نہیں کر سکی، غلط نہیں ہو سکتا۔ اس داعیٔ انقلاب نے تیرہ سو برس پیشتر کہا تھا کہ اس تعلیم کو اس لئے نہ جھٹلاؤ کہ یہ ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ تو سرتاپا بصیرت و حکمت پر مبنی ہے۔ تمہاری علمی اور عقلی سطح ابھی اتنی بلند نہیں ہوئی کہ تم اس کا احاطہ کر سکو۔ چنانچہ جوں جوں انسان کی علمی و عقلی سطح بلند ہوتی گئی اس نے دیکھ لیا کہ یہ دعویٰ کس قدر سچا تھا۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جتنا حصّہ باقی رہ گیا ہے اس کے متعلق بھی تسلیم کر لیا جائے کہ وہ عین مطابقِ علم و بصیرت ہے۔ لیکن ہمارے زمانہ کی علمی سطح ہنوز اتنی بلند نہیں ہوئی کہ اس کی صداقت کا ادراک کر سکے[1]۔

اس مقام پر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ یورپ نے علمی و عقلی بنیاد پر قرآنی نظامِ حیات کے بعض اجزاء کو پرکھ کر دیکھ لیا ہے۔ لیکن عملی طور پر اس نظام کو بالکلیہ قائم نہیں کیا۔ کہیں کہیں تھوڑا بہت مستعار لیا ہے۔ لیکن قرآنی نظام جزوں اور حصّوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک مکمل نظام ہے جسے پورے کا پورا اختیار کرنا ضروری ہے۔ یہ ایک مشین ہے جس کا ہر پُرزہ اپنی اپنی جگہ

یورپ کا نظام اسلامی نظام نہیں

کام دے رہا ہے۔ اس کے پُرزوں کو نکال کر مختلف مشینوں میں لگا لینے سے اصل مشین کے نتائج کبھی مرتب نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے فرمایا فَادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً یہ نظام پورے کا پورا اختیار کرنا ہو گا کہ حق و باطل میں اشتراک شرک ہے۔ قرآنی اور غیر قرآنی نظام کے اجزاء اکٹھے نہیں کئے جا سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل معاملہ مختلف معاشرتی یا سیاسی قوانین و دساتیر کا نہیں بلکہ اس بنیاد کا ہے جس پر یہ تمام عمارت قائم ہوتی ہے۔ اور یہ بنیاد ہے اس حقیقتِ عظمیٰ کا اعتراف کہ صحیح نظامِ انسانیت کا قیام صرف اس تعلیم کی روشنی میں ممکن ہے جو حقیقتِ کُلّی کے ادراک پر

---

[1] عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر یہ نظام ایسا ہی مبنی بر حقیقت تھا تو پھر یہ تھمّنے آگے کیوں نہ چلا۔ رُک کیوں گیا؟ اس کے متعلق اسی عنوان کے اخیر میں "خلاصۂ مبحث" ملاحظہ کیجئے۔

مبنی ہو۔ اس تعلیم کا سرچشمہ وحی ہے اور اسی کا دوسرا نام ایمان باللہ۔ اگرچہ دورِ جدید کے مغربی محققین، کائنات کے متعلق میکانکی تصوّر کے ظلمت کدہ سے باہر آ رہے ہیں۔ لیکن ان کے سامنے ابھی تک اس خدائے حکیم و بصیر کا پورا پورا تصوّر نہیں آیا جسے وحی پیش کرتی ہے۔ گو اس کے دھندلے سے نقوش کہیں کہیں محسوس ہو رہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ جب ابھی تک بنیاد ہی صحیح خط پر متشکل نہیں ہوئی تو اس پر قائم شدہ عمارت کو کس طرح صحیح تصوّر کر لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بساطِ سیاست میں مغرب کا نظامِ جمہوریت ہو یا معاشی دنیا میں آئینِ اشتراکیت (یا اسی قسم کے دیگر قوانین و دساتیر) انہیں کبھی اسلامی نظام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اُن قوانین کے خلاف صدائے احتجاج ہیں جن میں اس وقت تک انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی۔ اور یہ آواز بلند ہوئی ہے اس اثر سے جو قرآنی تعلیم نے غیر محسوس طور پر فضا میں پیدا کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں جو نظامِ زندگی آج قائم ہے وہ اس کے ہاتھوں بے حد نالاں ہے اور اسے تلاش ہے کسی ایسے نظام کی جو اس کے عالم سوز اضطراب کو مبدّل بہ سکون کر دے۔ اور اس تلاش میں انہیں اس امر کا احساس ضرور ہو رہا ہے کہ اس نظام کی بنیاد صحیح مذہب ہی پر رکھی جا سکتی ہے۔ تنہا عقل پر نہیں۔ سموئیل لکھتا ہے۔

یورپ اور مذہب کی تلاش

> دنیا یقیناً فوری طور پر مذہب کی محتاج ہے۔ انسان (ہمیشہ) درندوں کی طرح نہیں رہیں گے کہ (ان کی زندگی کا مقصد) محض مادی ضروریات اور طبیعی حوائج کی تسکین ہی ہو۔ رُحانی جذ اس کی فطرت کی گہرائیوں میں ہے۔ یہ ذہنی تیقن کہ دنیائے محسوس ہی (کائنات کی) آخری حد نہیں، ہمارے اندر (ہماری موجودہ تگ و تاز کے) بے معنی ہونے کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ ہمیں بہت سی ناقابلِ یقین باتوں پر ایمان لانے کے لئے کہا جاتا ہے لیکن یہ کہنا کہ کوئی چیز سرے سے ایسی ہے ہی نہیں جس پر ایمان لایا جائے۔ سب سے زیادہ ناقابلِ یقین بات ہوگی۔

اسی ایمان کا فقدان ہے جس کی وجہ سے دنیا آج اس طرح عدمِ طمانیت کی جہنم بن رہی ہے اور جس کی تلاش میں ہر نگہ دُور رس مجنونانہ بے قرار پھر رہی ہے۔ بقول پروفیسر کوہن،

> جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ انسان، ایمان کے بغیر بھی رہ سکتا ہے اسے آج کے نوجوانوں

کی حالت کا مطالعہ کرنا چاہیئے. جو مضطربانہ تلاش میں پھر رہے ہیں کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جس پر ایمان لایا جائے."

(THE CRISIS OF CIVILISATION)

یہ ایمان ہی کی شمعِ فروزاں ہے جو اس حقیقت کو انسان پر بے نقاب کر دیتی ہے کہ زندگی امروز و فردا کے پیمانوں سے ماپنے کی چیز نہیں. یہ ایک جوئے رواں ہے جس کے تسلسل و لاتناہیت کے سامنے کہکشاں بھی گردِ راہ ہے. پروفیسر جوڈ اس باب میں لکھتا ہے :-

> زندگی کے جاوداں، پیہم رواں عقیدہ ہی سے انسان میں امنگیں پیدا ہوتی ہیں. اسی سے اس میں عدم کو وجود میں لانے اور مستور کو بے حجاب کرنے کا حوصلہ آتا ہے اور یہ جدوجہد کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے...... لیکن جب زندگی کی وسعتیں سکڑ کر محدود ہو گئیں اور اس آب و گل کی نپی تلی دنیا کو اصلی حیات سمجھ لیا گیا تو پھر اعلیٰ قدروں پر ایمان کہاں.
>
> (ماخوذ از ماہنامہ کتاب، لاہور)

ایمان اور سیرت

یہ ایمان ہی ہے جو کسی نظام میں صحیح نتائج مرتب کرتا ہے اچھے سے اچھا نظام بھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ اس کے اربابِ بست و کشاد اسے قلب و نگاہ کی پاکیزگی سے نہ چلائیں. ایک نظام کو آپ حسابی قاعدے (MATHIMATICAL CALCULATIONS) سے جانچیں تو وہ نہایت عمدہ نتائج کا حامل دکھائی دے گا. لیکن عملی دنیا میں اس کے نتائج ویسے مرتب نہ ہوں گے. اس لئے کہ اگر اس نظام کو مشینوں کے ذریعے نافذ کیا جائے تو اس پر خارجی مؤثرات اثر انداز نہیں ہوں گے. لیکن وہ مشینوں کی جگہ انسانی قلوب و اذہان کی مدد سے نافذ ہوتا ہے. اس لئے جب تک اس نظام میں تطہیرِ فکر و نظر کی صلاحیت نہ ہوگی وہ عمدہ نتائج پیدا نہیں کر سکے گا. وحی کے ذریعے سے جو نظام مرتب ہوتا ہے اس کی بنیاد اس حقیقتِ عظمیٰ پر ہے کہ اس نظام کو چلانے والی جماعت کے لئے سیرت کی بلندی لاینفک ہے سیرت کی بلندی کے لئے بھی وہ کوئی خارجی ذرائع اختیار نہیں کرتا بلکہ خود اس نظام کے اندر یہ خوبی موجود ہوتی ہے کہ اس کے اتباع سے قلب و نظر میں از خود پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے بلکہ یوں کہیئے کہ سب سے پہلے یہی چیز پیدا ہوتی ہے. باقی سب کچھ اس کا نتیجہ ہوتا ہے. وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ

وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (۲۴/۵۵)۔ یعنی استخلاف فی الارض فطری نتیجہ ہوتا ہے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا اور یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر سیرت اور کیرکٹر کا قصرِ مشید استوار ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس نظام کے قیام سے انسان میں سیرت کی بلندی پیدا ہوتی ہے اور سیرت کی بلندی سے اس نظام میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور اس طرح یہ ایک ایسا دائرہ بن جاتا ہے کہ زمین و آسمان کی تمام برکتیں اس کے اندر آجاتی ہیں (جَنَّةٍ عَرۡضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ (۳/۱۳۳)۔ یہی وہ نظام ہے جس کی بنیاد ایمان پر ہوتی ہے۔ اور ایمان کے بغیر سیرت میں پختگی آ نہیں سکتی۔ بقول (HUXLEY) "مذہبی احساس سیرت کے لئے لازمی بنیاد ہے۔"

(ESSAY IN PAPULAR SCIENCE)

اس نظام میں حُسنِ عمل اپنے زندہ نتائج کی بنا پر حوصلوں کی افزائش اور ہمتوں کی بلندی کا موجب بنتا چلا جائے گا۔ اس سوسائٹی میں معیارِ عزت و فضیلت صرف تقوٰے ہوگا۔ یعنی یہ حقیقت کہ کون اپنی زندگی کو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھتا ہے اس معاشرہ میں ہر فرد دوسرے افراد کو ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرنے والے پروگرام پر عمل کرنے اور اس پر استقامت سے جمے رہنے کی تلقین کرے گا۔ (وَ تَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ) بُرائی کو ہر جگہ اور ہر مقام پر بُرا اور اچھائی کو اچھا سمجھا جائے گا۔ اور اسی میں انسانیت کی فلاح و سعادت کا راز ہے (STUART MILL)- لکھتا ہے۔

> اگر عدل، صداقت اور احسان کے اصولوں کی تعلیم کو جلوت و خلوت میں عام نہ کیا جائے۔
> اگر ان محاسن کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے اور ان کے برعکس معائب کو روکا نہ جائے تو
> یقیناً نوعِ انسانی کی حالت ابتر ہو جائے۔

(NATURE : THE UTALITY OF RELIGION AND THEISM)

اور یہ اصولِ عدل و صداقت کسی خاص قوم اور ملک تک محدود نہیں رہیں گے۔ بلکہ ان کی وسعتیں تمام نوعِ انسانی کو اپنی آغوش میں لے لیں گی۔ وحی کی یہی تعلیم ہے اور آج زمانہ نے اپنے تقاضوں سے ہر صاحبِ فکر کو اسی نتیجہ پر پہنچایا ہے۔

> پہلے پہل، مذہب نے انفرادی نجات پر زور دیا۔ پھر جب اجتماعی اخلاق کی اہمیت سامنے

آئی تو اس نے سوسائٹی کے لئے جدوجہد اور ایثار کی تاکید کی. لیکن اب جبکہ ایک بین الاقوامی ضابطۂ اخلاق کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے تو مذہب کے لئے بھی ضروری ہے کہ اپنی توجہات کو اسی نقطہ پر مرکوز کرے. وقت کا تقاضا ہے کہ تمام کلیسا' مذہب کے ذریعے ایک عالمگیر اخوّت کی تحریک چلائیں[1]

(SAMUEL; P-238)

سیرت کا مدار ایمان پر ہے

ہم نے یہ بتایا ہے کہ ایمان سے انسانی سیرت میں بلندی اور پختگی پیدا ہوتی ہے. معاملات کی دنیا میں یہ ہوسکتا ہے کہ آپ بنا بر مصلحت، دیانتداری کو بہترین پالیسی (حکمت عملی) قرار دیں یا سوسائٹی میں عزت حاصل کرنے اور دنیا میں مقبولیت کی زندگی بسر کرنے کے لئے آپ راست بازی اور حسنِ معاملگی کی روش اختیار کریں. یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ اس روش کو عقل و دانش کی رُو سے بہتر خیال کریں. یا یہ کہ آپ طبعاً منکسر المزاج، متواضع، خلیق، رحمدل واقع ہوئے ہوں. یا صدقہ اور خیرات (دان اور پُن) کے بعض کاموں کو نیکی کے کام تصوّر کر کے انہیں رسماً ادا کریں. ان میں سے کوئی چیز بھی سیرت کی پختگی نہیں کہلا سکتی. حسنِ سیرت کا تعلق نہ عقلی فیصلوں سے ہے نہ رسمی اعمال و کردار سے. سیرت کی پختگی اور بلندی دل کی تبدیلی سے متعلق ہے. اس کی تمام عمارت قلب کی بنیادوں پر اٹھتی اور استوار ہوتی ہے. جب تک دل کی دنیا میں انقلاب نہیں پیدا ہوتا. جب تک نگاہ کے زاویئے نہیں بدل جاتے' اس وقت تک تطہیرِ فکر اور صحیح اعمال ممکن نہیں. اور تحسین و تزئینِ سیرت، فکر و نظر کی تطہیر و تہذیب ہی کا نام ہے نہ کہ عقلی فیصلوں کا.

خرد نے کہہ بھی دیا لَا اِلٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہی وجہ ہے کہ فلسفہ، حسنِ سیرت کا ذریعہ نہیں بن سکتا. یعنی حسنِ سیرت کا تعلق استدلالی دنیا سے نہیں،

---

[1] چونکہ سموئیل کے سامنے مذہب عیسائیت ہے اس لئے اس نے تدریجی مراحل کا ذکر کیا ہے جن کی رُو سے وہ انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف آیا. اور اب اسے دعوت دی جارہی ہے کہ وہ بین الاقوامیت کی طرف توجہ کرے. لیکن وحی کی غیر محرّف تعلیم (قرآن) نے تو پہلے دن سے ہی انسانوں کی عالمگیر برادری کا تصوّر بخش کیا ہے.

عمل کی دنیا سے ہے جس کی بنا، ایمان پر ہے SCHLUMBERGER کے الفاظ میں۔

> فلسفہ کی اصطلاحات انسانی جذبات کی ترجمانی نہیں کر سکتیں۔ ان سے ہماری روح کی دنیا میں کوئی صدائے بازگشت نہیں اٹھتی۔ کسی قسم کی گونج نہیں پیدا ہوتی۔ وہ ہمیں ایک خالص عقلی تصور سے "زندہ خیال" کی طرف نہیں لے جاتیں۔

ہم نفس سے متعلقہ بحث میں (گذشتہ اوراق میں) بتا چکے ہیں کہ جوں جوں انسانی ذات میں وسعت اور بلندی پیدا ہوتی جاتی ہے اس میں (حدِ بشریت کے اندر) انائے مطلق (خدا) کی صفات مرتسم ہوتی جاتی ہیں۔ اسی کا نام حسنِ سیرت ہے۔ جب تک قلب کی دنیا میں اس انداز سے تبدیلی واقع نہیں ہوتی، سیرت کا مدار عقلی فیصلوں پر رہتا ہے جن پر کبھی اعتمادِ کلی نہیں کیا جا سکتا۔ صفاتِ خداوندی کے انسانی ذات میں منعکس ہوتے چلے جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی تمام آرزوئیں اور تمنائیں، اس کی خواہشات

حسنِ سیرت کیا ہے؟

کے میلانات و رجحانات، اس کے محبوبات و مطلوبات، اس کی خواہشات و مقتضیات سب اُس چشمۂ حسن و خیر سے ہم آہنگ ہوتے جاتے ہیں۔ اس کا نام ہے سیرت کی بلندی اور پختگی۔ علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں:

> مذہب کی آرزوئیں فلسفہ سے کہیں زیادہ بلند پرواز ہوتی ہیں۔ فلسفہ چیزوں کو عقلی طور پر دیکھتا ہے...... وہ حقیقت کو فاصلہ سے دیکھتا ہے، لیکن مذہب حقیقت سے قریبی تعلق پیدا کرتا ہے۔ ایک (یعنی فلسفہ) صرف نظریہ ہے۔ اور دوسرا (یعنی مذہب) جیتا جاگتا تجربہ، اور قریبی اور گہرا تعلق۔ اس گہرے تعلق کے حصول کے لئے خیال کو اپنی سطح سے بلند ہونا چاہیئے اور یوں اپنے مقصود کو قلب کی اس کیفیت کی رُو سے حاصل کرنا چاہیئے جسے مذہب کی زبان میں دعا[1] کہتے ہیں۔ دعا۔ یعنی ان (گراں بہا) الفاظ میں سے ایک لفظ جو آخری وقت حضور نبی اکرمؐ کی زبانِ اقدس پر تھے۔　　　　(خطبات، صـ۵۸)

دُعا کا مفہوم

دُعا کیا ہے؟ سازِ فطرت کے نغمۂ ازل سے ہم آہنگ ہونے کی حسین تمنا۔ عروسِ حقیقت کے حسنِ جہاں آرا و جاں نواز کی دل فریب رعنائیوں سے یک رنگی کی

---

[1] ہم نے (PRAYER) کا ترجمہ دُعا کیا ہے۔

مچلتی ہوئی آرزو. چکور کے سینے میں چاند کو اپنے سینے کے اندر سمو لینے کی کہکشاں گیر و فلک پیما والہانہ امنگ. قلبِ پروانہ میں شمعِ فروزاں کے انداز و اسلوب جذب کر لینے کا وجد انگیز و رقص آفریں جوش و خروش. یعنی انسانی خودی کا اپنی تناہیت کو وسیع سے وسیع کرتے چلے جانے کا بیتابانہ ولولہ، اور اس ولولہ کی تسکین کے لئے قطرۂ شبنم کی، سورج کی شعاعوں سے، بازوئے شاہین کی حسنِ طلب. بغور دیکھئے تو ایمان، دعا اور عمل تینوں ایک ہی شمع کی کرنیں اور ایک ہی پھول کی پنکھڑیاں ہیں. ایمان اس حقیقت کے اعتراف کا نام ہے کہ انسانی سیرت کی بلندی کا راز، نظامِ عالم کے مرکزِ خیر و خوبی سے ہم آہنگی میں پوشیدہ ہے. دُعا اس ہم آہنگی و یک رنگی کی شدید تڑپ ہے. اور عمل اس تڑپ کا زندہ مظاہرہ اور اس کے حصول کے لئے پیہم کوشش. مشہور عالمِ نفسیات (ولیم جیمز) لکھتا ہے کہ:۔

> سائنس جو جی میں آئے کرلے. انسان رہتی دنیا تک، برابر دعا میں مشغول رہے گا. (خطبات، صفحہ ۸۴)

غرضیکہ وحی ایک ایسا نظام قائم کرتی ہے جس میں اس نظام کے متبعین کی سیرت ایک خاص قالب میں ڈھل جاتی ہے جو جلال و جمال. یعنی قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت کا ایک عجیب و غریب پیکر ہوتا ہے. جس میں تسلیم و رضا اور غلبہ و تسلط کے متضاد عناصر کا حسین امتزاج نظامِ انسانیت کو نقطۂ اعتدال پر رکھنے کا موجب بنتا ہے.

نیٹشے کا فوق البشر

آج یورپ جس عذاب میں گرفتار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے سامنے "فوق البشر" (SUPERMAN) کا وہ تصور ہے جو نیٹشے کی تعلیم کا پیدا کردہ ہے اور جس میں "اندھی قوت" خالصتہً مادی پیکروں میں ڈھلی ہوئی سامنے آتی ہے. نیٹشے کے "فوق البشر" کی خصوصیات کے متعلق A. H. J. NIGHT اپنی کتاب

(SOME ASPECT OF THE LIFE AND WORKS OF NIETZSCHE)

میں لکھتا ہے.

> (فوق البشر) اہم مقاصد کی خاطر اخلاقی پابندیوں سے آزاد، فعّال، خلّاق، ہر قسم کی زنجیروں کو توڑنے والا اور کسی کے حکم کو نہ ماننے والا. اس کے نزدیک زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی ہوگی. ہر وہ شے جو تفوق اور قوت کی راہ میں حائل ہوگی فنا کردی جائے گی. گناہ، جہنم، موت، ضمیر (کی آواز) کا خوف (دل سے) نکال دیا جائے گا. (اس کے نزدیک) کسی پر رحم کھانا، بیماری

یا خود غرضی کے مرادف ہوگا۔ اس لئے کہ یہ چیز عمل کے راستے میں روڑا اٹکاتی ہے۔ (اس کا نصب العین یہ ہوگا کہ) صلابت، یعنی سختی (HARDNESS) دنیا میں بے بہا نیکی ہے۔

اندازہ فرمائیے! جو تمدن مادہ پرستی کی اندھی قوتوں کے اس تصور پر اُٹھے اس کے نتائج کس قدر عالم سوز ہوں گے؛ جب تک قوت، وحی کے تابع نہ ہو، دنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔

ہم نے بات یہاں سے شروع کی تھی کہ وحی کی تعلیم کو پرکھنے کا طریق استنتاجی (PRAGMATIC) ہے۔ یعنی آپ اس کے نتائج سے یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کی تعلیم کیسی ہے۔ اس باب میں اگر یہ دیکھنا ہو کہ قرآن وہ کونسا نظامِ زندگی پیش کرتا ہے جس کی مثل اور نظیر دنیا میں اور کہیں نہیں مل سکتی اور اس نظام کے نتائج و ثمرات کیا ہوں گے؛ تو اس کے لئے میری تصنیف "نظامِ ربوبیت" دیکھئے جس میں قرآن کی بنیادی تعلیم اور اس کے خوشگوار نتائج کو واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وہیں سے آپ کو اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا کہ اگر اسلام کا نظام ایسا ہی کامیاب اور خوشگوار نتائج کا حامل ہے تو وہ چند دن تک چل کر ختم کیوں ہوگیا۔ آگے کیوں نہ بڑھا۔

بابِ سوم

لفظ وحی کے لغوی معانی ہیں۔

(۱) خفی سا اشارہ جس میں تیزی بھی شامل ہو۔ یعنی تیز، خفی اشارہ۔

(۲) کتابت۔ یعنی لکھنا۔

(۳) حکم کرنا۔

(۴) کسی بات کا کسی کی طرف اس طرح پہنچانا کہ اسے اس کا علم ہو جائے خواہ اسے پہنچانے کی کیفیت یا ذریعہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔[1]

---

[1] حوالوں کے لئے دیکھئے میری لغات القرآن، باب (و۔ح۔ی)۔

یا خود غرضی کے مرادف ہوگا۔ اس لئے کہ یہ چیز عمل کے راستے میں روڑا اٹکاتی ہے۔ (اس کا
نصب العین یہ ہوگا کہ) صلابت' یعنی سختی (HARDNESS) دنیا میں بے بہا نیکی ہے۔
اندازہ فرمائیے! جو تمدن مادہ پرستی کی اندھی قوتوں کے اس تصور پر اُٹھے' اس کے نتائج کس قدر عالم سوز ہوں گے؛ جب تک قوت' وحی کے تابع نہ ہو' دنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔

ہم نے بات یہاں سے شروع کی تھی کہ وحی کی تعلیم کو پرکھنے کا طریق استنتاجی (PRAGMATIC) ہے۔ یعنی آپ اس کے نتائج سے یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کی تعلیم کیسی ہے۔ اس باب میں اگر یہ دیکھنا ہو کہ قرآن وہ کونسا نظامِ زندگی پیش کرتا ہے جس کی مثل اور نظیر دنیا میں اور کہیں نہیں مل سکتی اور اس نظام کے نتائج و ثمرات کیا ہوں گے؛ تو اس کے لئے میری تصنیف "نظامِ ربوبیت" دیکھئے جس میں قرآن کی بنیادی تعلیم اور اس کے خوشگوار نتائج کو واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وہیں سے آپ کو اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا کہ اگر اسلام کا نظام ایسا ہی کامیاب اور خوشگوار نتائج کا حامل ہے تو وہ چند دن تک چل کر ختم کیوں ہوگیا۔ آگے کیوں نہ بڑھا۔

بابِ سوم

لفظ وحی کے لغوی معانی ہیں۔

(۱) خفی سا اشارہ جس میں تیزی بھی شامل ہو۔ یعنی تیز' خفی اشارہ۔

(۲) کتابت۔ یعنی لکھنا۔

(۳) حکم کرنا۔

(۴) کسی بات کا کسی کی طرف اس طرح پہنچانا کہ اسے اس کا علم ہو جائے خواہ اسے پہنچانے کی کیفیت یا ذریعہ کچھ ہی کیوں نہ ہو[۱]۔

---

[۱] حوالوں کے لئے دیکھئے میری لغات القرآن' باب (د۔ ح۔ ی)۔

لیکن اصطلاح میں اس کے معنی ہیں وہ علم جو خدا کی طرف سے کسی انسان کو براہِ راست دیا جائے۔ اس کے حامل کو نبی کہتے ہیں۔ اور غیر از نبی اس میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ وحی کا یہ سلسلہ حضور خاتم النبیینؐ پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کسی کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم نہیں مل سکتا۔ جو اس کا دعویٰ کرتا ہے وہ درحقیقت نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشف و الہام وغیرہ کے تصورات سب غیر قرآنی ہیں اور مہرِ نبوت کے توڑنے کے موجب۔ خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنے کا ایک ہی نام تھا۔۔ وحی۔۔ اور وہ سلسلہ اب بند ہو چکا ہے۔

علاوہ بریں اشیائے کائنات کے اندر جو علم رکھ دیا گیا ہے اور جس کی رُو سے وہ اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرمِ عمل، اور اپنی اپنی جبلی روش پر گامزن رہتی ہیں، اسے بھی وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں وحی کا لفظ اپنے عام (لغوی) معانی میں بھی استعمال ہوا ہے اور خالص اصطلاحی معانی میں بھی۔ مثلاً حضرت زکریا علیہ السلام کے تذکرہ کے ضمن میں ہے کہ ان سے کہا گیا کہ وہ تین شب تک لوگوں سے ہمکلام نہ ہوں چنانچہ

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ۝ (۱۹/۱۱)

پھر وہ قربان گاہ سے نکلا اور اپنے لوگوں میں آیا (جو حسبِ معمول اس کا انتظار کر رہے تھے) اس نے (زبان نہ کھولی) اشارہ سے کہا ہمیشہ احکامِ خداوندی کی اتباع میں سرگرداں رہو۔

یہاں "وحی" کے معنی اشارہ کرنے کے ہیں۔ سورۂ انعام میں ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (۶/۱۱۳)

اور (اے پیغمبر!) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے (جب اس کی دعوت کا ظہور ہوا تو) اپنوں اور بیگانوں میں سے بڑے بڑے لوگوں کو دشمن ٹھہرا دیا جو ایک دوسرے سے خوشنما باتوں کی سرگوشیاں کرتے تاکہ لوگوں کو فریب دیں۔

یہاں "وحی" کے معنی باہمی سرگوشیاں کرنا ہے۔ اس سے ذرا آگے ہے۔

وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ (۶/۱۲۲)

اور (دیکھو) شیاطین اپنے مددگاروں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے رہتے ہیں تاکہ تم سے کج بحثی کریں۔

یہاں وحی کے معنی وسوسہ اندازی کے ہیں (یا حکم دینے کے)۔

یہ تو ہیں لفظ وحیؔ کے لغوی معنی لیکن جیساکہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ ایک علم تو وہ ہے جسے انسان اپنی عقل و فکر سے حاصل کرتا ہے۔ اس علم کے دروازے ہر انسان کے لئے بقدرِ ظرف کھلے ہیں۔ لیکن دوسرا علم وہ ہے جسے عقل و فکر کی بناء پر خود حاصل نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ وہیں سے (از خود) ملتا ہے جہاں سے اشیائے کائنات کو ان کی تخلیق ملتی ہے۔ یعنی اس کا سرچشمہ خدا کی مشیّت ہے۔ یہ خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا ہے۔ کائنات کی ہر شے اسی علم کی بناء پر جو اس کے اندر داخل ہے، اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرمِ عمل ہے۔ سورۂ حٰمٓ میں ہے۔

وحی کی قسمیں

فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ اَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (۴۱/۱۲)

چنانچہ (تمہارے پروردگار نے) فضائی کُروں کو متعدد بلندیوں (کی شکل) میں دو مقررہ دوروں میں مکمل کردیا اور ہر کرّے کو اس کا علم دے دیا (وحی کردیا) کہ اس کے ذمّے کیا کام ہے۔

یہ وہ وحی ہے جس کی رُو سے ان فضائی بلندیوں میں خدا کا امر تدبیری نافذ العمل ہے اور اس طرح ہر فضائی کرّہ اپنے فریضۂ مفوّضہ کی سرانجام دہی میں سرگرداں ہے۔ اسی طرح زمین کے متعلق ہے کہ وہ "قیامت" میں اپنے سربستہ رازوں کو اُگل کر رکھ دے گی اور یہ بھی خدا کی وحیؔ کے مطابق ہوگا۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ (۹۹/۴-۵)

(اور دیکھو) اس دن زمین تمام خبریں بیان کردے گی۔ اس لئے کہ تیرے پروردگار نے اس کی وحی کی ہوگی۔

جنگِ بدر کے سلسلہ میں ملائکہ کے متعلق فرمایا۔

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ (۸/۱۲)

(اے پیغمبر!) یہ وہ وقت تھا کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں پر وحی کی تھی کہ میں تمہارے ساتھ

ہوں (یعنی میری مدد تمہارے ساتھ ہے) پس مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔

اسی طرح حیوانات اپنی جبلّی قوّتوں سے جن امور کو سرانجام دیتے ہیں اس کے لئے بھی وحی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ جہانِ فطرت کے بہترین ماہرِ فنِ تعمیر (ARCHITECT) یعنی شہد کی مکھی کے متعلق ارشاد ہے۔

وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۙ (۱۶/۶۸)

اور (دیکھو) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کر رکھی ہے کہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اس غرض سے بلندی میں بنادی جاتی ہیں چھتہ بنائے۔

ہدایت اس وحی کو خدا کی طرف سے راہ نمائی (ہدایت) کہہ کر بھی پکارا گیا ہے۔ یعنی خدا نے ہر شے کو اس کی تخلیق عطا کی اور پھر اس کے اندر یہ ملکہ بھی رکھ دیا کہ وہ کس نہج سے زندگی بسر کرے۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ○ (۲۰/۵۰ نیز ۸۷/۳)

موسیٰ نے کہا "ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی، پھر اس کی (تکمیل تک پہنچنے کی) راہ نمائی کی۔

یہی وہ "راہ نمائی" ہے جس کی بنا پر آم کی گٹھلی اپنی ارتقائی منازل طے کرتی کرتی خوش رنگ، خوش ذائقہ، خوشبودار آم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہی وہ "ہدایت" ہے جس سے بکری کا بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کے تھنوں کی طرف لپکتا ہے اور چڑیا کا بچہ دانے کے لئے مُنہ کھول دیتا ہے۔

انسانوں کی دُنیا یہاں تک تو کائنات کے ان گوشوں کا ذکر تھا جن میں انسان شامل نہیں ہے یا اگر انسان شامل ہے تو صرف اس کے بچے کی ابتدائی زندگی تک جس میں وہ بھی دوسرے حیوانوں کی طرح فطری جبلّت سے کام لیتا ہے۔ مثلاً پیدائش کے ساتھ ہی وہ بھی اپنی خوراک کے لئے ماں کی چھاتیوں کی طرف ہمک کر جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد انسانی دنیا کا وہ گوشہ آتا ہے جس میں یہ اپنی عقل وخرد سے کام لے کر چلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے اس گوشے میں اس کے اندر سے کوئی راہ نمائی نہیں ملتی۔ یہاں وحی کا وہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے جو باقی حیوانات میں عمر بھر تک ان کے ساتھ رہتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کو اس امر میں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ محض اپنی عقل کی بنا پر جس طرح جی چاہے اپنے فیصلے آپ کر لیا کریں؛ ہم سابقہ اوراق میں دیکھ چکے ہیں کہ انسان کو اس طرح نہیں چھوڑا گیا بلکہ اُسے بھی خدا کی طرف سے راہ نمائی دی گئی ہے. لیکن اس راہ نمائی کا طریقہ بدل دیا گیا ہے. یہ فرزندِ آدم کے دل میں از خود نہیں ڈال دی گئی. اگر ایسا کر دیا جاتا تو انسان بھی حیوانات کی طرح مجبور ہوتا کہ وہ اپنی اس داخلی آواز پر آنکھیں بند کر کے چلتا رہتا. لیکن انسان کو اختیار وارادہ دیا گیا ہے اس لئے اس کی راہ نمائی کے لئے ایسا طریقہ اختیار کیا گیا جس سے اس کے اختیار وارادے پر کوئی اثر نہ پڑے. یعنی اس کا جی چاہے تو یہ اس راہ نمائی کو اختیار کرے اور جی چاہے تو اس سے سرکشی برتے.

اس راہ نمائی کے لئے طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ انسانوں میں سے بعض کو اس مقصدِ عظیم کے لئے چن لیا گیا اور انہیں وہ راہ نمائی دے دی گئی جس کے مطابق چلنے سے انسان اپنی زندگی کے منتہیٰ تک پہنچ جائے. یہ راہ نمائی اس برگزیدہ انسان کو وحی کے ذریعے ملتی تھی اور اسے کہہ دیا جاتا تھا کہ اسے دوسرے انسانوں تک پہنچا دے. یعنی یہ وحی اسے بھی اسی طرح بلاکسب وہنر ملتی تھی جس طرح کائنات کی دوسری چیزوں کو ملتی ہے. لیکن اس کے ذمے یہ فریضہ بھی عائد کر دیا جاتا تھا کہ وہ اس وحی پر خود بھی عمل کرے اور اسے دوسروں تک بھی پہنچائے. جس شخص کو یہ وحی دی جاتی تھی اسے نبی یا رسول کہا جاتا ہے (ان الفاظ کا فرق ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا). اس میں کوئی غیر نبی شامل نہیں ہوتا. جو شخص کہتا ہے کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے سمجھ لیجئے کہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نبی اور رسول ہے.

○

ہمکلامی کی صورتیں

قرآنِ کریم نے ان دونوں صورتوں کو ایک ہی جگہ بیان کیا ہے. جہاں فرمایا.

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ○ (۴۲/۵۱)

اور دیکھو؛ کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے ہم کلام ہو بجز ان صورتوں کے کہ (وہ رسولوں سے) وحی کے ذریعے بات کرے یا پردہ کے پیچھے سے (جیسے حضرت موسیٰ

کے ساتھ) اور (غیر انبیاء سے) اس طرح کہ ان تک اس کا رسول اس کے قانونِ مشیت کے مطابق وحی پہنچائے۔

پہلی قسم کی وحی کی شکل یہ ہے کہ ملائکہ کے ذریعے قلبِ نبوی پر خدا کے کلام کا القاء ہو۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(۲/۹۷ نیز ۱۹۲–۱۹۴/۲۶)

(اے پیغمبر!) جبریل کا کون دشمن ہو سکتا ہے؟ یہ تو اللہ کا کلام ہے جو جبریل نے اللہ کے قانون کے مطابق تمہارے قلب میں اتارا ہے اور اس تعلیم کو سچ کر کے دکھانے کے لئے آیا ہے، جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے۔ اس میں انسان کے لئے ہدایت ہے اور ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں (فلاح و کامیابی کی) بشارت۔

دوسری قسم، پردہ کے پیچھے سے بذریعہ آواز کے۔ جیسے حضرت موسیٰؑ کے ضمن میں فرمایا۔

وَ نَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝ (۱۹/۵۲)

ہم نے اسے کوہِ طور کی داہنی جانب سے پکارا اور (وحی کی) سرگوشیوں کے لئے اپنے سے قریب کیا۔

حضرات انبیاء کرامؑ کو اس طرح خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی اور وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے تھے۔ اس کو رسالت کہتے ہیں[1]۔

ہدایتِ آسمانی کا سلسلۂ وحی

یہ ہے وہ وحی جس کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب انسان کو دنیا میں ہدایت کی ضرورت پیش آئی اور یہ سلسلہ منزل بہ منزل کارواں در کارواں آگے بڑھتا ہوا اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآنِ کریم میں محفوظ ہو گیا۔

اِنَّاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ كَمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ

---

[1] چونکہ وحی رسالت ایک خالصتہً انفرادی تجربہ ہے جس سے نبی کے علاوہ اور کوئی لذت آشنا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم قطعاً نہیں جان سکتے کہ انکشافِ حقیقت کی ان مختلف صورتوں کی نوعیت و ماہیت کیا ہوتی ہے۔

وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ...... وَ کَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا٥ (۱۶۳-۱۶۵/۴)

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوح پر اور ان نبیوں پر جو نوح کے بعد پیدا ہوئے بھیجی تھی۔ اور جس طرح ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اولادِ یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان پر بھیجی اور داؤد کو زبور عطا فرمائی۔ نیز خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم نے بیان کر دیا ہے، اور وہ جن کا حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا، اور (اسی طرح) اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام کرنا ہوتا ہے۔ یہ تمام رسول (صحیح روشِ زندگی کے خوشگوار نتائج کی) خوشخبری دینے والے اور (انکارِ حق کے نتائج سے) آگاہ کرنے والے تھے (اور اس لئے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے اور نیک و بد بتلانے کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے سامنے پیش کر سکیں (یعنی یہ عذر کر سکیں کہ ہمیں راہِ حق کی طرف کسی نے دعوت نہیں دی تھی) اور خدا (اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

سورۂ شوریٰ میں ہے۔

شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ...... اَللّٰهُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ٥ (۴۲/۱۳) نیز (۴۲/۳)

اور (دیکھو) خدا نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی ہم نے تمہاری طرف وحی کی ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو (مع ان کے متبعین کے) حکم دیا تھا کہ دین کے نظام کو قائم رکھنا اور تفرقہ اندازی (کی لعنت سے) بچنا۔ (تمام انبیاء کو یہی حکم دیا گیا تھا۔ کیونکہ اصول کے اعتبار سے مختلف انبیاء کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں۔ مگر) مشرکین کو وہ بات جس کی طرف (اے پیغمبرِ اسلام!) تم انہیں بلا رہے ہو بڑی گراں گذر رہی ہے (شاید انہیں یہ ناگوار ہو رہا ہے کہ منصبِ نبوت سے ان میں سے کوئی سرفراز کیوں نہ کیا گیا) خدا اپنی طرف سے (منصبِ رسالت کے لئے) جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ اور پھر جو شخص انبیاء کی طرف آئی ہوئی ہدایت کے ذریعے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے تو خدا اسے

زندگی کے منتہیٰ تک لے جاتا ہے۔

حضرت نوحؑ کے متعلق فرمایا،

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا...... (۲۳/۲۷)

پس ہم نے نوح کی طرف وحی بھیجی کہ "ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنا۔

سورۂ انبیاء میں حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ کے بعد فرمایا،

وَ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ؕ وَ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ○ وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۙ (۲۱/۷۲-۷۳)

اور پھر ہم نے اُسے (ایک فرزند) اسحاق عطا فرمایا اور مزید برآں (پوتا) یعقوب۔ ان سب کو ہم نے صالح بنایا تھا۔ ہم نے انہیں (انسانوں کی) پیشوائی دی تھی۔ ہمارے حکم کے مطابق وہ راہ دکھاتے تھے۔ ہم نے ان پر وحی بھیجی کہ ہر طرح کے بھلائی کے کام انجام دیں۔ نیز نظام صلوٰۃ قائم کریں اور نوعِ انسانی کی نشوونما کا انتظام کریں۔ چنانچہ وہ سب ہمارے قوانین کی اطاعت میں سرگرمِ عمل رہتے تھے۔

حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ اپنے بھائی (حضرت ہارونؑ) کو ساتھ لے کر فرعون کے دربار میں جاؤ اور وہاں دعوتِ کلیمی کا اعلان کرو کہ

اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ○ (۲۰/۴۸)

جو کوئی جھٹلائے اور سرتابی کرے تو ہم پر وحی اُتر چکی ہے کہ اس کے لئے عذاب کا پیام ہے۔

کوئی رسول ایسا نہیں تھا جس پر وحی نہ آئی ہو کہ رسول (پیغامبر) کہتے ہی اسے ہیں جو پیغام لے کر آتے۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ○ (۲۱/۲۵ نیز ۱۶/۴۳؛ ۳۹/۶۵)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس پر اس بات کی وحی ہم نے نہ بھیجی ہو کہ کائنات میں کسی کا اقتدار و قانون نہیں بجز ہمارے۔ پس چاہیئے کہ میری ہی محکومیت

(اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کرو۔

نبیِ اکرمؐ پر قرآن کریم بطور وحی نازل کیا گیا۔

إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ ٱلْقَصَصِ بِمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ هَٰذَا ٱلْقُرْءَانَ وَإِن كُنتَ مِن قَبْلِهِۦ لَمِنَ ٱلْغَٰفِلِينَ ۝ (۲-۳/۱۲؛ نیز ۴۲/۷)

ہم نے اسے اس شکل میں اتارا کہ یہ واضح اور مفصّل زبان کی کتاب ہے تاکہ تم سمجھو بوجھو (اے پیغمبر!) اس قرآن کی وحی کر کے ہم تجھے بہتر سے بہتر طریقہ پر (پچھلی سرگذشتیں سناتے ہیں، اور یقیناً قرآن کے نازل ہونے سے پہلے تو انہی لوگوں میں سے تھا جو (ان سرگذشتوں سے) بے خبر تھے۔

دوسرے مقام پر اسی کو کتاب کہا گیا ہے[1]:

وَٱتْلُ مَآ أُوحِىَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَٰتِهِۦ وَلَن تَجِدَ مِن دُونِهِۦ مُلْتَحَدًا ۝ (۱۸/۲۷؛ ۱۷/۳۹؛ ۲۹/۴۵؛ ۳۵/۳۱)

اور (اے پیغمبر!) تیرے پروردگار کی کتاب جو تجھ پر وحی کی گئی ہے اس کا اتباع کرتا رہ اللہ کا قانون کوئی بدل نہیں سکتا۔ اور تجھے اس کے سوا کوئی پناہ کا سہارا ملنے والا نہیں!

انبیاء سابقہ کی وحی کا اوّلین اور بنیادی اعلان بھی خدا کی توحید تھا۔

قُلْ إِنَّمَا يُوحَىٰٓ إِلَىَّ أَنَّمَآ إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَٰحِدٌ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ (۲۱/۱۰۸)

تو کہہ دے "مجھ پر جو کچھ وحی کیا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ تمہارے لئے اقتدار و اختیار صرف خدا کا ہے (اس کے سوا کسی کا نہیں) پس بتلاؤ تم اس کے آگے سر جھکاتے ہو یا نہیں؟"

---

[1] کتاب اور حکمت کسے کہتے ہیں؟ اس کی تشریح اپنے مقام میں آئے گی۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ دونوں قرآن کریم ہی کے اندر ہیں، اس سے باہر نہیں۔

حضورؐ اسی وحی سے انسانوں کے وضع کردہ قوانینِ زندگی کے انجام و عواقب سے آگاہ فرماتے تھے۔

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ۝ (۲۱/۴۵ نیز ۳۸/۷۰)

(اے پیغمبر!) تو کہہ دے "میری پکار اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی وحی سے علم پاکر تمہیں متنبہ کررہا ہوں اور (یاد رکھ) جو اپنے کانوں سے کام نہیں لیتے ہیں، انہیں کتنا ہی خبردار کیا جائے کبھی سننے والا نہیں!

اسی وحی سے ملّتِ ابراہیمیؑ کے اتباع کا حکم دیا گیا۔

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۱۶/۱۲۳)

اور پھر (اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ (اسی) ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرو۔ ہر طرف سے ہٹا ہوا (صرف دینِ حق ہی پر کاربند رہنے والا) اور جو مشرکین میں سے نہ تھا۔

(اس کی تفصیل اپنے مقام پر ملے گی)۔ یہ وحی خدائے علیم وحکیم کی طرف سے آتی تھی۔

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝ (۲۷/۶)

اور بلاشبہ (اے پیغمبر!) تم پر یہ قرآن خدائے حکیم وعلیم کی جانب سے القا کیا جاتا ہے۔

اس قرآن کا رسول اللہؐ کو پڑھا دینا اور پھر اس کا جمع کردینا بھی خدا کے ذمہ تھا۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ ۚ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ (۷۵/۱۷-۱۸)

قرآن کو جمع کرنا اور اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔ پھر جب ہم اسے پڑھ چکیں (ہمارا فرشتہ پیغام کو پہنچا چکے) تو پھر اس کی قرأت کی پیروی کرو (اسے اسی طرح دہراؤ اور اسی طرح جم کر اس پر عمل کرو)۔

وحی صرف خیالات کا القا نہیں

اس آیۂ جلیلہ کو ذرا غور سے دیکھئے (فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ) "جب ہم پڑھیں تو اس کے پیچھے پڑھا کرو"۔ یہ ہے وحی کی حقیقت۔ محض خیالات کا دل میں ڈال دینا نہیں۔ بلکہ اس طرح سے الفاظ کو پڑھانا جیسے معلّم، متعلّم کو پڑھاتا ہے۔ (یہاں یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ قرآن کریم کے محض مطالب

ہی وحی نہیں بلکہ اس کے الفاظ بھی وحی ہیں. تفصیل اس اجمال کی عنوان "قرآن" میں ملے گی. یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ کوئی خیال، الفاظ کے بغیر ممکن نہیں. "خیال اور الفاظ، احساس کے سرچشمہ سے بیک وقت باہر آتے ہیں" (خطبات صلا) اس کے ساتھ ہی اللہ نے اس کی بھی وضاحت کردی کہ وحی کا سرچشمہ یکسر خارجی (OBJECTIVE) ہوتا ہے. صاحبِ وحی کے اپنے خیالات، جذبات و رجحانات ومیلانات کا اس میں قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا. یعنی وحی کا علم داخلی (SUBJECTIVE) نہیں ہوتا. چنانچہ سورۃ والنجم میں ہے.

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (۵۳/۳)

اور (دیکھو ہمارا پیغمبر) اپنے جذبات کے تابع کچھ نہیں کہتا.

تلاوتِ وحی | پھر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے. وحیٔ رسالت سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ حیات ہے. اس لئے حضورؐ کو حکم دیا گیا تھا وہ اس وحی کو دوسروں تک بھی پہنچائیں.

تبلیغ رسالت | يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ

(۵/۶۷)

لے پیغمبر! تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر جو کچھ نازل ہوا ہے اسے (خدا کے بندوں تک)

لے سورۃ ابراہیم میں ہے.

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (۱۴/۴)

"اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں تاکہ وہ انہیں کھول کر بتا دے"

یہاں سے ظاہر ہے کہ رسول کا پیغام اس کی قوم کی زبان میں ہوتا ہے. چونکہ رسول اللہ کے اولین مخاطب عرب تھے اس لئے قرآن عربی زبان میں نازل ہوا. لیکن قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ تک کے لئے ضابطۂ حیات ہے' اس لئے اس کے عربی زبان میں ہونے سے یہ مراد نہیں کہ وہ صرف عربوں کے لئے ہے.

پہنچادو (اور دشمنوں کی مخالفت کی کچھ پروا نہ کرو) اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو (پھر) خدا کا پیغام نہیں پہنچایا (یعنی ادائے فرضِ رسالت میں کوتاہی کی) اور اللہ تمہیں انسانوں (کے شر) سے بچائیگا وہ اس گروہ پر (کامیابی) کی راہ نہیں کھولتا جس نے کفر کی راہ اختیار کی ہے!

اتّباعِ وحی

صرف پہنچانا ہی نہیں بلکہ خود وحی کا اتّباع بھی کرنا۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ (۱۰/۱۰۹ نیز ۳۵/۱۰ از ۳۲/۱۵)

اے پیغمبر! جو کچھ تم پر وحی کی جاتی ہے اس پر چلتے رہو اور اپنی راہ میں جمے رہو۔ یہاں تک کہ اللہ (تمہاری جماعت اور فریقِ مخالف کی کشمکش میں) فیصلہ کردے۔ اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!

اسی سے تمسّک کا حکم ہے۔

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِي أُوحِيَ إِلَيْكَ ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ (۴۳/۴۳)

اور (اے پیغمبرِ اسلام!) انہی ہدایات کے ساتھ تمسّک کرو جن کی تمہاری طرف وحی کی گئی ہے۔ بلاشبہ تم سیدھے راستے پر ہو۔ [اسی پر گامزن رہو]۔

یہ کوئی نئی بات نہ تھی

یعنی رسول کو حکم دیا جاتا تھا کہ وہ اس وحی کو دوسروں تک پہنچائے اور پھر اس کے مطابق ایک معاشرہ قائم کرے جس میں تمام افرادِ معاشرہ وحی کا اتّباع کریں۔ اور یہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔ سلسلۂ وحی و رسالت اور اس کا اتّباع کا مسلک شروع سے چلا آرہا تھا۔

قُلْ مَا كُنتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ (۴۶/۹)

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو کہ میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں، (بلکہ جماعتِ انبیاء کا ایک فرد ہوں۔ مجھ میں کوئی ایسی انوکھی بات نہیں ہے جو اور رسولوں میں نہ ہو) مجھے قطعاً معلوم نہیں کہ (کل) میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا؟ میں تو صرف ان ہدایاتِ خداوندی کا اتّباع کرتا ہوں جن کی میری طرف وحی کی گئی ہے۔ میں تو صرف (نوعِ انسانی کو اس کے بُرے

اعمال کے نتائج سے) کھلے طور پر (واضح طریقہ سے) آگاہ کرنے والا ہوں (اور بس!)

اتباعِ وحی سے انسان ہمیشہ راہِ راست پر رہتا ہے۔ اور اس کے سوا، راہنمائی کی کوئی دوسری شکل ہے ہی نہیں۔ (خواہ کسے باشد)۔

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْٓ اِلَیَّ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ ۝ (۳۴/۵۰)

اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ اگر میں معاشرہ کے تدبیرِ امور میں کہیں کوئی غلطی کرتا ہوں تو وہ غلطی میرے اپنے اجتہاد کی غلطی ہوتی ہے اور جہاں بالکل سیدھی راہ پر چلتا ہوں تو وہ اس وحی کی رُو سے ہوتی ہے جو میرا پروردگار میری طرف نازل کرتا ہے۔ وہ بیشک ہر ایک بات سننے والا اور ہر ایک کے قریب ہے۔

یقینی علم اس لئے کہ حتمی اور یقینی علم صرف وحی ہے جس میں ظنّ و تخمین کا کوئی شائبہ نہیں۔ حضورؐ سے ارشاد ہے:۔

وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ۝ (۲/۱۲۰)

اور (حقیقت یہ ہے کہ تم اپنی سچائی کی کتنی ہی نشانیاں پیش کرو، لیکن) یہود اور نصاریٰ تم سے خوش ہونے والے نہیں۔ وہ تو صرف اسی حالت میں خوش ہو سکتے ہیں کہ تم اُن کی (بنائی ہوئی) ملّتوں کے پیرو ہو جاؤ۔ (کیونکہ جس بات کو انہوں نے دین سمجھ رکھا ہے وہ گروہ پرستی کے تعصب کے سوا کچھ نہیں ہے) پس تم اُن سے (صاف صاف) کہہ دو کہ خدا کی ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو ہدایت کی حقیقی راہ ہے (نہ کہ تمہاری خودساختہ ملّتیں اور گروہ بندیاں، اور میری راہ وہی ہے) اور یاد رکھو اگر تم نے ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی، باوجودیکہ تمہارے پاس علم و یقین کی روشنی آچکی ہے، تو (یہ ہدایتِ الٰہی سے صریح انحراف ہوگا، اور پھر) اللہ کی دوستی اور مددگاری سے تم یکسر محروم ہو جاؤ گے۔

کیونکہ وحی کو خدا اپنے علم سے نازل کرتا ہے۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ (۴/۱۶۶)

اے پیغمبر! اگر یہ لوگ تمہاری سچائی سے انکار کرتے ہیں، (تو انکار کریں) لیکن اللہ نے جو کچھ تم پر نازل کیا ہے وہ اسے نازل کر کے (تمہاری سچائی کی) گواہی دیتا ہے اور اس نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے۔

اور باطل اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا۔

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ (۴۱/۴۲)

(اور دیکھو) باطل نہ تو اس کے آگے سے آ سکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ (قرآن) خدائے حکیم و حمید کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے۔

غیب کی وحی چونکہ وحی علمِ خداوندی پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں وہ امورِ غیب منکشف کئے جاتے ہیں جو حیطۂ علمِ انسانی میں نہیں آ سکتے۔ قصۂ حضرت مریمؑ کے ضمن میں فرمایا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝ (۳/۴۴)

(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی ہم تم پر وحی کر رہے ہیں۔ ورنہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ تم اس وقت ان لوگوں کے پاس موجود نہ تھے جب ہیکل کے مجاور اپنے اپنے تیر پھینک رہے تھے کہ (قرعہ ڈال کر فیصلہ کر لیں) کون مریم کا کفیل ہو۔ اور (یقیناً) تم اس وقت بھی موجود نہ تھے، جب وہ (مریم کی کفالت کے لئے) آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

حضرت نوحؑ کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ

وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ (۱۱/۴۹)

(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے وحی کے ذریعے ہم تجھے بتلا رہے ہیں. اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں تُو جانتا تھا، نہ تیری قوم.

قصہ حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں فرمایا.

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ يَمْكُرُوْنَ ○ (۱۲/۱۰۲)

(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی ہم تجھ پر وحی کر رہے ہیں. ورنہ (ظاہر ہے کہ) جس وقت یوسف کے بھائی سازش میں مصمم ہو گئے تھے اور پوشیدہ تدبیریں کر رہے تھے، تو تم اُس وقت کچھ اُن کے پاس کھڑے نہ تھے (کہ سب کچھ دیکھ سُن لیا ہو).

قصہ حضرت موسیٰؑ اور اہلِ مدین کے متعلق حضورؐ سے ارشاد ہوا.

وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَ مَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۙ (۲۸/۴۴)

اور (اے پیغمبرِ اسلام!) تم (کوہِ طور کی) مغربی جانب میں موجود نہیں تھے. جب ہم نے موسیٰ کو امر (رسالت) حوالہ کیا اور نہ ہی تم وہاں حاضر تھے.

یعنی یہ تمام امورِ غیب حضورؐ پر بتوسطِ وحی منکشف ہوئے تھے. وحی کے بغیر حضورؐ ان سے واقف نہ تھے.

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ○ (۱۲/۳)

(اے پیغمبر!) اس قرآن کی وحی کر کے ہم تجھے بہتر سے بہتر طریقہ پر (پچھلی) سرگذشتیں سناتے ہیں، اور یقیناً قرآن کے نازل ہونے سے پہلے تو اُنہی لوگوں میں سے تھا جو (ان سرگذشتوں سے) بے خبر تھے.

نہ صرف امورِ غیب، بلکہ تمام علوم جن سے صاحبِ وحی بذاتِ خویش ناآشنا ہوتا ہے (۴/۱۱۳).

علمِ خصوصی یہی وجہ ہے کہ رسولؐ اپنے ماحول کی پیداوار نہیں ہوتا. ورنہ اس کا علم اپنے گرد و پیش سے آگے نہ بڑھ سکتا. یہ وحی ہے جس کی بنا پر وہ اپنے ہم عصروں سے ایک

جداگانہ علم رکھتا ہے۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا۔

أُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ (۷/۶۲)

میں اپنے پروردگار کا پیغام تمہیں پہنچاتا ہوں اور پند و نصیحت کرتا ہوں، اور اللہ کی طرف سے اس بات کا علم رکھتا ہوں جو تمہیں معلوم نہیں۔

عام ماحول تو ایک طرف، صاحبِ وحی کا علم (جو بذریعہ وحی ملتا ہے) اس کے اپنے افرادِ خاندان، حتیٰ کہ اب و جد سے بھی جداگانہ ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے فرمایا۔

يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ٥ (۱۹/۴۳)

اے میرے باپ! میں سچ کہتا ہوں، علم کی ایک روشنی مجھے مل گئی ہے، جو تجھے نہیں ملی۔ پس میرے پیچھے چل، میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں گا۔

○

وحی کی قسمیں

رسول اللہ کو خدا کی طرف سے جو وحی ملی تھی وہ قرآن کے اندر محفوظ ہو گئی۔ قرآن سے باہر اور کہیں بھی وحی نہیں۔ ہمارے ہاں جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وحیٔ متلو (یعنی جس وحی کی تلاوت کی جاتی ہے) اور دوسری وحیٔ غیر متلو (یعنی جس وحی کی تلاوت نہیں کی جاتی)۔ تو قرآن سے اس عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔ قرآن سے صرف ایک ہی قسم کی وحی کی سند ملتی ہے اور وہ وحی قرآن کے اندر ہے۔ وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْ بَلَغَ (۹/۱۹) "ان سے کہہ دے کہ میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں غلط روشِ زندگی کے نتائج سے آگاہ کر دوں۔ اور انہیں بھی جن تک یہ قرآن پہنچے۔[۱]

غیر نبی اور وحی

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، وحی صرف انبیاء کے لئے مخصوص ہوتی ہے اور غیر از نبی کو نہیں ملتی۔ قرآن کریم میں دو تین مقامات پر وحی کا لفظ غیر از نبی

---

[۱] ان امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب "مقامِ حدیث"۔

کے لئے بھی آیا ہے. مثلاً حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے متعلق ہے. وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی (۲۸/۷) "اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی" (کہ بچے کو دریا میں بہا دے) یا حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے متعلق ہے کہ "میں نے حواریوں پر وحی کی کہ وہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لائیں" (۵/۱۱۱). ظاہر ہے کہ ان مقامات میں وحی کا لفظ "حکم دینے" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے خواہ اس کا ذریعہ کچھ ہی ہو. حضرت موسیٰؑ کی والدہ کی طرف یہ حکم، کسی نبی کی وساطت سے پہنچایا گیا ہوگا. اور حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں تک خود حضرت عیسیٰؑ کی وساطت سے. ان آیات میں 'اُوحی' کے معنی اس قسم کی وحی کرنا نہیں جس قسم کی وحی حضرات انبیاء کرامؑ کی طرف کی جاتی تھی، وہ وحی غیر از نبی کی طرف کی ہی نہیں جاتی تھی. (نہ اب کسی کی طرف کی جا سکتی ہے). باقی رہا "کشف والہام": سو ان کا ذکر قرآن میں نہیں. مسلمانوں نے اسے دوسروں سے مستعار لیا ہے. اقبالؒ کے الفاظ میں "تصوّف، اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے." قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ نزولِ قرآن کے بعد اللہ تعالیٰ بعض برگزیدہ بندوں کو بذریعہ الہام کچھ بتا دیا کرے گا. اس نے قرآن نازل کر دیا. اسے مکمّل کر دیا. اسے غیر متبدّل بنا دیا (۶/۱۱۶). اس کی حفاظت کا خود ذمہ لیا (۱۵/۹). اور اس طرح بابِ نبوّت کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا. اب علم کے دو ہی ذرائع ہیں. خدا کی یہ کتاب اور اس پر غور و فکر کرنے کے لئے عقل و فکرِ انسانی وَ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ .... اس لئے ہمارے لئے دین کی سند قرآن ہے اور علم و بصیرت اس کے سمجھنے کا ذریعہ. کشف والہام کا دین سے کوئی تعلق نہیں (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ ایک اکتسابی فن ہے اور ہر شخص کسب و ہنر سے اسے حاصل کر سکتا ہے).

خلاصۂ مبحث

حیاتِ جاوداں کی خواہش انسان کی دلی آرزو ہے. یہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے. انسانی ماجریات کے تمثیلی بیان، یعنی قصۂ آدم میں دیکھئے. ابلیس نے انسان کے اسی کمزور پہلو سے فائدہ اٹھایا اور اسے یہ کہہ کر ورغلایا کہ آؤ! تمہیں حیاتِ جاوید کا راز بتاؤں. اس نے کہا کہ بقائے ذات کا ذریعہ افزائش نسل ہے اور نسل و خاندان کا تحفّظ عقلی اسباب و ذرائع سے حاصل کیا جا سکتا ہے. یعنی اس نے بالفاظِ دیگر یہ کہا کہ انسان عملِ ارتقاء کی ایک میکانکی تخلیق ہے اور اس کے سامنے مسئلہ صرف طبعی حوائج و ضروریات کے حل کا ہے.

اور یہ حل علمِ محسوسات، یعنی عقل کے ذریعہ تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابلیس کے پیش کردہ نظریہ کی رُو سے مادّی زندگی کے علاوہ انسان کی کوئی زندگی نہیں اور اسی مادی پیکر کی بقاء حیاتِ جاوید ہے۔ اس کے برعکس خالقِ فطرت نے کہا کہ یہ غلط ہے کہ انسان محض حیوانات ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اور اس کے سامنے مسئلہ صرف اس کی طبیعی ضروریات کا ہے جو علمِ محسوسات کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہیں۔ نفسِ انسانی مادہ سے ماوراء ہے اور بقا کا راز نفس کے استحکام میں پوشیدہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کے مادّی پیکر کا تحفّظ و استحکام بھی ضروری ہے (کہ یہی وہ قلعہ ہے جس کے اندر اس کی خودی کی فوج متمکّن ہے) لیکن منتہائے نگاہ فقط مادّی پیکر کا تحفّظ ہی نہیں بلکہ نفسِ انسانی کا تحفّظ و استحکام ہے اور یہ تحفّظ علمِ محسوسات (عقل یا علمِ استدلالی) سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ علمِ محسوسات عالمِ طبیعیات سے متعلق ہے اور نفسِ انسانی دنیائے طبیعیات سے ماوراء ہے اس کے لئے ایسی راہ نمائی کی ضرورت ہے جس کا سرچشمہ مادّی کائنات سے ماوراء ہو۔ اس کا نام وحی ہے۔

پہلے دن سے آج تک، یہی ایک سوال ہے جو نوعِ انسانی کے لئے کشمکشِ پیہم کا موجب بن رہا ہے۔ اسی کا نام ابلیس و آدم کی آویزش ہے۔ یعنی ایک گروہ اس کا مدعی ہے کہ انسانی زندگی بس اسی مادّی پیکر کی زندگی ہے۔ اس لئے انسانی مسائل کا حل، علمِ محسوسات (عقل) کے ذریعے مل سکتا ہے ماورائے عقل کچھ نہیں ہے۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی اسی مجلسِ آب و گل کی زندگی نہیں بلکہ یہ پیکر، نفسِ انسانی کا قالب ہے۔ اصل زندگی، نفسِ انسانی کی زندگی ہے اور اسی کی بقا، درحقیقت بقا ہے۔ چونکہ نفسِ انسانی محسوسات کی دنیا سے ماوراء ہے اس لئے اس کے حفظ و بقا سے متعلق مسائل کا حل محسوسات کی دنیا میں نہیں مل سکتا۔ بلکہ اس کی راہ نمائی کے لئے ایسی روشنی کی ضرورت ہے جو اس دنیا سے آرہی ہو جس سے نفسِ انسانی متعلق ہے۔ اس روشنی (وحی) کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ عقل (علمِ استدلال) اس کے اندر آجاتی ہے۔ لیکن یہ، عقل کے محدود و متناہی دائرہ کے اندر نہیں آسکتا۔ یہ دونوں نظریاتِ زندگی دو الگ الگ بنیادیں ہیں جن پر دو مختلف تہاذیب کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

یہ ہمارا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ انسان کے اندر کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جو فی الواقعہ استدلالی علم کے دائرہ سے باہر ہیں. جبلّی عادات، ضمیر کی آواز، ذوقِ جمالیات، اختیار و ارادہ. ان کا تعلق انسان کے مادّی جسم سے نہیں. اس میں شبہ نہیں کہ یورپ کے ان علمائے طبیعیات نے (جن کے نزدیک مادّہ سے ماوراء اور کوئی دنیا نہیں) بہت کوشش کی ہے کہ ان چیزوں کی بھی مادّی توجیہات پیش کی جائیں. لیکن رفتہ رفتہ خود وہیں کے حکماء اور محققین نے ان کا ردّ کر دیا اور اب تحقیقاتِ جدیدہ کا رُخ اسی طرف ہے کہ یہ تمام معاملات نفسِ انسانی سے متعلق ہیں جو اس مادّی پیکر کی تخلیق نہیں. انہوں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ نفس کی کُنہ و حقیقت سے متعلق بھی تحقیقات کی جائیں. لیکن چونکہ نفس، محسوسات کی دنیا کی چیز نہیں اور ان کے ذرائع تحقیق محسوسات و استدلال کی دنیا سے متعلق ہیں. اس لئے ان ذرائع سے نفس کی حقیقت کا علم حاصل نہیں ہو سکتا. وہ زیادہ سے زیادہ نفس کے لزوم و ماجریات یا اس کے دوائرِ اثر و نفوذ سے بحث کر سکتے ہیں. اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے. (ان اشارات کی تفصیل، سلسلۂ معارف القرآن کی ایک آیندہ کڑی میں جا کر ملے گی جس کا نام ہے "انسان نے کیا سوچا؟").

ہماری کائنات محسوسات کی دنیا ہے جس میں ہر آن تغیّرات رونما ہوتے رہتے ہیں. لیکن اس کائنات کے پیچھے ایک حقیقت (REALITY) ہے جو تغیّرات سے ماوراء ہے. رازِ کائنات معلوم نہیں کیا جا سکتا جب تک **ادراکِ حقیقت** نہ ہو. جب حیات، شعور سے متمسّک ہوتی ہے تو نفس متشخص ہو جاتا ہے. لہٰذا نفس کی کنہ و حقیقت سے آگہی کے لئے رازِ حیات یا ادراکِ حقیقت ضروری ہے. واضح رہے کہ نفس (انسانی ذات، یا PERSONALITY) حیات یا شعور کا پیدا کردہ نہیں. قرآن اسے "روحِ خداوندی" کہہ کر پکارتا ہے. یہ ہر انسان کو پیدائش کے ساتھ ہی خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے. البتہ اس کے تشخّص سے آگہی اس منزل میں جا کر ہوتی ہے جب حیات، شعور کے ساتھ متمسّک ہوتی ہے، بلکہ یوں کہئے کہ انسان کا شعورِ خویش، نفس کی بنیادی خصوصیت ہے. علمِ محسوسات (سائنس یا طبیعیات) کے ذریعے حقیقت کے صرف ان پہلوؤں کی جھلک سی سامنے آ سکتی ہے. جن میں محسوس طور پر وہ اپنا نمود کرتی ہے. لیکن یہ حقیقتِ کُلّی کا

ادراک نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ان مختلف پہلوؤں کو یک جا جمع کر لیا جائے تو ان کی حاصلِ جمع حقیقتِ کلّی ہو جائے اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ سائنس، حقیقت کو جزاً جزاً دیکھ سکتی ہے تماماً نہیں۔ اور جب تک حقیقت تماماً سامنے نہ آجائے اس کے مختلف گوشوں کا باہمی ربط و ضبط سمجھ میں نہیں آسکتا۔ لہٰذا تنہا عقل کی رُو سے، انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے جو نظام بھی متعین کیا جائے گا وہ انسانی زندگی کے کسی ایک گوشے کے لئے مفید نتائج کا کفیل ہو تو ہو، کلّی ارتقائے انسانیت کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے وہی نظام مفید ہو سکے گا جو انسان کو تماماً و کمالاً سامنے رکھ کر متعین کیا گیا ہو (اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں **دین** ہے) اور جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ عقل کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے ماورائے عقل کسی سرچشمہ کی ضرورت ہے۔ ماورائے عقل وجدانیات کی دنیا ہے۔ لہٰذا اب دیکھنا یہ ہے کہ دنیائے وجدانیات میں حقیقت کا ادراکِ کُلّی ممکن ہے؟ اور اگر ہے تو کس مقام پر؟

علمِ غیر استدلالی میں سب سے پہلے ہمارے سامنے جبلّت یا ضمیر کا میدان آتا ہے۔ حقیقت ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اس لئے ادراکِ حقیقت کا نتیجہ ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ہی ہونا چاہئے۔ لیکن جبلّت کا اختلاف اور ضمیر کی آواز کی بوقلمونی ایک بدیہی چیز ہے۔ یہی صورتِ وجدان (شدّتِ ذوق) میں ہے۔ لہٰذا جبلّت اور وجدان (یا حدس) حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس سے آگے باطنیت (یا تصوّف) کی دنیا آتی ہے۔ لیکن بغور دیکھا جائے تو اسے محض اس اعتبار سے دنیائے وجدان میں شامل کیا جا سکتا ہے کہ قوّتِ نفس (قوّتِ ارادی یا قوّتِ خیال) کے نتائج، دلائلِ عقلی کی رُو سے سمجھے یا سمجھائے نہیں جا سکتے۔ اس لئے یہ علمِ استدلالی کی حدود سے خارج ہے لیکن اس اعتبار سے کہ یہ فن یکسر اکتسابی ہے اور مشق و ریاضت سے اس میں اضافہ ہو سکتا ہے اسے سرچشمۂ علم قرار ہی نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ایک فن ہے۔

پھر جبلّت اور وجدان کی طرح، باطنیت (تصوّف) کے نتائج بھی باہمدگر مختلف ہوتے ہیں اور یہ اختلاف فرعی یا جزئی نہیں۔ بلکہ اصولی اور اساسی ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ یہ تجربہ بالکل انفرادی ہوتا ہے اور نوعِ انسانی کی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے کوئی پیغام اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اس کے طریق فکر کی طرف آیئے تو یہ خارجی دنیا سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور سمجھتا یہ ہے کہ داخلی اور خارجی دنیا

دو الگ شعبے ہیں جو نہ صرف ایک دوسرے سے غیر متعلق ہیں بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں حالانکہ ایک حقیقت کے دو گوشے کبھی باہمد گر متضاد نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا باطنیت (تصوّف) کی دنیا بھی حقیقت کا ادراکِ کلّی نہیں کر سکتی۔

اس کے بعد ہمارے سامنے علمِ غیر استدلالی کا آخری مقام آتا ہے جسے مقامِ نبوّت کہا جاتا ہے یہ وہ علمِ حقیقی ہے جس میں کسب و ہنر کو کوئی دخل نہیں۔ اس لئے یہ یکسر وہبی ہے۔ اسی علم کو وحی کہا جاتا ہے۔ وحی کی رُو سے حاصل شدہ تعلیم میں کبھی کہیں، کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ وحی انسان کی تماماً ترجمان ہوتی ہے اس لئے اس کی رُو سے متعیّن کردہ نظام انسان کی جملہ مضمر صلاحیتوں کی نشو ونما اور تکمیل کا ضامن ہوتا ہے۔ قرآن نے یہی نظام نبئ اکرمؐ کی وساطت سے عملی طور پر متشکّل کیا تھا۔

وحی منزّل من اللہ ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ صاحبِ وحی کسب و ہنر سے اس ملکہ کو اپنے اندر سے پیدا نہیں کرتا۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ حقیقت کا انکشاف نہیں کیا جا سکتا بلکہ حقیقت خود اپنے آپ کو منکشف کرتی ہے۔ لیکن یہ انکشاف یونہی نہیں کر دیا جاتا بلکہ جس قلبِ مطہر کو کائنات کے اس عظیم الشان راز کا امین بنانا مقصود ہوتا ہے وہ شرفِ انسانیت کے معراجِ کبریٰ پر فائز ہوتا ہے اسی لئے صاحبِ وحی، وراثت اور ماحول کے اثرات سے منزّہ اور دنیا کی ہر غلط روش کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت لئے ہوتا ہے۔ وہ حقیقت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اس لئے اس کی آنکھ کہیں دھوکا نہیں کھاتی نہ اس کا دل کسی فریب میں آتا ہے۔

قرآنِ کریم میں وحی کا لفظ 'غیر استدلالی دنیا کے مختلف گوشوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ان میں نبوّت' وحی کی ایک منفرد اور خصوصی شکل ہے جس میں کوئی اور شامل نہیں ہو سکتا۔ یہ ادراکِ حقیقت کا مکمل اور واحد ذریعہ ہے اور نوعِ انسانی کے لئے ایک انقلاب در آغوش پیغام۔ جو لوگ اپنے خوابوں کے اوہام اور ذہنی وساوس کے ڈانڈے اس وحی سے جا ملاتے ہیں، وہ وحی کی حقیقت سے باخبر نہیں ہوتے۔ حقیقت کا مکمّل انکشاف صاحبِ قرآن کے قلبِ منوّر پر ہو چکا۔ اب شرفِ انسانیت کا راز

اس تعلیم کے اتباع میں ہے۔ اور اس اتباع کی صحیح صورت یہ ہے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کو وحی کی تعلیم کے خط و خال پر متشکل کیا جائے۔ نبوّت ختم ہو گئی اس لئے خدا سے براہِ راست علم ملنے کا دروازہ بند ہو گیا۔ اب انسان کے لئے علم کے ذرائع دو ہی ہیں۔ قرآنِ کریم اور عقلِ انسانی۔

(اس کتاب کے اخیر پر "نگۂ بازگشت" کے عنوان کے تحت' وحی کے متعلق انہی حقائق و تفاصیل کو ایک دوسرے انداز میں سمٹا کر لکھ دیا گیا ہے۔ بہتر ہو کہ ساتھ کے ساتھ ایک نگاہ اس پر بھی ڈال لی جائے تاکہ اس کے تمام گوشے مختلف زاویوں سے سامنے آجائیں)۔

الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ

رسالت

فلک کی بات بتادی زمیں کے محرم کو

○

سفالم را مئے اُو جامِ جم کرد درونِ قطرہ ام پوشیدہ یم کرد

خرد اندر سرم بت خانہ ریخت خلیلِ عشق دیرم را حرم کرد

○

رسالت

ہبوطِ آدم کے وقت نوعِ انسانی سے کہا گیا تھا کہ

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ (٢/٣٨)

ہمارا حکم ہوا' اب تم سب یہاں سے نکل چلو' (اور جس نئی زندگی کا دروازہ تم پر کھولا جا رہا ہے' اسے اختیار کر لو) لیکن (یاد رکھو) جب کبھی ایسا ہو کہ ہماری جانب سے تمہیں ہدایت ملے تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا' اس کے لئے نہ کسی طرح کا کھٹکا ہو گا نہ کسی طرح کی غمگینی۔

دوسری جگہ اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ (٧/٣٥)

(اور فرمانِ الٰہی ہوا تھا) اے اولادِ آدم! جب کبھی ایسا ہو کہ میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں اور میری آیتیں تمہیں پڑھ کر سنائیں تو جو کوئی ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گا اور اس طرح اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دے گا تو اس کے لئے نہ کسی طرح کا اندیشہ ہو گا

نہ کسی طرح کی غمگینی۔

پیام رسانی

اس سے ظاہر ہے کہ وہ ہدایتِ خداوندی جس کا وعدہ نوعِ انسانی سے کیا گیا تھا، خدا کے رسولوں کی وساطت سے ملنی تھی. لہٰذا ہدایتِ آسمانی وہی ہے جسے اللہ کے رسول پیش کریں. رسول (پیغامبر) کو رسول کہا ہی اس لئے جاتا ہے کہ وہ رسالات (پیاماتِ) خداوندی پہنچاتا ہے. حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا.

أُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ أَنْصَحُ لَكُمْ وَ أَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ (۷/۶۲)

میں اپنے پروردگار کا پیغام تمہیں پہنچاتا ہوں، اور پند و نصیحت کرتا ہوں، اور اللہ کی طرف سے اس بات کا علم رکھتا ہوں جو تمہیں معلوم نہیں.

یہی کچھ حضرت ہود، صالح، شعیب (علیہم السلام) نے فرمایا. (دیکھئے ۷/۶۸؛ ۷/۷۹؛ ۷/۹۳). خود نبیٔ اکرمؐ سے ارشاد ہے.

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ٥ (۵/۶۷)

اے پیغمبر! تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اسے (خدا کے بندوں تک) پہنچا دو (اور دشمنوں کی مخالفت کی کچھ پروا نہ کرو) اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو (پھر) خدا کا پیغام نہیں پہنچایا. (یعنی ادائے فرضِ رسالت میں کوتاہی کی اور اللہ تمہیں انسانوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا. وہ اس گروہ پر (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا جس نے کفر کی راہ اختیار کی ہے.

سورۂ اعراف کی مندرجہ صدر آیت (۷/۳۵) پر ایک بار پھر غور کیجئے. نوعِ انسانی سے ارشاد ہے کہ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ اس میں مِنْكُمْ (تم میں سے) کا لفظ توجہ طلب ہے. یعنی اگرچہ ہدایت کا سرچشمہ انسانوں کی دنیا سے ماوراء ہے لیکن یہ ہدایت جن رسولوں کے توسط سے ملے گی وہ انسان

رسولؐ انسان ہی ہوتے تھے

ہی ہوں گے. انسانی جہالت کا تقاضا چونکہ توہم پرستی ہے اس لئے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی

کہ جو شخص اللہ کی طرف سے رسول ہے وہ اُن جیسا ایک آدمی کیسے ہو سکتا ہے؟ اسے عالمِ بشریت سے الگ کچھ اور ہونا چاہیئے (وہ تو خیر عہدِ جہالت تھا۔ آج بھی تو ہم پرستی کا یہ عالم ہے کہ جن لوگوں میں "روحانیت" سمجھی جاتی ہے انہیں انسانی دنیا سے کچھ الگ تھلگ تصور کیا جاتا ہے) اسی لئے قرآن کریم نے متعدد مقامات پر حضرات انبیاء کرامؑ کی بشریت کو کھلے اور واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ کہیں اس انداز میں کہ لوگ، رسولوں کی بشریت پر تعجب کرتے تھے اور معترض ہوتے تھے کہیں اس اسلوب سے کہ خود حضرات انبیاء کرامؑ اپنی بشریت کا اعلان فرماتے اور لوگوں کے دل پر اس حقیقت کو نقش کرتے تھے۔ قصۂ حضرت نوحؑ کے ضمن میں فرمایا۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا ۝ (۱۱/۲۷ نیز ۲۳/۳۳)

اس پر قوم کے ان سرداروں نے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی کہا کہ ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو۔

حضرت صالحؑ کی قوم نے بھی یہی کہا۔

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۲۶/۱۵۴)

تم تو ہمارے ہی جیسے ایک آدمی ہو (ہمیں تو تم میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے خدا نے تمہیں رسالت کے لئے منتخب کیا ہو) اگر تم (درحقیقت) سچے ہو تو کوئی نشانی لاؤ۔

یہی قوم حضرت شعیبؑ نے کہا۔

وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (۲۶/۱۸۶)

اور تم تو ہمارے ہی جیسے ایک آدمی ہو اور ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔

جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) نے فرعون اور اس کی قوم کے سامنے دعوتِ کلیمی کو پیش کیا تو انہوں نے بھی یہی اعتراض کیا تھا۔

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۝ (۲۳/۴۷)

تو وہ بولے کیا خوب! ہم اپنے ہی جیسے دو انسانوں پر ایمان لے آئیں. اور وہ انسان بھی اس قوم کے افراد جو ہماری محکوم ہے.

ہر رسول کے متعلق یہی اعتراض ہوتا تھا.

ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا وَّ اسْتَغْنَى اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ (۶۴/۶)

بات یہ تھی کہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ اُن کے رسول آتے تھے اور وہ کہہ دیا کرتے کہ کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے؟ چنانچہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور (دعوتِ حق سے) اعراض برتتے تھے (بالآخر) خدا کی دعوت ان سے مستغنی ہوگئی اور اللہ تو ہمیشہ سے بے نیاز اور ستودہ صفات ہے.

سورۂ ابراہیم میں اس اجمال کو ذرا تفصیلاً بیان کیا گیا ہے. قومِ نوح اور عاد و ثمود کے تذکرہ کے بعد فرمایا.

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ.........

وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (۱۰-۱۱/۱۴)

ان کے رسولوں نے کہا "کیا تمہیں اللہ کے بارے میں شک ہے؟ وہ اللہ کہ آسمان و زمین کا بنانے والا ہے وہ تمہیں بلا رہا ہے کہ وہ تمہارے لئے تخریبی قوتوں سے محفوظ رہنے کا سامان پیدا کر دے اور ایک وقتِ مقررہ تک (زندگی و کامرانی کی) مہلتیں دے.

اس پر قوموں نے کہا کہ تم اس کے سوا کیا ہو کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور پھر چاہتے ہو کہ جن معبودوں کی ہمارے باپ دادا اطاعت کرتے آئے ہیں ان کی اطاعت سے ہمیں روک دو. اچھا (اگر ایسا ہی ہے تو) کوئی واضح دلیل پیش کرو.

ان کے رسولوں نے جواب میں کہا، ہاں ہم اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ تمہاری ہی طرح کے آدمی ہیں. لیکن اللہ جس بندہ کو چاہتا ہے اپنے فضل و احسان کے لئے چن لیتا ہے. اور یہ بات ہمارے اختیار میں نہیں کہ تمہیں کوئی سند لا دکھائیں مگر ہاں یہ کہ اللہ کے حکم سے ہو. اور اللہ ہی ہے جس پر ایمان رکھنے والوں کا بھروسہ ہے.

خود نبی اکرمؐ کے متعلق بھی یہی اعتراض تھا۔

وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ
لَوْلَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ (۲۵/۷)

اور لوگوں نے کہا۔ یہ رسول کیسا ہے (جو عام انسانوں کی طرح) کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اتار دیا گیا جو اس کے ساتھ ڈرانے والا ہوتا۔

اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ
وَ يَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ (۲۵/۲۰)

اور (اے پیغمبر اسلام!) ہم نے تجھ سے پہلے تمام رسول ایسے ہی بھیجے تھے جو کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔

دوسری جگہ ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ؕ (۱۳/۳۸)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تجھ سے پہلے (بیشمار) پیغمبر قوموں میں پیدا کئے اور (وہ تیری ہی طرح انسان تھے) ہم نے انہیں بیویاں بھی دی تھیں اور اولاد بھی۔

لوگوں کو تعجب تھا کہ انہی میں سے ایک آدمی پر کس طرح وحی نازل ہو سکتی ہے۔

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ
وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ... (۱۰/۲)

کیا لوگوں کو اس بات پر اچنبا ہوا کہ انہی میں سے ایک آدمی پر ہم نے وحی بھیجی؟ اس بات کی وحی کہ لوگوں کو (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کر دے اور ایمان والوں کو خوشخبری دے دے کہ پروردگار کے حضور ان کے لئے اچھا مقام ہے۔

جتنا زیادہ انہیں تعجب تھا، اتنی ہی زیادہ شدت و تکرار سے نبی اکرمؐ اپنی بشریت کا اعلان فرماتے تھے۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ
وَّاحِدٌ ۚ (۱۸/۱۱۰ ؛ ۴۱/۶)

(اے پیغمبرِ اسلام! صاف صاف) کہہ دے کہ میں تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں. البتہ اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تمہارا اِلٰہ وہی ایک ہے اس کے سوا کوئی نہیں.

تمام رسول مرد تھے

پھر اس امر کی بھی تصریح فرما دی کہ تمام رسول مرد تھے.

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۙ (۱۶/۴۳ نیز ۱۲/۱۰۹؛ ۲۱/۷)

اور (اے پیغمبرِ اسلام!) تجھ سے پہلے ہم نے جتنے رسولوں کو بھیجا، تو اسی طرح بھیجا کہ وہ مرد تھے ان پر ہم وحی بھیجتے تھے (ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آسمان کے فرشتے یا دیویاں اتر آئی ہوں) پس (اے منکرینِ حق!) اگر خود تمہیں (یہ بات) معلوم نہیں تو ان لوگوں سے دریافت کرلو جو (آسمانی کتابوں کی) سمجھ بوجھ رکھتے ہیں (یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے کہ رسول مرد ہوتے تھے).

ایسا کیوں ہوا؟

اللہ تعالیٰ اس پر قادر تھا کہ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آسمان سے نورانی فرشتے اُتر آتے اور وحی کے الفاظ کو بستیوں اور قریوں، امتوں اور جماعتوں میں نشر کر دیا کرتے. لیکن پیغام رسانی کے اس مافوق الفطرت طریق سے انسانی رشد و ہدایت کا مقصد فوت ہو جاتا. ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ انسانی اختیار و ارادہ، انسان کا سب سے بڑا جوہر اور اس کی قوتِ عقل و شعور اس کا بہت بڑا امتیاز ہے. اس قسم کے اسلوبِ پیغام رسانی سے انسان خوف و ہراس سے طوعاً و کرہاً ہدایت قبول کرتا. جس میں نہ تو اس کے اختیار و ارادہ کو دخل ہوتا نہ عقل و بصیرت کو درک. اور یوں انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں، جو بلاشعور و اختیار لگے بندھے قوانین کے تابع چلی جا رہی ہیں کچھ فرق نہ رہتا. رسولوں کا فوق البشر ہونا تو ایک طرف، اس مقصد کے پیشِ نظر تو مشیّت کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ جو فرشتہ پیغام لاتا ہے اسے بھی مرئی (VISIBLE) صورت میں لوگوں کے سامنے لایا جائے.

وَقَالُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡهِ مَلَكٌ ؕ.... (۶/۸)

اور انہوں نے کہا کہ اگر یہ شخص اپنے دعوے میں سچا ہے، تو کیوں اس پر فرشتہ نہیں اُترتا (کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں؟).

اس سے اگلی آیت میں ہے کہ اگر بفرضِ محال ایسا کرنا ضروری ہوتا کہ وہ فرشتہ مرئی صورت میں سامنے آئے، تو بھی اسے اللہ تعالیٰ عام انسانوں کی شکل میں بھیجتا تاکہ رشد و ہدایت مافوق الفطرت انداز سے ذہنِ انسانی پر مسلط نہ ہو جاتی[1]۔

وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ○ (۶/۹)

اور اگر ہم کسی فرشتہ کو پیغمبر کرتے، تو اسے بھی انسان ہی بناتے (کیونکہ یہ قانونِ الٰہی کے خلاف ہے کہ فرشتے اپنی مرئی شکل میں انسانوں کے سامنے آئیں) اور جیسے کچھ شبہات یہ اب کر رہے ہیں، ویسے ہی شبہوں میں اس وقت بھی انہیں ڈال دیتے (یعنی یہ کہتے، یہ تو دیکھنے میں ہماری ہی طرح کا آدمی ہے فرشتہ نہیں ہے)۔

دوسری وجہ منصبِ رسالت کے لئے انسانوں ہی کو کیوں منتخب کیا گیا۔ اس کی دوسری وجہ قرآن کریم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ○ قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ○ (۱۷/۹۵-۹۴)

اور حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کی ہدایت (دنیا میں) ظاہر ہوئی تو صرف اسی بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا کہ (متعجب ہو کر) کہنے لگے کہ کیا اللہ نے (ہماری طرح کا) ایک آدمی پیغمبر بنا کر بھیج دیا ہے؟ (اے پیغمبر!) کہہ دے کہ اگر ایسا ہوا ہوتا کہ زمین میں (انسانوں کی جگہ) فرشتے بسے ہوتے اور اطمینان سے چلتے پھرتے، تو ہم ضرور آسمان سے ایک فرشتہ پیغمبر بنا کر اتار دیتے۔

یعنی چونکہ دنیا میں انسان بستے ہیں اس لئے ان کے لئے رسول بھی انہی میں سے ہونے چاہئیں۔

---

[1] معجزات سے کیا مقصود ہے اس کے لئے سلسلۂ معارف القرآن کی ایک کڑی "معراجِ انسانیت" میں دیکھئے۔

رسُول کی حیثیت اس سے فریضۂ رسالت کے ایک اہم گوشے پر روشنی پڑتی ہے۔ یعنی رسول کے ذمے صرف پیغام پہنچا دینا ہی نہیں (جیسے چِٹھی رساں کے ذمے چِٹھی پہنچا دینا ہوتا ہے) بلکہ وہ اس تعلیمِ خداوندی کو ایک عملی نظامِ معاشرہ کی صورت میں متشکل کرکے اس کے درخشندہ نتائج اور خوشگوار ثمرات کو وحیِ خداوندی کی صداقت کے لئے بطور دلیل پیش کرتا ہے اور اس طرح لوگوں کو مشہود طریقے پر بتا دیتا ہے کہ یہ تعلیم ناممکن العمل نہیں ہے۔ تم نے بھی اسے اسی طرح کے نظام کی شکل میں آگے چلانا ہے۔ منصبِ رسالت کے مختلف گوشوں اور رسول کی تنوّع حیثیتوں کا تفصیلی ذکر اپنے مقام پر آئے گا[1]۔ اس مقام پر صرف اتنا بیان کرنا مقصود ہے کہ رسول کی حیثیت محض آلۂ ابلاغ کی نہیں ہوتی کہ وہ (معاذ اللہ) ریڈیو سیٹ کی طرح محطۂ نشر الصوت (BROADCASTING STATION) سے نشر شدہ پیغام کو فضا کی لہروں سے اخذ کرکے سامعین تک پہنچا دیتا ہے اور اس کے بعد لکڑی کا ایک ڈبہ رہ جاتا ہے۔ ایسا تصور منصبِ رسالت اور مقامِ نبوت سے انتہائی بے بصری کا ثبوت ہے۔

رسول سب سے پہلے خود اس پیغام پر ایمان لاتا ہے جو اس پر وحی کیا جاتا ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ... (۲/۲۸۵)

اللہ کا رسول اس (کلام) پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہے، اور جو لوگ (دعوتِ حق پر) ایمان لائے ہیں، وہ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

سب سے پہلا عبدِ مُسلم اور اس طرح وہ سب سے پہلا عبدِ مسلم بنتا ہے۔ یعنی اس جماعت کا پہلا رکن جو اس کے بعد وجود میں آنے والی ہوتی ہے اور جس نے قوانینِ خداوندی پر عمل کرکے دکھانا ہوتا ہے (۱۲/۲۹)۔

رسُول اور اتباعِ وحی پھر وہ سب سے پہلے خود اس وحی کا اتباع کرتا ہے۔

وَ اتَّبِعْ مَا یُوْحٰٓی اِلَیْكَ وَ اصْبِرْ حَتّٰی یَحْكُمَ

---

[1] دیکھئے "معراجِ انسانیت"۔

اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ؀ (۱۰/۱۰۹ نیز ۱۰/۱۵)

(اے پیغمبر!) جو کچھ تم پر وحی کی جاتی ہے اس کا اتباع کرو، اور اس راہ میں جمے رہو یہاں تک کہ اللہ تمہارے اور تمہارے مخالفین کے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!

اور اس کے بعد دوسرے لوگوں (یعنی اپنی جماعت) سے اپنی اطاعت کراتا ہے۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ...... (۴/۶۴)

اور (اے پیغمبر!) ان لوگوں کو جو تمہاری اطاعت کا حکم دیا گیا ہے) تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو انہی کے ساتھ ہوئی ہو) ہم نے جس کسی کو بھی منصبِ رسالت دے کر دنیا میں کھڑا کیا، تو اسی لئے کیا کہ ہمارے قانون کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔

رسُول کی اطاعت | اس انداز کی اطاعت کہ اس کے سامنے سر ہی نہ جھکیں بلکہ اس کے فیصلوں کے آگے اس جماعت کے قلب و نگاہ کے تمام گوشے جھکے ہوئے ہوں۔

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ؀ (۴/۶۵)

تمہارا پروردگار اس بات پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے، جب تک ایسا نہ ہو کہ یہ اپنے تمام جھگڑوں، قضیوں میں تمہیں حاکم بنائیں۔ اور پھر (صرف اتنا ہی نہیں بلکہ) ان کے دلوں کی حالت بھی ایسی ہو جائے کہ جو کچھ تم فیصلہ کر دو اس کے خلاف کسی طرح کی دل گرفتگی محسوس نہ کریں، اور وہ جو کسی بات کو مان لینا ہوتا ہے اسی طرح ٹھیک ٹھیک مان لیں۔

اسی اطاعت میں خدا کی اطاعت پوشیدہ ہوتی ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؀ (۴/۸۰)

جس کسی نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی، تو اس نے فی الحقیقت اللہ کی اطاعت کی،
اور جس کسی نے روگردانی کی، تو (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں ان پر کچھ پاسبان بنا کر نہیں بھیجا ہے
(کہ ان کے اعمال کے لئے تم جوابدہ ہو، اور جبراً ان سے اپنی اطاعت کراؤ)۔

منصبِ رسالت میں یہ پہلو اپنی اہمیت کے اعتبار سے ایک مستقل باب کا محتاج ہے (اور یہ باب اپنے مقام پر آئے گا)۔ اگر دین انفرادی شئے ہوتا۔ یعنی اس سے مقصود یہ ہوتا کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ، کوئی اس گوشے میں، کوئی اس زاویئے میں، کوئی کسی پہاڑ کی چوٹی پر، کوئی کسی دریا کے کنارے۔ اپنی اپنی انفرادی "نجات"، کی فکر میں خدا کے دھیان اور پوجا پاٹ میں مستغرق رہے، تو اس صورت میں رسول کی اطاعت ضروری نہ تھی، جب رسول، اللہ کے احکام لوگوں تک پہنچا دیتا تو لوگ اپنے اپنے طور پر ان احکام کی تعمیل کرنے لگ جاتے۔ لیکن اس طرزِ "مذہبیت" کو قرآن کریم نے رہبانیت قرار دیا اور ذہنِ انسانی کی اختراع بتایا ہے۔ (دیکھئے ۵۷/۲۷) جس کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی) جیسا کہ ہم وحی کے عنوان میں اجمالاً بتا چکے ہیں، وحی و رسالت کی ضرورت اس لئے ہے کہ انسانوں کو مدنیت کی زندگی بسر کرنا

رسُول کی اطاعت کیوں؟

ہے۔ انہیں آپس میں مل جل کر رہنا ہے۔ ایسی طرزِ زندگی کے لئے ایک نظامِ اطاعت کی ضرورت ہے جسے عام اصطلاح میں حکومت اور قرآن کی رُو سے دین کہا جاتا ہے۔ دنیاوی نظامِ حکومت میں (خواہ اس کا اصطلاحی نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے) قانون سازی کا اختیار کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعت کو ہوتا ہے اور باقی انسان ان کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جس نظامِ حکومت کے علمبردار حضرات انبیاء کرامؑ ہوتے ہیں اس میں اصولی قوانین کے وضع کرنے کا اختیار کسی انسان کو نہیں ہوتا۔ اس میں اصولی ضابطۂ قوانین خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ رسول اپنی جماعت کے مشوروں کے ساتھ، ان اصولی قوانین کی روشنی میں اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، جزئی احکام مرتب کرتا ہے اور ان قوانین کو، بطور نظامِ حکومت، نافذ کرتا ہے۔ اس نظام کو، نظامِ حکومتِ خداوندی کہا جاتا ہے یعنی وہ نظام جس میں قانون کی اصل، خدائی وحی ہوتی ہے۔ رسولؐ اس نظامِ حکومت کا مرکزِ اوّلین ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کی اطاعت (جو درحقیقت قانونِ خداوندی کی اطاعت ہوتی ہے) ضروری ہوتی ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (۵۷/۲۵)

(دیکھو) ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے دلائل دے کر بھیجا. اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب (ضابطۂ قوانین) اور نظامِ عدل کو نازل کیا. تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں. اور ہم نے (سرکشوں کی سرکوبی کے لئے) لوہے کو پیدا کیا ہے. جس میں بڑی طاقت اور لوگوں کے لئے بہت سی منفعتیں ہیں. اور اس لئے کہ خدا کو معلوم ہو جائے کہ کون لوگ خدا (کے دین) کی اس کے محسوس نتائج دیکھے بغیر مدد کرتے ہیں (اگرچہ اُسے انسانوں کی امداد کی کوئی ضرورت نہیں. کیونکہ) بلاشبہ اللہ خود بڑی طاقت کا مالک اور غالب ہے.

یہ ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا تاوقتیکہ اس کے مرکز CENTRAL AUTHORITY کی اطاعت نہ کی جائے اس لئے حکومتِ خداوندی کے نظام میں رسول کی اطاعت نہایت ضروری ہے. لیکن یہ اطاعت رسول کی ذات کی اطاعت نہیں ہوتی. ذاتی اطاعت کا تو رسول کو اختیار ہی نہیں ہوتا.

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝

(۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے (انسانوں کی ہدایت کے لئے) کتاب اور حکومت اور نبوّت عطا فرمائے اور پھر اس کا یہ شیوہ ہو کہ لوگوں سے کہے خدا کو چھوڑ کر میرے بن جاؤ (یعنی خدا کے احکام کی جگہ میرے حکموں کی اطاعت کرو) بلکہ چاہیئے کہ ربانی انسان بنو اس لئے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے رہتے ہو اور اس لئے کہ تم اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو.

رسول اس ضابطۂ قوانین کی اطاعت کراتا ہے جو اسے من جانب اللہ عطا ہوتا ہے اس لئے رسول کی

اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت[1] ہوتی ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝ (۴/۸۰)

جس کسی نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی، تو اس نے فی الحقیقت اللہ کی اطاعت کی، اور جس کسی نے روگردانی کی، تو (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں ان پر کچھ پاسبان بنا کر نہیں بھیجا ہے (کہ ان کے اعمال کے لئے تم جوابدہ ہو اور جبراً ان سے اطاعت کراؤ)۔

اس مقصد کے لئے رسول ایک معاشرہ (SOCIAL ORDER) کی تشکیل کرتا ہے جس میں افرادِ معاشرہ کی مناسب تعلیم و تربیت سے ان کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پا کر تکمیل حاصل کرتی ہیں اور جب ان صلاحیتوں میں صحیح توازن و اعتدال پیدا کر دیا جاتا ہے تو اس سے وہ کشمکش بھی ختم ہو جاتی ہے جو انسان کے اپنے اندر مختلف اور متضاد صلاحیتوں میں عدم توازن کی بنا پر پیدا ہوتی ہے اور وہ کشمکش بھی جو مختلف انسانوں میں باہمی مفاد کے تصادم سے رونما ہوتی ہے رسول کا فریضہ اس قسم کی تعلیم و تربیت سے بہترین افرادِ معاشرہ کا پیدا کرنا ہوتا ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲/۱۵۱)

جس طرح یہ بات ہوئی کہ ہم نے تم میں سے ایک شخص کو اپنی رسالت کے لئے چن لیا جو تمہارے سامنے ہمارے قوانین پیش کرتا ہے تمہاری مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتا ہے۔ تمہیں کتاب و حکمت[2] کی تعلیم دیتا ہے اور وہ باتیں سکھلاتا ہے جن سے تم یکسر ناآشنا تھے۔

---

[1] ان تمام امور کے مستقل ابواب اپنی اپنی جگہ الگ آئیں گے۔ اس مقام پر صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

[2] کتاب اور حکمت سے کیا مفہوم ہے؟ یہ اپنی جگہ آئے گا یہاں صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہوگا کہ کتاب سے مراد قانون خداوندی ہے اور حکمت سے مفہوم وہ مصالح جن پر اس قانون کی بنا رکھی گئی ہے وہ نتائج جو اس قانون کا لازمی ثمر ہیں۔ کتاب و حکمت دونوں منزّل من اللہ ہیں اور قرآن کے اندر محفوظ۔

چونکہ تکمیلِ شرفِ انسانیت کا دار و مدار اسی نظام پر ہے اس لئے اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص نوازش کہا ہے. اور حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کی دل کی آنکھیں کھلی ہوں تو اسے نظر آجائے کہ نوعِ انسانی پر اس سے بڑی نوازش اور کیا ہو گی؟

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ٥ (۳/۱۶۳)

بلاشبہ یہ اللہ کا مومنوں پر بڑا ہی احسان تھا کہ اس نے ایک رسول ان میں بھیج دیا جو ان ہی میں سے ہے وہ اللہ کے قانون ان کے سامنے پیش کرتا ہے. ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے. (اس نے اس طرح ان کی راہ ان پر کھول دی) حالانکہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے!

یہی وہ نظام ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کو کسی قسم کا خوف وحزن نہیں رہتا نہ اس زندگی میں نہ اس کے بعد) اور (جیسا کہ سابقہ عنوان میں بتایا جا چکا ہے) یہی انسان کا منتہائے مقصود ہے.

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ (۶/۴۸)

اور (ہمارا قانون یہ ہے کہ) ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے. مگر اس لئے کہ (ایمان وعمل کی برکتوں کی) خوشخبری سنائیں اور (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کریں. پھر جو کوئی ایمان لایا اور اس نے اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کر لی تو اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہو گا نہ کسی طرح کی غمگینی.

تبشیر و تنذیر رسولوں کی تبشیر و تنذیر سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ضابطۂ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے درخشندہ نتائج کا مژدۂ حیات بخش سنائیں (بلکہ ایسے نتائج کو عملاً سامنے لے آئیں) اور اس مسلکِ زندگی سے روگردانی کرنے والوں کو ان کی غلط روش کے ہلاکت انگیز عواقب سے آگاہ کریں تاکہ وہ صحیح راستہ اختیار کر لیں. چونکہ حضرات انبیاء کرام کی دُور رس

نگاہیں وحی کی روشنی میں ان نتائج و عواقب کو واضح طور پر اپنے سامنے دیکھتی ہیں۔ اس لئے راہِ راست سے منہ موڑنے والوں کی بربادی اور تباہی کا تصوّر ان کے قلبِ حساس کو اندوہناک اور درد آگیں کر دیتا ہے اور وہ ایک طبیبِ مشفق کی طرح اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مریض کی جان بچ جائے۔ نبی اکرمؐ کی اس قلبی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ٥ (۱۸/۶)

(اے پیغمبر!) تیری حالت تو ایسی ہو رہی ہے کہ جب لوگ ایسی (واضح) بات بھی نہ مانیں، تو عجب نہیں ان کی (ہدایت) کے پیچھے تو مارے افسوس کے اپنی جان ہلاکت میں ڈال دے۔

دوسری جگہ ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ٥ (۲۶/۳)

شاید (اے پیغمبر!) تم تو اس غم میں کہ وہ لوگ مؤمن کیوں نہیں بن جاتے اپنی جان ہی ہلاکت میں ڈال دو گے۔

لیکن چونکہ ہدایت اس کو ملتی ہے جو اپنے دل کے ارادے سے اسے حاصل کرنا چاہے اس لئے حضورؐ سے کہا گیا کہ ان لوگوں کے دلوں کو بدل دینا آپ کے ذمّے نہیں۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ... (۲/۲۷۲)

(اے پیغمبر!) تم پر کچھ اس بات کی ذمّہ داری نہیں کہ لوگ ہدایت قبول ہی کر لیں (تمہارا کام صرف سمجھا دینا ہے ہدایت تو خدا کے قانون کے مطابق اسے ملتی ہے جو ہدایت لینا چاہے۔

آپ کے ذمّے تو فقط ہدایت کا پہنچا دینا ہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۚ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۚ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ٥ (۲۴/۵۴) نیز (۱۶/۳۵)

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت[1] کرو! پھر اگر وہ لوگ اس سے روگردانی

---

[1] اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت، دو مستقل اور الگ الگ اطاعتیں نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد قانونِ خداوندی

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کریں تو (انہیں سمجھ لینا چاہیئے) کہ رسول کے ذمے صرف اتنا ہی ہے جتنا اس پر بارڈالا گیا ہے۔ (یعنی انسانوں تک احکام الٰہی کو پہنچادینا) اور تمہارے ذمے وہ سب کچھ ہے جس کا تم پر بارڈالا گیا ہے۔ (یعنی ان احکام پر عمل پیرا ہونا. خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرنا) اگر تم اس کے رسول کی اطاعت کروگے تو ہدایت پاجاؤگے۔ اور معلوم رہے کہ رسول کے ذمہ تو صرف (احکام الٰہی کو انسانوں تک) صاف صاف طور سے پہنچادینا ہے۔ (اور بس)۔

ایک عظیم المرتبت حقیقت

سلسلۂ رشد و ہدایت کے ضمن میں قرآنِ کریم نے ایک ایسی حقیقت کو پیش کیا ہے جسے اگر صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو دنیائے مذاہب سے بحث وجدل اور اختلاف و نزاع کا خاتمہ ہوجائے اور مذہب کے نام پر جس قدر خونریزیاں اور فسادانگیزیاں ہورہی ہیں سب صلاح و فلاح میں بدل جائیں. موجودہ مذاہب کی دنیا پر غور کیجئے. ان میں سے ہر ایک، ایک دوسرے کا رقیب اور ابدی دشمن دکھائی دیتا ہے اور چونکہ ہر مذہب اپنے آپ کو آسمانی تعلیم کا حامل قرار دیتا ہے اس لئے مذہب کی موجودہ عداوت و رقابت کے پیشِ نظر انسان لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ان مذاہب کے بانی بھی ایک دوسرے کے دشمن تھے. متشدد طبقہ کے لوگ اس خیال کا اظہار علانیہ کرتے رہتے ہیں. لیکن متوسط الخیال لوگ چونکہ اس عقیدہ کو اختلاف و نزاع کا موجب سمجھتے ہیں اس لئے وہ ایک دوسری راہ اختیار کرلیتے ہیں. وہ کہتے ہیں کہ مذاہب سب اپنی اپنی جگہ سچے ہیں. لیکن اہلِ مذاہب نے باہمی ضد اور تعصب سے اختلاف و نزاع کی صورتیں پیدا کر رکھی ہیں. لیکن جہاں پہلا عقیدہ غلط ہے یہ دوسرا عقیدہ بھی صحیح نہیں. حقیقت ان سے الگ ہے. پہلے عقیدہ کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں. باقی رہا دوسرا عقیدہ. سو یہ ظاہر ہے کہ مذاہب چھپے ہوئے تو ہیں نہیں کہ کسی کو معلوم نہ ہوسکے کہ ان کی اصلی تعلیم کیا ہے اور ان کے پیرو اسے کس رنگ میں پیش کررہے ہیں. ان کے پیروؤں کے اعمال غلط ہوں لیکن ان مذاہب کی تعلیم ان کتابوں کے اندر ہے اور یہ کتابیں ہر جگہ مل سکتی ہیں. انہیں پڑھ کر دیکھ لیجئے. ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں. لہٰذا باہمی رواداری اور حسنِ سلوک یا جذبۂ مرعوبیت کی بنا پر یہ کہہ دینا کہ تمام مذاہب یکساں طور پر سچے ہیں لیکن ان کے ماننے والے اپنی تعلیم کو غلط انداز میں پیش کررہے ہیں۔ ایک کھلی ہوئی

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) کی اطاعت بذریعہ اس مرکزِ نظامِ حکومت کے لئے جو اس قانون کو نافذ کرتا ہے. تفصیل اس اجمال کی معراج انسانیت میں ملے گی۔

حقیقت سے چشم پوشی بلکہ فریب دہی ہے۔ اگر سب مذاہب (جس شکل میں وہ آج موجود ہیں) خدا کی طرف سے ہیں اور سب یکساں اور سچے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی خدا نے مختلف مذاہب کو دنیا میں بھیج کر اس قدر تشتت و انتشار، افتراق و اختلاف اور جنگ وجدل کی راہیں کیوں کھول دیں؟ انسانوں کے باہمی اختلافات کے لئے بے شمار اسباب و علل دنیا میں موجود رہتے ہیں اور مذہب کا اولین فریضہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ان اختلافات کو مٹا کر انسانوں میں یگانگت اور وحدت پیدا کرے۔ لیکن جب (تمام سچے اور یکساں) مذاہب باہمی اختلاف و نزاع کا سب سے بڑا ذریعہ بن جائیں تو اس کی علت سمجھ میں نہیں آسکتی۔

کیا سب مذاہب سچّے ہیں؟

بعض لوگوں نے اس اُلجھن سے گھبرا کر اور اس حقیقت کو محسوس کر کے کہ مختلف مذاہب کی کتابوں میں اختلاف موجود ہے امن وسلامتی کی یہ راہ نکالی کہ ان مذاہب کی کتابوں سے "اچھی اچھی باتیں" ایک جگہ جمع کر کے اس "مجموعۂ حسنات" کو انسانوں کا مشترکہ مذہب قرار دیا جائے۔ چنانچہ یہی وہ جذبہ ہے جو مختلف زمانوں میں مختلف نقاب اوڑھ کر سامنے آتا رہا ہے۔ کبھی اکبر کے دینِ الٰہی کی شکل میں، کبھی برہمو سماج کی صورت میں۔ شکلیں مختلف ہوں لیکن روح ہر جگہ وہی کار فرما ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جذبہ کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ دنیا میں جس قدر مذہبی کتابیں ہیں ان میں اچھی اچھی باتیں بھی ہیں اور بُری بھی، اچھی اچھی باتوں کو ایک جگہ جمع کر کے بُری باتوں کو چھوڑ دیا جائے۔ اس عقیدہ کا مطلب یہ ہوا کہ گویا آج آسمان کے نیچے کوئی مذہبی کتاب ایسی نہیں جسے خالصتہً من جانب اللہ قرار دے کر اس کی تعلیم کو مذہبی نصاب بنایا جاسکے۔ یعنی ایک طرف تو ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ انسانوں کی رشد و ہدایت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے اُس نے ذُرّیتِ آدم سے کہہ دیا تھا کہ جو ہدایت اس کی طرف سے آئے اس کی پیروی کرنے سے نجات و سعادت حاصل ہوگی۔ اور دوسری طرف عملاً یہ صورت ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے اس کا کوئی انتظام ہی نہیں کیا کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے ان کے اندر کوئی ایسی کتاب موجود ہو جسے بطور ضابطۂ زندگی اختیار کیا جاسکے۔ اور اب بیچارے انسان کو مجبوراً یہ راہ اختیار کرنی پڑی کہ جہاں جہاں سے اچھی اچھی باتیں ملیں انہیں اکٹھا کر کے اپنے لئے ایک نصابِ زندگی تجویز کرے۔ پھر "اچھی باتوں" کا معیار کیا ہے؟ ذہنِ انسانی کی میزان۔ اور ذہنِ انسانی کی جو کیفیت ہے اسے ہم وحی کے عنوان میں دیکھ چکے ہیں۔

اور اگر آپ کہیں کہ نہیں نیکی اور بدی کا معیار ذہنِ انسانی نہیں بلکہ ان مذاہب کی مقدس کتابیں

ہیں. تو اس سے یہ خلفشار اور بھی بڑھ جاتے گا. موجودہ تورات کو صحیفۂ آسمانی ماننے والوں کے نزدیک دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ عین نیکی ہے. اس کے برعکس انجیل کو تعلیم خداوندی سمجھنے والوں کے نزدیک ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینا نیکی۔

> تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت ٥ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے ٥ اور اگر تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے ٥ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا ٥
>
> (متی ۳۸ — ۵/۴۲)

اس سے آگے بڑھئے لکھا ہے۔

> تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت. لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دعا مانگو ٥ تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو ٥ کیونکہ وہ اپنے سورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے اور راست بازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہ برساتا ہے۔
>
> (متی ۴۳ — ۵/۴۵)

"تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا!" تورات میں. اسی تورات میں جو خود بائبل کا حصہ ہے یہاں یوں ہی ایک مثال پیش کر دی گئی ہے ورنہ اگر آپ مختلف مذاہب کی مذعومہ آسمانی کتابوں کا مطالعہ کریں تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ ان کی تعلیم میں کس قدر اصولی اختلافات ہیں. اور یہ اس لئے کہ (قرآنِ کریم کے سوا) ان میں کوئی کتاب ایسی نہیں جس کے متعلق حتمی اور یقینی طور پر کہا جا سکے کہ وہ من و عن وہی ہے جو اس کتاب کے لانے والے نے اپنے متبعین کو دی تھی. ان کتابوں کی تاریخی حیثیت کیا ہے اور ان میں کس قسم کی تعلیم پائی جاتی ہے. یہ ایک مستقل موضوع ہے جس کے متعلق دوسری کتاب (مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں) میں تفصیل سے لکھا گیا ہے. اس وقت صرف اس چیز کو سامنے رکھئے کہ ان کتابوں میں ایک دوسرے سے ایسی متضاد و متباین تعلیم پائی جاتی ہے جس میں باہمی تطابق و توافق کی کوئی راہ نہیں نکل سکتی. لہٰذا یہ نظریہ بنیادی طور پر غلط ہے کہ ان مختلف مذاہب کی کتابوں کی تعلیم کو "نیکی اور بدی" کا معیار قرار

دیا جائے اس صورت میں تو ایک ہی عمل ایک کتاب کے مطابق نیک اور دوسری کے مطابق بد قرار پا جائے گا۔ حالانکہ ہم سابقہ عنوان میں دیکھ چکے ہیں کہ حقیقت ایک ہے اور جہاں جہاں یہ بے نقاب ہوئی ہے ایک ہی صورت میں ہوئی ہے۔ آپ نے غور کیا ہو گا کہ اس مسئلہ کے حل کے لئے ذہنِ انسانی

صحیح راہِ عمل

نے جس قدر راہیں تلاش کی ہیں ان میں سے کوئی راہ بھی تسلی بخش نہیں۔ اب دیکھئے کہ قرآنِ کریم اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔ اس بحث کا صحیح مقام تو "اسلام" کا عنوان ہے۔ لیکن چونکہ وہ باب بہت دیر میں سامنے آئے گا[1] اس لئے اس مقام پر اطناب و تفصیل سے قطع نظر صرف اجمالی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ

(۱) جس وقت سے انسانوں کو آسمانی روشنی کی ضرورت لاحق ہوئی، اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ رشد و ہدایت کو برابر جاری رکھا اور ہر قوم میں اپنے رسول بھیجے۔

إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَّ نَذِيرًا ۚ وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۝ (۳۵/۲۴ نیز ۱۶/۳۶ و ۱۰/۴۷)

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں سچائی کے ساتھ (ایمان و عمل کی برکتوں کی) خوشخبری سنانے والا اور (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا۔ تم کوئی انوکھے نبی بن کر نہیں آئے ہو۔ ہر قوم میں کوئی نہ کوئی (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کرنے والا گزر چکا ہے۔

یہ سلسلہ متواتر جاری رہا۔

ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۖ كُلَّمَا جَآءَ أُمَّةً رَّسُولُهَا كَذَّبُوهُ فَأَتْبَعْنَا بَعْضَهُم بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ أَحَادِيثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ ۝ (۲۳/۴۴)

پھر ہم نے لگاتار یکے بعد دیگرے اپنے رسول بھیجے۔ لیکن جب کبھی کسی قوم میں اس کا رسول ظاہر ہوا معاً وہ جھٹلانے پر آمادہ ہو گئی۔ پس ہم بھی (اپنے قانونِ مکافات کی رو سے) ایک کے بعد ایک کر کے انہیں برباد کرتے گئے، اور ان کی ہستیاں افسانے بن گئیں سو ان کے لئے

---

[1] "اسلام کیا ہے" میری الگ تصنیف ہے۔

محرومی ونامرادی ہے جو قانونِ خداوندی پر ایمان نہیں رکھتے۔
ان حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے ہر زمانہ اور ہر ملک میں، مختلف اقوام وملل تک اللہ کے پیغامات پہنچتے رہے۔

(۲) ان پیغاماتِ خداوندی کا سرچشمہ چونکہ ایک ہی تھا اس لئے ان کی اصل وبنیاد ہمیشہ ایک رہی۔ یعنی خدائے واحد کے قوانین کی اطاعت۔ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت کو جائز نہ سمجھنا اور یوں ایک خدا کی حاکمیت تسلیم کر کے تمام مخلوق کا ملّتِ واحدہ بن کر رہنا۔ تعلیمِ ربّانی کا یہ نقطۂ ماسکہ شروع سے اخیر تک ایک ہی رہا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ (۴۲/۱۳)

(اور دیکھو اے لوگو! خدا نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔ اور جس کو ہم نے (اے پیغمبرِ اسلام!) تمہارے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ اور جس کا ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا۔ اور (اُن سے اور ان کی قوموں سے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ) اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ اندازی نہ کرنا۔ (حیرت ہے کہ اگرچہ یہ نئی اور انوکھی بات نہیں۔ مگر) مشرکین کو وہ بات بڑی گراں گذر رہی ہے جس کی طرف تم انہیں بلا رہے ہو (حیرت ہے کہ وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ فلاں کو نبوت کیوں دی گئی اور فلاں کو کیوں نہیں؟ خدا انسانوں کی مرضی کے تابع نہیں ہے) خدا جسے چاہتا ہے اپنی رسالت کے لئے منتخب کر لیتا ہے اور جو شخص خدا کی طرف رجوع کرتا ہے اسے اپنی طرف کا راستہ دکھا دیتا ہے۔

یہ تو تھی دین کی اصل واساس۔ لیکن اس اصل کو بروئے کار لانے کے لئے عملی نظام کی تشکیل (یعنی مناہج ومناسک) میں مقتضیاتِ زمانہ کے اعتبار سے جزئیات میں ردّ وبدل ہوتا رہا۔

(۳) یہ پیغامات آتے۔ کچھ عرصہ تک اپنی اصلی صورت پر قائم رہتے اس کے بعد یا تو آفاتِ ارضی وسماوی

کے ہاتھوں ضائع ہو جاتے. یا خود انسانوں کی دستبرد سے ان میں تحریف و الحاق ہو جاتا. یا انہیں فراموش کر دیا جاتا لہٰذا کچھ وقت کے بعد ان پیغامات کی پھر سے تجدید ہو جاتی. انہی جیسے پیغامات (آیات اللہ) کا پھر سے نزول ہو جاتا. اس کے ساتھ ہی ایک اور حقیقت بھی تھی. انسانیت خود اپنے ارتقائی منازل طے کر رہی تھی. اس کے مقتضیات و داعیات میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا. اس لئے ہر زمانہ کی ضروریات کے مطابق نظامِ خداوندی کے تشکیلی عناصر میں بھی اضافہ ہوتا رہا. یعنی ہر رسول کی وساطت سے کچھ تو سابقہ رسول کے فراموش کردہ یا ضائع شدہ پیغام کی تجدید ہو جاتی اور جزئیات میں کچھ تغیر و تبدل بھی ہو جاتا. (لیکن اصل و اساس ہمیشہ ایک رہتی) لیکن یہ تغیر و تبدل ہمیشہ عروج کی طرف لے جاتا. ہبوط و تنزل کی طرف نہ جاتا. اس لئے ہر نئے رسول کے وقت جہاں سابقہ رسول کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان کا حکم دیا جاتا وہیں اس نئے رسول کا اتباع اور اس کی اطاعت لازم قرار دی جاتی. سورۂ بقرہ کی اس آیتِ جلیلہ میں اسی اہم حقیقت کی طرف اشارہ ہے.

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (۲/۱۰۶)

(ہمارا قانون یہ رہا ہے کہ) ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ منسوخ کر دیتے یا فراموش ہو جانے دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم نازل کر دیتے ہیں. (اے پیغمبر!) کیا تمہیں معلوم نہیں (ضرور معلوم ہے) کہ اللہ ہر بات پر قادر ہے؟ (تو اس کے لئے ایک حکم کی جگہ اس جیسا یا اس سے بھی بہتر حکم دے دینا کیا مشکل ہے).

چنانچہ قرآن کریم میں کتبِ سابقہ کی تحریف و الحاق کا ذکر متعدد مقامات پر موجود ہے. آج دنیا میں (اسلام کے سوائے) کوئی مذہب ایسا نہیں جو اس دعوے کو ثابت کر سکے کہ جس کتاب کو اس کے ہاں صحیفۂ آسمانی سمجھا جاتا ہے، وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو اس کے "بانی" نے انہیں دی تھی. یہ ایک تاریخی بحث ہے جس میں معتقدات کو کچھ دخل نہیں. اس لئے ہمارا یہ دعویٰ بھی تاریخی شواہد پر مبنی ہے اور اس کی سند میں خود اہل مذاہب کے اعترافات موجود ہیں. (تفصیل ان امور کی "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں" میں ملے گی).

(۴) یہ سلسلۂ رشد و ہدایت یونہی جاری رہتا تاآنکہ دنیا اپنے عہدِ طفولیت سے نکل کر سنِ رشد

بلوغ تک پہنچ گئی۔ اب مشیت ایزدی کے اندازے کے مطابق وہ وقت آگیا کہ ان تمام ازلی حقائق کو جو اس سے پیشتر حضرات انبیائے کرامؑ کی وساطت سے وقتاً فوقتاً نوعِ انسانی کی طرف بھیجے گئے تھے اور جو یا تو بالکل ضائع ہو چکے تھے۔ یا ان میں تحریف و الحاق ہو چکا تھا۔ ان کی اپنی اصل شکل میں ایک جگہ جمع کیا جائے۔ پھر ان تمام احکامات کو جو وقتی طور پر آئے تھے ایسے احکامات سے بدل دیا جائے جو اصولی طور پر قیامت تک کے لئے انسانی داعیات و مقتضیات کو پورا کر سکیں۔ ان تمام حقائق کو یک جا مدوّن کر کے اس مجموعہ کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا جائے کہ نہ تو یہ آفاتِ ارضی و سماوی کے ہاتھوں ضائع ہونے پائے اور نہ اس میں انسانی دستبرد کچھ تصرف کر سکے۔ اس مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ چنانچہ ضابطۂ خداوندی کے اس آخری اور مکمل ایڈیشن کے بعد حکم یہ دیا گیا کہ اب اطاعت اس کی اور صرف اس کی لازم ہے۔ اس کے باہر کوئی قانون نافذ العمل نہیں۔ اب دین ہے تو یہی اور اطاعت ہے تو اسی کی، یہ اس خدا کا اعلان ہے جس نے اپنی آخری کتاب کو نازل کیا اور ان احکامات کو جو اس سے پیشتر نافذ العمل تھے سمٹا کر اسی ایک کے اندر محفوظ کر دیا۔

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ مُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ (۵/۴۸)

اور (اے پیغمبر! اسی طرح) ہم نے تمہاری طرف سچائی کے ساتھ کتاب بھیجی۔ ان کتابوں کی اصلی صداقتوں کو سچ کر دکھانے والی جو پہلے سے موجود ہیں۔ اور ان سب کو اپنے اندر لئے ہوئے (اور یوں ان کی صداقتوں کی حفاظت کئے ہوئے) خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور جو سچائی تمہارے پاس آچکی ہے اسے چھوڑ کر لوگوں کی خواہشوں اور رایوں کی پیروی نہ کرو۔

کہہ دیا جا سکتا ہے کہ یہ تو صاحب پھر وہی بات ہوئی کہ ہمارا دین سچا ہے اور دوسرے ادیان باطل۔ اور یہی دعویٰ ہر ایک اہلِ مذہب کرتا ہے۔ پھر آپ میں اور ان میں فرق کیا ہوا؟ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کسی اور اہلِ مذہب کے پاس ان کی کتاب اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں۔ اور قرآنِ کریم کے متعلق داخلی اور خارجی شواہد موجود ہیں (جن کا اعتراف خود غیر مسلم مؤرخین اور محققین کو بھی ہے)

کہ یہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو نبیٔ اکرمؐ نے دنیا کو دیا۔ اس تاریخی شہادت کے بعد دوسری حقیقت یہ ہے کہ اس کی تعلیم انسانی داعیات کے عین مطابق ہے اور دنیا آہستہ آہستہ اپنے تجربات کی ناکامیوں کے بعد اس کی طرف لوٹتی آرہی ہے۔ (تفصیل سابقہ عنوان میں گذر چکی ہے)۔

(۵) یہ ہے وہ حقیقت جو آسمانی تعلیم کے متعلق قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے اور جس کی بین شہادت تاریخ کے اوراق سے ملتی ہے۔ اسی لئے اس نے کسی شخص کے مؤمن ہونے کے لئے جہاں نبیٔ اکرمؐ پر ایمان لانے کی شرط پیش کی ہے اس کے ساتھ ہی یہ شرط بھی ہے کہ وہ اس حقیقت پر ایمان لائے کہ حضورؐ سے بیشتر جس قدر انبیائے کرامؑ تشریف لائے وہ سب منجانب اللہ تھے اور ایک مشعل کی مختلف کرنیں۔ ایک ہی لڑی کے تابناک گوہر۔ ایک جوئے رواں کے قطراتِ آب۔ ایک ہی ملّت کے مختلف افراد۔

وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ (۲۳/۵۲)

اور (اے گروہِ پیغمبران! دیکھو) یہ تمہاری امت دراصل ایک ہی امت ہے اور تم سب کا پروردگار میں ہی ہوں۔ پس تم تقویٰ کی راہ اختیار کرو۔

ان تمام حضرات انبیاء کرامؑ پر ایمان، مسلمان کے لئے شرطِ اوّلین ہے۔

قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ .... وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (۱۳۶—۱۳۷/۲)

تم کہو، ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں۔ قرآن پر ایمان لائے ہیں جو ہم پر نازل ہوا ہے۔ ان تمام تعلیموں پر ایمان لائے ہیں جو ابراہیمؑ کو، اسماعیلؑ کو، اسحاقؑ کو، یعقوبؑ کو اور اولادِ یعقوبؑ کو دی گئیں۔ نیز ان کتابوں پر) جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ بلکہ دنیا کے تمام نبیوں کو اُن کے پروردگار کی طرف سے ملی تھیں۔ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کرتے (ہر ایک کے متعلق ایمان رکھتے ہیں کہ وہ خدا کے سچے پیغامبر تھے) ہم خدا کے قانون کے فرمانبردار ہیں، اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھو کہ انہوں نے (اسلام و اطاعتِ خداوندی کی) سیدھی راہ پائی۔ اور اگر وہ اس سے اعراض کریں تو (یاد رکھو) وہ (ہمیشہ) مبتلائے نزاع رہیں گے (اور)

خدا ان (کی ان) بدکرداریوں اور باہمی نزاع واختلاف کو کافی ہوجائے گا اور وہ سننے
والا اور جاننے والا ہے۔

ایسا ایمان کہ ان میں سے کسی ایک میں فرق نہ کیا جائے۔ ہر ایک کے متعلق ایمان رکھا جائے کہ وہ اپنے اپنے وقتوں میں خدا کے سچے رسول تھے (۲/۲۸۵)۔ ان میں تفریق کرنا کفر ہے (۴/۱۵۰)۔

(۶) لیکن تفریق بین الرسل کی ایسی سخت ممانعت کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ ان رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ یعنی ان کے دائرۂ تبلیغ کے اعتبار سے (۲/۲۵۳؛ ۱۷/۵۵)۔ یعنی بہ حیثیت رسالت ان تمام حضرات انبیاء کرامؑ میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ سب خدا کے رسول تھے۔ لیکن ان کے دائرۂ تعلیم اور احاطۂ اثر ونفوذ کے اعتبار سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے جیسا کہ ہم آیندہ اوراق میں دیکھیں گے۔ بعض رسول ایک قبیلہ کی طرف مبعوث ہوتے۔ انہی کی اصلاح ان کے پیشِ نظر ہوتی۔ لہٰذا ان کے پیغام کا دائرہ اسی قبیلہ تک محدود رہتا۔ بعض ایک بہت بڑی قوم کی طرف مبعوث ہوتے اور بڑی بڑی سرکش قوتوں کے ساتھ مقابلہ کرکے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کرتے۔ اور اس طرح ان کے حلقۂ تبلیغ وتعلیم کے اعتبار سے ان میں فرقِ مدارج ہوتا۔ اس معیار کے مطابق یہ ظاہر ہے کہ جس رسول کی بعثت کسی خاص ملک یا خاص قوم، خاص جماعت یا خاص گروہ کے بجائے تمام نوعِ انسانی کے لئے ہو اور جس کا پیغام، زمان ومکان کی قیود وحدود سے بلند وبالا ہو۔ اور اسے قیامت تک کے لئے ضابطۂ حیاتِ انسانی قرار دیا جائے۔ اس رسول کو دیگر حضرات انبیاء کرامؑ پر کس درجہ فضیلت ہوگی۔ یہ اللہ کے آخری رسول جناب محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم تھے جن کے متعلق فرمایا۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ○ (۷/۱۵۸؛ ۳۴/۲۸)

(اے پیغمبر! تم لوگوں سے) کہو "اے افرادِ نسلِ انسانی! میں تم سب کی طرف، خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ وہ خدا کہ ارض وسما میں تمام اقتدار اسی کے لئے ہے۔ کوئی صاحبِ اقتدار نہیں مگر اسی کی ایک ذات! موت اور حیات اس کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔ پس اللہ

پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبیٔ اُمّی پر کہ اللہ اور اس کے کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں) پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کی پیروی کرو تاکہ (کامیابی کی) راہ تم پر کھل جائے۔

تمام نوعِ انسانی کے لئے رسول۔

وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا۝ (۴/۷۹)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں تمام لوگوں کے لئے اپنا پیامبر بنا کر بھیجا ہے۔ (اور تمہارے پیامبر ہونے کے لئے) اللہ کی گواہی بس کرتی ہے!

ان کے لئے بھی جن کے پاس اس سے بیشتر رسول آچکے تھے۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ ؗ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۠ (۵/۱۹).

اے اہلِ کتاب (ایسی حالت میں کہ رسولوں کا ظہور مدتوں سے بند تھا) ہمارا رسول (یعنی پیغمبر اسلام) تمہارے پاس آیا تم پر احکامِ حق واضح کر رہا ہے تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہماری طرف کوئی نہیں بھیجا گیا۔ تو اب (دیکھو) بشارت دینے والا اور آگاہ کرنے والا تمہارے پاس آگیا ہے (یعنی تمہارے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہا ہے) اور اللہ ہر بات پر قادر ہے۔

اور ان کے لئے بھی جن تک ابھی رسول نہیں پہنچے تھے۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ۝ (۳۶/۶)

(اے پیغمبر اسلام! ہم نے تمہیں اس لئے کتاب دی ہے) تاکہ تم ان قوموں کو (بدعملی اور بدکرداری کے نتائج سے) ڈراؤ جن کے آباء (واجداد اپنی بدکرداریوں کے نتائج سے) نہیں ڈرائے گئے تھے۔ چنانچہ وہ (اور ان کی اولادیں ابھی تک) غافل چلے آرہے ہیں۔

سارے جہان کے لئے رسول۔ اور سارے زمانوں کے لئے (قیامت تک کے لئے) رسول۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۝ۙ وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَ هُوَ

الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (۲-۳/۶۲)

(اور دیکھو! تمہارا پروردگار) وہی خدا ہے جس نے ان لوگوں میں جنہیں اس سے پہلے کتاب نہیں ملی تھی انہی میں سے ایک رسول بھیج دیا۔ جو ان پر قوانین خداوندی کو پیش کرتا ہے اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کی تکمیل کرتا ہے اور انہیں احکامِ الٰہی سکھاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُن کی حکمت بھی (اس نے اپنی تعلیم سے اس ان پڑھ قوم میں دنیا بھر کی صلاحیت پیدا کر دی ہے) اگرچہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے (اور اس کی رسالت صرف ان لوگوں تک ہی محدود نہیں جو آج موجود ہیں بلکہ اُن) دوسرے لوگوں کو بھی احاطہ کئے ہوئے ہے جو ابھی تک پیدا ابھی نہیں ہوئے۔ اور (تمہیں معلوم ہے کہ) خدا بڑے غلبہ والا اور حکمت والا ہے۔

حضورؐ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آسکتا۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ (۳۳/۴۰)

(اور دیکھو!) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کا باپ نہیں ہے بلکہ (وہ تو) اللہ کا رسول ہے اور (نہ صرف رسول بلکہ) انبیاء کے خاتمہ کی مہر (جس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نبوت ختم کر دی گئی) اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے (اسے خوب معلوم ہے کہ محمدؐ اس منصبِ جلیل کا اہل ہے اور صحیح اہل ہے)۔

کہ اس مقام پر پہنچ کر دین کی تکمیل اور خدا کی نعمتوں کا اتمام ہو گیا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ (۵/۳)

اس دورِ نبوت میں، میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی۔ اور دین کی حیثیت سے تمہارے لئے دینِ اسلام کو پسند کر لیا! (اب اگر کوئی اسلام کے علاوہ کوئی دوسری راہ اختیار کرے گا تو وہ ہرگز اس سے قبول نہ کی جائے گی)۔

چونکہ یہ حضرات انبیاء کرامؑ اسی ایک خدا کے مختلف پیغام رساں تھے۔ اس لئے ان میں (معاذ اللہ) نہ باہمی

رقابت تھی، نہ عداوت، بلکہ وہ ایک دوسرے کے مؤید و مصدق تھے۔ اور نبی اکرمؐ چونکہ آخر میں تشریف لانے والے تھے۔ اس لئے ہر ایک جانے والا، اپنی امت کو اس آخری آنے والے کی بشارت دے کر اور بہ تاکید کر کے جاتا تھا کہ جب وہ آنے والا آئے تو تم اس کی اتباع اور اطاعت کرنا۔ (اس اجمال کی تفصیل اور اس حقیقتِ کبریٰ کی تائید میں تاریخی شواہد اپنے مقام پر ملیں گے)۔

یہ ہے آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم۔ اس تعلیم کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ وہ تمام اشکال جن کا ذکر اس موضوع کے شروع میں کیا گیا ہے کس طرح ایک ایک کر کے حل ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس حقیقتِ کبریٰ پر بھی ایمان موجود ہے کہ تمام (آسمانی) مذاہبِ عالم کی اصلی اور سچی تعلیم کا سرچشمہ ایک ہی تھا۔ اس لئے کسی مذہب کی اصلی اور سچی تعلیم کی تکذیب نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اس تعلیم کے لانے والوں میں سے کسی کی شان میں سوءِ ادبی کا تصور تک بھی لایا جا سکتا ہے۔ سوءِ ادبی تو ایک طرف ان کی صداقت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ آج مختلف مذاہب کی تعلیم میں اس قدر اختلافات کیوں ہیں۔ اور سب سے آخر یہ مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان تمام مذاہب کی اصلی اور سچی تعلیم کہاں مل سکتی ہے! یہ ہے قرآن کریم کی تعلیم۔ اگر تعصب کی پٹی کسی کی آنکھیں نہ بند کر دے تو کہئے کہ اس تعلیم کے ماننے میں کسی سلیم القلب انسان کو بھی تامل ہو سکتا ہے؟ لیکن اس کے لئے قرآن کی تعلیم کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اور یہی چیز مشکل ہے۔ جس دن انسان میں اتنی وسعتِ قلبی اور کشادگیٔ نگاہ پیدا ہو گئی، اسی دن یہ مشکلات ختم ہو جائیں گی۔ آخری عنوان "نگہ بازگشت" میں اس مسئلہ کو اور بھی زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجئے۔

ایک اور اہم حقیقت

آگے بڑھنے سے پیشتر ایک اور اہم حقیقت کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے۔ یہ ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے اس امر کی وضاحت فرما دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر بستی، ہر قریہ، ہر ملک میں حضرات انبیاء کرامؑ مبعوث ہوتے رہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ان میں سے بعض کا ذکر قرآن کریم میں ہے اور باقیوں کا ذکر نہیں ہے۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ (۴/۱۶۴ نیز ۴۰/۷۸)

نیز خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم (قرآن میں) پہلے سنا چکے ہیں اور وہ جن کا حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا۔ اور (اسی طرح) اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام کرنا ہوتا ہے۔

لیکن جن رسولوں کا تذکرۂ جمیلہ قرآن کریم میں مذکور ہے وہ تمام سامی اقوام سے متعلق ہیں، یا یوں کہیئے کہ وہ عرب اور اس کے گرد و پیش بسنے والی قوموں کے رسول ہیں۔ باقی اقوام و مللِ عالم کے رسولوں کا قرآن میں ذکر نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس حقیقت تک پہنچنے کے لئے ایک مقدمہ پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ انسانی علوم کی جس قدر شاخیں ہیں انہیں تین اہم شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) علمِ فطرت۔ (۲) تاریخ اور (۳) علم النفس۔ قرآن کریم نے ان علوم کی اہمیت پر جس قدر زور دیا ہے اس کے تذکرہ کا صحیح مقام "قرآن" کا عنوان ہے جو اپنی جگہ آئے گا۔ اس وقت صرف اس قدر سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن نے تاریخ کو محض وقائع نگاری کی حیثیت نہیں دی بلکہ استقرائی طریق سے اس کے مطالعہ کو ضروری قرار دیا ہے۔ (اور یہی وہ استقرارِ تاریخی ہے جسے اب انسان کی سیاسی و عمرانی زندگی میں اس قدر اہمیت حاصل ہے) اس نے حضرات انبیاء کرامؑ اور ان کی اقوام کا جو تذکرہ کیا ہے تو محض ایام و وقائع کی تاریخ کی حیثیت سے نہیں کیا بلکہ اس سے عبرت و موعظت کے خاص نتائج اخذ کئے ہیں۔ اس نے بتایا ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت کے ساتھ کس کس قسم کا سلوک کیا گیا۔ ماننے والوں نے اسے کیسے مانا اور جھٹلانے والوں نے اسے کس طرح جھٹلایا۔ پھر یہ بتایا ہے کہ ماننے والوں کے اس ایمان و عمل نے کس قسم کے خوشگوار اور حیات بخش نتائج مرتب کئے اور تکذیب کرنے والوں کی سرکشی و عصیان نے انہیں کس طرح تباہی و بربادی کے جہنم کی طرف دھکیل دیا۔ ان واقعات کے بیان کرنے کے بعد اس نے بتایا ہے کہ یہ محض اتفاقی حوادث نہ تھے جو یونہی وجود پذیر ہو گئے بلکہ ان کا ظہور قوانینِ خداوندی کے ماتحت ہوا جسے سنت اللہ کہا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کو ذہن نشین کرانے کے بعد اس نے فکر و نظر کے تمام گوشوں کو اس مرکز کی طرف منتقل کر دیا کہ جب یہ سب کچھ ایامِ گزشتہ میں سنت اللہ (اللہ کے غیر متبدل قوانین) کے تابع ہوتا رہا ہے تو اب بھی وہی سنت اللہ جاری و ساری ہے جس میں تم کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں پاؤ گے۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ لہٰذا جو کچھ اقوامِ گذشتہ اور مللِ سابقہ کے ساتھ ہوا وہی کچھ تمہارے ساتھ ہوگا۔ انہوں نے رسولوں کی دعوت کی تائید و تصدیق کی تو کامیابی و شادکامی کی تمام راہیں ان پر کشادہ ہو گئیں۔

ایام اللہ کی اہمیت

اگر تم بھی ایسا کرو گے تو اسی قسم کی سعادت و نجات کی راہیں تم پر کھل جائیں گی۔ برعکس اس کے اقوامِ سابقہ کے مکذبین نے اس دعوت کو جھٹلایا تو اس تکذیب کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر نکبت و ادبار کا ہلاکت انگیز عذاب مسلط ہو گیا۔ اور پھر وہ قومیں آہستہ آہستہ ایسی فنا ہوئیں کہ ان کی صرف داستانیں باقی رہ گئیں۔ اگر تم بھی اپنے اعمالِ قلوب و جوارح سے اس آسمانی دعوت کی تصدیق نہ کرو گے جو قرآن کے اندر آئی ہے تو تمہارا بھی انجام وہی ہوگا۔ یہ ہے وہ مقصدِ عظیم جس کے لئے قرآنِ کریم میں مللِ قدیمہ اور حضرات انبیاءؑ سابقہ کے احوال و قصص بیان ہوئے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا تھا کہ یہ اقوام و ملل اور ان کے پیغمبر وہ ہوتے جن سے اُس زمانہ کے مخاطبین[1] واقف و شناسا تھے۔ یہ تمام قومیں جن کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے عرب اور اس کے قرب و جوار (فلسطین، شام، مصر وغیرہ) کے علاقوں میں بستی تھیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر بستیاں ایسی تھیں جن کے کھنڈرات عرب قافلوں کی گذرگاہوں میں پڑتے تھے۔ اور جن کی ٹھیکریاں ان اقوامِ گذشتہ کی داستانیں تھیں۔ وہ لوگ ان قوموں کے افسانے دن رات سنتے تھے۔ ان کے کان حضرات انبیائے کرامؑ کے اسمائے گرامی سے آشنا اور ان کے سوانح و احوال سے شناسا تھے۔ لہٰذا جب ان کے سامنے ان اقوامِ گذشتہ کے احوال و کوائف بیان کر کے ان کی توجہ اصل مقصود کی طرف منعطف کرائی جاتی تھی تو وہ ان داستانوں اور ان کے نتائج میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتے تھے۔ یعنی اس تذکیر و موعظت کا ایک حصہ تو پہلے ہی ان کے سامنے تھا۔ فقط اتنا باقی تھا کہ انہیں یہ بتا دیا جائے کہ ان اقوام کی یہ حالت کیوں ہوئی تھی؟ اور اگر تم بھی ایسا ہی کرو گے تو تمہاری بھی ویسی ہی حالت ہو جائے گی۔ سو ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے ان کے سامنے انہی اقوام و انبیائے کرامؑ کے واقعات

صرف سامی اقوام کیوں؟

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم تمام نوعِ انسانی کے لئے قیامت تک کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم صرف اُس زمانہ کے مخاطبین تک ہی محدود نہ تھی۔ لیکن اس تعلیم کی عالمگیریت کے لئے ضروری تھا کہ سب سے پہلے اس قوم کو بطور خمیر کے تیار کیا جاتا جو اس کی اوّلین مخاطب تھی۔ پھر وہ قوم اس شمعِ ایزدی کو لے کر ساری دنیا میں نکلتی اور اس نور سے دنیا بھر کے اندھیروں کو مٹاتی چلی جاتی۔ اس لئے ان حقائق کو ان کی اوّلین مخاطب قوم کے ذہن میں راسخ کرنے کے لئے یہ انداز و اسلوب اختیار کیا گیا۔

پیش کرنے چاہئیں تھے جن سے وہ پہلے ہی واقف تھے (یا اگر بعض تفاصیل سے واقف نہ تھے تو کم از کم ان کے نام سے ناآشنا نہ تھے۔ اگر قرآن ایسی اقوام یا ایسے مصلحین کرام کا ذکر کرتا جن کے نام تک سے عرب واقف نہ تھے تو وہ کہنے والے کا منہ تکنے لگتے کہ یہ کن لوگوں کی باتیں کر رہا ہے۔ مثلاً اس زمانہ کے عربوں سے یہ کہا جاتا کہ دیکھو تم نے اگر اس دعوت کی تکذیب کی تو تمہارا حال کنفیوشس کی قوم سا ہوگا۔ تو نہ صرف یہ کہ ان کا قلب اس سے کسی قسم کا اثر قبول نہ کرتا بلکہ وہ اس قسم کے سوال لے کر بیٹھ جاتے کہ یہ قوم کون تھی؟ کہاں بستی تھی؟ (جناب) کنفیوشس کی کیا تعلیم تھی؟ انہوں نے اس کی کیا خلاف ورزی کی۔ اور پھر ان کا کیا انجام ہوا؟ اور اس سوال و جواب کے بعد یہ بحث چھڑ جاتی کہ ان سے جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ اصل مقصد نگاہوں سے گم ہو جاتا اور سارا وقت اس نئی بحث وجدل کی نذر ہو جاتا۔ قرآن کریم کوئی تاریخ کی کتاب تو تھا نہیں کہ اسے تمام اقوام و ملل عالم کا تذکرہ کرنا ضروری تھا۔ اس نے اس قسم کے مباحث سے بچ کر وہ سیدھی راہ اختیار کی جس کا نتیجہ بالکل بدیہی طور پر سامنے آگیا۔ آپ تاریخ کے اوراق کو اٹھا کر دیکھئے مخاطبین نے ان اقوام و ملل کے احوال و ظروف کو کہیں محل نظر قرار دے کر بحث وجدل نہیں شروع کی بلکہ انہیں مسلمہ حقائق کے طور پر تسلیم کر لیا۔ اب باقی صرف اتنا کام رہ گیا کہ ان کے ذہن نشین یہ کرا دیا جائے کہ اگر تم نے بھی ایسا ہی کیا تو تمہارا حشر بھی ویسا ہی ہوگا۔

یہ ہے وہ مصلحت جس کے پیشِ نظر قرآن کریم نے صرف ان انبیاء کرام اور ان کی اقوام کا ذکر کیا ہے جو سامی نسل سے متعلق اور عرب کے قرب و جوار میں رہنے والی تھیں۔ ورنہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اس نے اس امر کی صراحت فرما دی ہے کہ اللہ کی طرف سے ہر قوم اور ہر ملک میں رسول آتے رہے۔ باقی رہا ان پر ایمان تو اس کا مطلب آج اتنا ہی ہے کہ ہم اعتراف کریں کہ وہ اپنے اپنے وقت میں اللہ کی طرف سے سچا پیغام لے کر آئے تھے جو اپنی اصلی صورت میں محفوظ نہ رہا۔ اور اُن سب کی حقیقی تعلیم آج قرآن کریم کے دفتین کے اندر محفوظ ہے جو نوعِ انسانی کے لئے قیامت تک کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔ اب اس کے سوا کسی اور کی اطاعت، خدا کی اطاعت نہیں کہلا سکتی۔

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ س[illegible] اقوام کو مذہب کی دنیا میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ مشہور مؤرخ رینان اپنی کتاب (LIFE OF JE[illegible]S) میں رقمطراز ہے۔

یہ سامی نسل ہی ہے جسے یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے نوعِ انسانی کا مذہب مرتب کیا۔
تاریخی حدود سے کہیں آگے دنیاوی خباثتوں اور آلودگیوں سے پاک اور صاف اپنے خیمہ میں
بیٹھے ان بدوی مصلحین نے نسلِ انسانی کے لئے مذہب کی تدوین کی۔ (ص ۳۷)

حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کی امامت واقعی سامی اقوام کے حصہ میں آئی تھی۔ ابھی یہ تاریخی انکشافات عہدِ طفولیت میں ہیں۔ انہیں آگے بڑھنے دیجئے۔ پھر سامی اقوام کی پوزیشن اور بھی نکھر کر سامنے آجائے گی۔

رسُول کا صحیح مقام

پھر قرآنِ کریم نے اس باب میں ایک اور بڑی غلط فہمی کو بھی دُور کیا ہے جو انسانی ضلالت وغوایت کی سب سے بڑی خطرناک گھاٹی ہے۔ دنیا کی کسی قوم کو لیجئے ان کی فرطِ عقیدت نے ان کے بانیانِ مذاہب کو انسانی درجہ سے اٹھا کر مرتبۂ الوہیت تک پہنچا دیا۔ (تفصیل اس کی اس جلد میں ملے گی جس میں اللہ کے متعلق گفتگو کی گئی ہے[1])۔ قرآنِ کریم نے رسولوں کی بشریت کو اس لئے بھی زیادہ وضاحت اور تکرار سے بیان کیا ہے تاکہ ان کی الوہیت کا خیال دامنِ عقیدت سے وابستہ نہ ہونے پائے۔ اس کے علاوہ مختلف مقامات پر اس امر کی بھی تصریح فرما دی کہ رسولوں کو اپنی ذات کے لئے بھی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ دوسروں کے معبود بن سکیں۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۚ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۚۖ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝ (۷/۱۸۸، نیز ۱۰/۴۹)

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو کہ میرا حال تو یہ ہے کہ خود اپنی جان کا نفع نقصان بھی اپنے قبضہ میں نہیں رکھتا۔ وہی ہو کر رہتا ہے جو خدا کا قانون چاہتا ہے۔ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو ضرور ایسا کرتا کہ بہت سی منفعت بٹور لیتا اور (زندگی میں) کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا ..... الخ

حضرات انبیائے کرامؑ کبھی قانونِ خداوندی سے سرکشی نہیں برتتے تھے۔ لیکن اگر ان سے کسی وقت کچھ

---

[1] اس کا نام "من ویزداں" ہے۔

ذرا سی بھول چوک ہو جاتی تو اس پر فوراً تادیب آجاتی تھی. مثلاً غزوۂ تبوک میں جب نبیٔ اکرمؐ نے بعض لوگوں کو عدم شرکت کی اجازت دے دی تو اس پر وحی نازل ہوئی کہ

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ○ (۹/۴۳)

(اے پیغمبر!) اللہ تمہیں معاف کرے. تم نے ایسا کیوں کیا کہ (ان کی منافقانہ غداریوں پر) انہیں (پیچھے رہ جانے کی) رخصت دے دی؟ اس وقت تک رخصت نہ دی ہوتی جب تک تم پر یہ نہ کھل جاتا کہ کون سچے ہیں، اور تو معلوم کر لیتا کہ کون جھوٹے ہیں؟

(اس قسم کی اور مثالیں 'معراجِ انسانیت' میں ملیں گی). ان واقعات کے بیان کرنے سے مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ حضرات انبیائے کرامؑ کو درجۂ الوہیت نہ دے دیا جائے. ان کا سب سے بلند مرتبہ مقامِ عبدیت ہے. اور یہی وہ مقام ہے جس میں شرف و اجتباء کی تمام سرفرازیاں اور سربلندیاں جھلمل جھلمل نظر آتی ہیں. یعنی قوانینِ خداوندی کی صحیح صحیح اطاعت کرنے والا. اور دوسروں سے اس کی اطاعت کرانے والا.

رسُول پر ایمان

یہ ہیں مقامِ رسالت کے مختلف پہلو جن پر ایمان لانا ایک مومن کے لئے ضروری ہے. جب تک رسولوں پر ایمان نہ لایا جائے وحی پر ایمان نہیں لایا جا سکتا. اور چونکہ وحی ہی وہ ذریعہ ہے جس سے خدا اور بندوں کے درمیان صحیح تعلق قائم ہوتا ہے. اس لئے وحی پر ایمان درحقیقت خدا پر ایمان ہے. یا یوں کہئے کہ خدا پر ایمان اس کی حاکمیت کا اعتراف ہے. یہ حاکمیت اس ضابطۂ قانون کی رُو سے قائم ہوتی ہے جو وحیٔ آسمانی کی وساطت سے بندوں کو ملتا ہے. اور اس ضابطہ کو نافذ العمل کرنے والی ہستی، رسول کی ذات ہوتی ہے. ایمان بالرسل کے پہلو پر ذرا پھر غور فرمایئے. ایک شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فلاں بات جس کا وہ حکم دیتا ہے اس کی اپنی طرف سے نہیں خدا کی طرف سے ہے. ظاہر ہے کہ اس کے اس دعوے کا کوئی ایسا محسوس دمرئی ثبوت اس کے پاس نہیں ہوتا جس سے ہر شخص اس کی تعلیم کو منزل من اللہ سمجھنے لگ جائے. نہ ہی وہ کوئی

ا؎ معجزات کے متعلق تفصیلی بحث "معراجِ انسانیت" میں ملے گی.

فوق البشر ہستی ہوتی ہے۔ وہ اپنے مخاطبین میں سے انہی جیسا ایک انسان ہوتا ہے۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ جو کچھ میں پیش کرتا ہوں تم اس پر غور و فکر کرو۔ اس سے تم سمجھ جاؤ گے کہ یہ واقعی صداقت پر مبنی ہے۔ یا اس پر عمل کر کے دیکھ لو کہ اس سے وہ نتائج مرتب ہوتے ہیں یا نہیں جن کا یہ تعلیم دعویٰ کرتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ انہیں (اس تعلیم پر عمل کرنے کے لئے تو ایک طرف) اس پر غور و فکر کے لئے تیار کرنے کے لئے بھی ایک ذہنی اور نفسیاتی آمادگی کی ضرورت ہو گی۔ سوال یہ ہے کہ ان کے اندر اس قسم کی آمادگی کس طرح پیدا ہو۔ اس کا ایک ہی ذریعہ ہو سکتا تھا۔ اور وہ یہ کہ اس شخص کے متعلق یہ یقین ہو کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ غلط بیانی سے کام نہیں لیتا۔ خیانت نہیں کرتا۔ چنانچہ جب نبی اکرمؐ سے پوچھا گیا کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ آپ خدا کے رسول ہیں، تو اس کے جواب میں حضورؐ نے کیا فرمایا۔ یہی کہ میں کہیں باہر سے نہیں آیا۔ میں نے اپنی عمر تمہارے اندر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں سچا ہوں یا (معاذ اللہ) جھوٹا۔ (تفصیل سابقہ عنوان میں گذر چکی ہے)۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ٥ (۱۰/۱۶)

یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملہ سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں۔

رسول اجر رسالت نہیں مانگتا

اور پھر بڑی چیز یہ کہ نبی اپنی تبلیغ رسالت کا کوئی معاوضہ یا اجر نہیں مانگتا[1]۔ اس کا اجر ان کے اللہ کے ہاں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ رسول ایک عظیم الشان انقلابی پروگرام اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اور اس کا اجر اس پروگرام کی کامیابی ہوتی ہے۔ وہ انسانوں کو باطل کی ہر قوت کے استبداد سے نجات دلانے کے لئے آتا ہے۔ اس لئے اس کا اجر باطل کی قوتوں کی شکست میں مضمر ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے نظام کے قیام کے لئے آتا ہے جس کی رُو سے تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت (پرورش و تربیت) ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی محنتوں کا اجر، اس کی سعی و کاوش کا صلہ، اس نظام کا قیام ہوتا ہے۔ اگر انقلاب کا علمبردار اجر کا خواہاں ہو جائے تو وہ تن پروری ہے۔ انقلاب نہیں۔ اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

---

[1] إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ کا مفہوم اپنے مقام پر آئے گا۔

وَمَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۲۶/۱۰۹﴾

اور (دیکھو! نوح نے بھی یہی کہا کہ) میں اس (تبلیغ احکامِ الٰہیہ) پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا. میرا اجر تو صرف جہانوں کے پروردگار کے ذمہ ہے (وہی دے گا. اور بس!)

اس لئے جو لوگ ان کی رسالت پر ایمان لاتے ہیں وہ کچھ احسان نہیں کرتے. جس طرح ایک مریض کسی ایسے طبیب کی حذاقت پر اعتقاد رکھ کر جو علاج کے لئے کسی معاوضہ کا خواہاں نہ ہو، اس کے مجوزہ نسخہ کا استعمال کرتا ہے تو یہ طبیب پر احسان نہیں بلکہ خود طبیب کا اس مریض پر احسان ہوتا ہے.

يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۖ قُل لَّا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُم ۖ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿۴۹/۱۷﴾

(اے پیغمبرِ اسلام! دیکھو) یہ لوگ تم پر احسان جتلاتے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں. تم کہہ دو کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو، بلکہ خدا خود تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دے دی. بشرطیکہ تم (اپنے دعوئے (اسلام) میں سچے ہو.

اس لئے حضرات انبیاء کرامؑ نوعِ انسان کے لئے آیۂ رحمت ہوتے ہیں.

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿۲۱/۱۰۷﴾

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر اس لئے کہ تمام دنیا کے لئے باعثِ رحمت ہو.

لیکن اس رحمت سے مستفیض وہی ہو سکتے ہیں جو رسول کی رسالت پر ایمان لائیں.

وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ ﴿۹/۶۱﴾

اور وہ ان لوگوں کے لئے سرتاسر رحمت ہے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں.

جس طرح ابرِ گہربار کی درفشانی سے وہی زمین متمتع ہو سکتی ہے جو اپنے سینے کو اس رحمت کے لئے کشادہ کر لے اور اپنے اندر اس کے جذب و قبول کی صلاحیت پیدا کر لے. اسی طرح رسول کی رسالت (قوانینِ خداوندی) بھی انہی کے لئے خوشگواریوں اور کامرانیوں کا موجب بنتی ہے جو ان قوانین کا اتباع کریں. دیکھئے قرآن کریم نے اس حقیقتِ کبریٰ کو بارش کی مثال سے کس قدر دل آویز اور دل کش انداز میں بیان

فرمایا ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّ لِیُذِیْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (۳۰/۴۶)

اور اس کی آیاتِ (قدرت) میں سے (یہ بھی ایک نشانی) ہے کہ وہ ہواؤں کو باعثِ بشارت بنا کر بھیجتا ہے۔ اور اس لئے (بھیجتا ہے) تاکہ تمہیں اپنی رحمت کے اثرات سے متمتع ہونے کا موقع دے اور اس لئے کہ خدا کے حکم سے کشتی (پانی میں) چلے اور تاکہ تم اس کے فضل کو طلب کر سکو۔ اور اس لئے بھی کہ تم اس کا شکر کرو۔

اس سے آگے ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰی قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَ كَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ○ (۳۰/۴۷)

اور (دیکھو، اے پیغمبرِ اسلام!) ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سے رسول ان کی اپنی قوموں کی طرف بھیجے ہیں۔ وہ ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے (مگر منکرینِ حق نے ان کا بھی انکار ہی کیا) تو ہم نے (بھی) مجرمین کو ان کی غلط روش کی سزا دی (اُن کی بدعملی اور انکار پر بد کے بد نتائج مرتب کر دیئے) اور ہم نے ایمان والوں کی امداد کرنا اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔

پھر اس کے بعد بارش اور مژدۂ جانفزا کی پیامبر ہواؤں کا ذکر ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ .... وَ لَئِنْ اَرْسَلْنَا رِیْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ یَكْفُرُوْنَ ○ (۴۸ - ۳۰/۵۱)

اور (دیکھو) اللہ وہ ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے۔ وہ ہوائیں ان بادلوں کو (فضا میں) پھیلاتی ہیں۔ پھر خدا انہیں آسمان پر جس طرح (اور جہاں) چاہتا ہے اپنے قانونِ کائنات کے مطابق پھیلا دیتا ہے اور انہیں اس طرح تو بر تو کر دیتا ہے کہ تم ان کے درمیان

ہیں ــ بارش کے قطرات نکلتے دیکھتے ہو. تو جب وہ اپنے بندوں میں سے جنہیں چاہتا ہے وہ بارش پہنچا دیتا ہے تو وہ خوش ہونے لگتے ہیں. اگرچہ بارش نازل ہونے سے پہلے وہ بالکل مایوس تھے. تو (ذرا) اللہ کی رحمت کے آثار کو دیکھو کہ وہ کس طرح (ان قطراتِ بارش سے) مُردہ زمین کو (دوبارہ) زندگی بخش دیتا ہے (کہ یکبارگی زمینیں سبزہ زاروں سے لہلہا اٹھتی ہیں) بلاشبہ یہی (خدا تو ہے جو) مُردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اور (دیکھو) اگر ہم ان ہواؤں کو بھیجیں (جو کھیتیوں کو پکانے والی ہوں) اور یہ لوگ کھیتوں کو زرد (پکا ہوا) دیکھ لیتے ہیں تو اس کے بعد یہ لوگ پھر خدا کی نافرمانیوں میں پڑ جاتے ہیں (جیسے انہیں خدا سے کبھی کوئی واسطہ تھا ہی نہیں)۔

آیندہ جلدوں[1] میں رحمتِ خداوندی کی انہی عطر بیز ہواؤں اور عنبر فشاں گھٹاؤں کا تذکرہ جمیل وجہ شادابیٔ قلب ونگاہ ہوگا. جس سے سعید روحوں کی کشتِ انسانیت لہلہا اُٹھی. لیکن زمینِ شور ویسی کی ویسی رہ گئی. وَلَا يَزِيدُ الظَّٰلِمِينَ إِلَّا خَسَارًا۔

رسُول اور نبی

قرآنِ کریم میں پیغامبرانِ خداوندی کے لئے رسول کا لفظ بھی آیا ہے اور نبی کا بھی. رسول کے معنی پیغام رساں اور نبی کے معنی ہیں وہ جو شخص جو بلند مقام پر کھڑا ہو. عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ رسول وہ ہے جسے اللہ کی طرف سے کتاب ملے. اور نبی وہ جو بغیر کتاب کے آئے. لیکن یہ تقسیم انسانوں کی خود ساختہ ہے. قرآنِ کریم سے اس کی سند نہیں ملتی. برعکس اس کے، قرآنِ کریم سے ظاہر ہے کہ رسالت اور نبوت ایک ہی مقام کے دو نام اور ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں. نبوت کے معنی ہیں خدا کی طرف سے وحی کا ملنا. اور رسالت کے معنی ہیں اس وحی کو دوسروں تک پہنچانا. ظاہر ہے کہ وحی ملتی ہی اس لئے ہے کہ اسے دوسرے انسانوں تک پہنچایا جائے اور اس کے مطابق انسانی معاشرہ کی تشکیل کی جائے. لہٰذا نبوت، بغیر رسالت کے بے مقصد ہوتی ہے. اور نبوت

---

[1] جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور اور معراجِ انسانیت۔

کے بغیر رسالت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا. جسے خدا کی طرف سے وحی نہیں ملے گی وہ انسانوں تک پہنچائے گا کیا؟ نبوت کے ساتھ رسالت کی تصریح کر دینے سے قرآن نے ایک بہت بڑی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے. اس نے بتایا ہے کہ نبوت کوئی ایسا انفرادی تجربہ نہیں جس کا تعلق محض اس خاص شخص کی ذات سے ہو. اس شخص کو حصولِ وحی کے لئے منتخب کیا جاتا ہے تاکہ وہ خدا کی وحی کو دوسروں تک پہنچائے. اس لئے اس اعتبار سے دیکھئے تو نبوت کے بعد رسول کا اصل فریضہ رسالت ہی ہوتا ہے. رسالت بہت بڑی ذمہ داری کا منصب ہے. یہیں سے وہ تمام جاں گداز اور صبر آزما مراحل شروع ہوتے ہیں جو، قرآن کے الفاظ میں رسول کی کمر توڑ دیتے ہیں. رسول اپنے اس پیغام کو لے کر اپنے اس معاشرے میں جاتا ہے جہاں کا ذرہ ذرہ اس پیغام کی مخالفت کرتا ہے. اُسے اس معاشرے میں وہ انقلاب پیدا کرنا ہوتا ہے جو اس کی وحی کی غایت ہوتا ہے. لہذا نبوت کے معنی ہیں خدا کی طرف سے ضابطۂ حیات کا ملنا اور رسالت کے معنی ہیں اس ضابطۂ حیات کے مطابق انقلاب پیدا کرنا. اس لئے قرآن نے ان حضرات کو کہیں انبیاء کہا ہے اور کہیں رسول کہہ کر پکارا ہے. مثلاً سورۃ انعام کے دسویں رکوع میں حضرت ابراہیمؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ، زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ، الیاسؑ، اسمٰعیلؑ، یسعؑ، یونسؑ، لوط (علیہم السلام) کے تذکرہ کے بعد فرمایا.

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَإِن يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ۝ ۶/۹۰

نیز ۲۷/۲۹؛ ۱۶/۴۵ و ۲۶/۵۷).

یہ وہ انبیاء ہیں جنہیں ہم نے کتاب، حکومت اور نبوت عطا فرمائی ہے. اگر یہ لوگ (تمہارے مخالفین) ان باتوں کے ساتھ کفر اور نافرمانی کا برتاؤ کرتے ہیں (تو کرنے دو) ہم نے ایک ایسی قوم کو ان باتوں کو سونپ دیا ہے جو ان کے ساتھ کفر اور نافرمانی کرنے والے نہیں ہیں.

ان حضرات میں سے کئی ایسے ہیں جن کی کتاب کا ذکر قرآن کریم میں جداگانہ طور پر نہیں کیا گیا. لیکن قرآن کریم کا واضح ارشاد موجود ہے کہ انہیں کتاب بھی دی گئی اور نبوت بھی. پھر یہ بھی دیکھئے کہ حضرات انبیاء کرام میں کسی جگہ انہیں رسول کہا گیا ہے کسی جگہ نبی.

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق خود قرآن کریم میں ہے کہ انہیں اور حضرت موسیٰؑ کو صحف عطا کئے گئے.

صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى ۝ (۸۷/۱۹)

(یہ تمام باتیں) ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں بھی موجود ہیں.

بایں ہمہ حضرت ابراہیمؑ کو نبی کہا گیا.

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ (۱۹/۴۱)

اور (اے پیغمبرِ اسلام!) کتاب (یعنی قرآن) میں ابراہیم کا ذکر کرو، بلاشبہ وہ بہت سچے انسان اور نبی تھے.

حضرت عیسیٰؑ کو انجیل عطا ہوئی. لیکن آپ نے خود فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا ہے.

قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ قف اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝ (۱۹/۳۰)

اور (دیکھو) عیسیٰ نے کہا کہ میں تو اللہ کا بندہ ہوں. (کہ مقامِ عبدیت ہی سب سے بڑا مقام ہے. میرے خدا نے) مجھے کتاب (انجیل) دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے.

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ حضرت عیسیٰؑ رسول تھے.

وَ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ (۴/۱۵۷)

اور ان (یہودیوں) کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے عیسیٰ ابنِ مریم اللہ کے رسول کو قتل کردیا.

ان کے برعکس حضرت اسمٰعیلؑ (جن کی کتاب کا جداگانہ ذکر نہیں ہے) کے متعلق فرمایا کہ رسول و نبی تھے.

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ز اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ (۱۹/۵۴)

اور (اے پیغمبرِ اسلام!) کتاب (یعنی قرآن) میں اسمٰعیل کا ذکر کرو، بلاشبہ وہ ایک پیکرِ خلوص اور رسول و نبی تھے.

سورۂ انعام کی آیت نمبر ۹۰ میں ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں کہ حضرات مرسلین علیہم السلام کے تذکرہ کے ضمن میں فرمایا کہ انہیں کتاب و نبوت عطا کی گئی تھی. سورۂ نساء کے تیئیسویں رکوع میں ارشاد ہے کہ

اِنَّا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ كَمَا اَوْحَيْنَا اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْ

بَعْدِہٖ ؕ........لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ○ (۱۶۳ - ۴/۱۶۵)

(اور اے پیغمبرِ اسلام! دیکھو) بلاشبہ ہم نے تمہاری طرف بالکل اسی طرح وحی کی ہے جیسے ہم نے نوح کی طرف اور نوح کے بعد دوسرے انبیاء کی طرف وحی کی تھی۔ اور (جس طرح) ہم نے ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی تھی، اور (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں بالکل اُسی طرح کتاب قرآن، عطا کی ہے، جس طرح ہم نے داؤد کو زبور عطا کی تھی۔

اور (کچھ انہی حضرات انبیاء کرامؑ پر منحصر نہیں ہے) اور بھی بہت سے رسول ہیں جن کے (کچھ) واقعات ہم نے اس سے پہلے تم سے بیان کر دیئے ہیں اور بہت سے رسول ہیں جن کے واقعات ہم نے تم سے بیان نہیں کئے۔ (جس طرح ہم نے ان پر وحی کی تھی اور کتاب دی تھی، بالکل اسی طرح ہم نے تم پر بھی وحی کی ہے اور کتاب) قرآن عطا کی ہے۔ (نوعیتِ وحی اور عطاء کتاب میں کوئی فرق اور امتیاز روا نہیں رکھا گیا)۔ اور خدا نے موسیٰ سے اچھی طرح کلام فرمایا تھا) یہ (سب کے سب) خدا کے رسول تھے جو (نتائجِ اعمال کی) بشارت دینے والے اور (انکار و بدعملی کے بُرے نتائج سے ڈرانے والے تھے، تاکہ رسولوں کے آجانے کے بعد لوگوں کی خدا پر کوئی (صحیح اور قابلِ پذیرائی) حجت باقی نہ رہے۔ اور (تم جانتے ہو کہ) خدا بڑے غلبہ اور حکمت والا ہے۔

یہاں ان حضرات کو رسول کہا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے حضرات انبیاء کرامؑ پر ایمان ضروری ہے (ایمان کے پانچ اجزاء میں سے یہ ایک جزو ہے)۔ سورۂ بقرہ کے بائیسویں رکوع میں ہے۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ...... وَ النَّبِیّٖنَ (۲/۷۷)

یہ کوئی بھلائی کی بات نہیں ہے کہ تم (نمازوں میں) اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو، البتہ بھلائی اور نیکی اس شخص کی بھلائی اور نیکی ہے جو اللہ پر، قیامت (اور حشر و نشر) کے دن پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور انبیاء پر ایمان لائے۔

اور اسی سورت کے چالیسویں رکوع میں ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ قف لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ قف وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ۝ (۲/۲۸۵) نیز (۳/۸۴)

اللہ کا رسول اس (کلام) پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہے اور جو لوگ (دعوتِ حق پر) ایمان لائے ہیں، وہ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں یہ سب اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں (ان کے ایمان کا دستور العمل یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں) ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کو دوسرے سے جدا نہیں کرتے اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں داعیٔ حق نے پکارا تو) انہوں نے کہا خدایا! ہم نے تیرا حکم سنا اور ہم نے تیرے آگے اطاعت کا سر جھکا دیا۔ تیری حفاظت ہمیں نصیب ہو۔ اے پروردگار! ہمیں تیرے قانون کی طرف ہی لوٹنا ہے۔

یعنی ایک جگہ نَبِیّٖن اور دوسری جگہ رُسُل، اسی طرح جہاں یہ فرمایا ہے کہ بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دی گئی ہے، وہاں ایک مقام پر انہیں رُسُل کہا گیا ہے! اور دوسرے مقام پر انبیاء سورۂ بقرہ میں ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ (۲/۲۵۳)

یہ ہمارے رسول ہیں، جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے۔

اور سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ (۱۷/۵۵)

اور بلاشبہ ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ اور داؤد کو ہم نے (اپنی کتاب) زبور عطا فرمائی۔

خود نبیٔ اکرمؐ کو کہیں رسولؐ کے لقب سے مخاطب کیا گیا ہے۔

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ... (۵/۶۷)

اے رسول! ان احکام کو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کئے گئے ہیں (لوگوں تک) پہنچا دو!

اور کہیں نبی کے لقب سے۔ مثلاً

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ (۳۳/۱)

اے نبی! اللہ کا تقوےٰ اختیار کرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو، بلاشبہ خدا (سب کچھ) جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اور کہیں رسول و نبی دونوں جامع القاب سے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ (۷/۱۵۷، نیز ۷/۱۵۸)

(اور دیکھو!) جو لوگ پیغمبر (اسلام) نبیِ اُمّی کا اتباع کرتے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے رسول اور نبی ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں۔ صاحبِ کتاب اور غیر صاحبِ کتاب کا فرق ذہنِ انسانی کا پیدا کردہ ہے۔ نبی یا رسول بغیر کتاب کے آ ہی نہیں سکتا۔ (پیغام رساں کے پاس اگر کوئی پیغام ہی نہیں تو وہ آئے گا کیا کرنے کے لئے؟ رسول کے پیغام کو اس کی کتاب کہتے ہیں)۔ اس لئے قرآن کریم نے بالکل واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ ہر ایک رسول کے ساتھ کتاب نازل کی گئی۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ...

(۵۷/۲۵)

اور بلاشبہ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان سب کے ساتھ کتاب (ضابطۂ قوانین) نازل کی۔

اور اسی طرح ہر ایک نبی کے ساتھ کتاب نازل کی گئی۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ

النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ..... (۲/۲۱۳)

چونکہ نوعِ انسانی کو ایک امت کی حیثیت سے (مدنی) زندگی بسر کرنا تھا اس لئے خدا نے انبیاء کو بھیجا جو (اعمال کے نتائج کی) بشارت دینے والے اور (انکار و بدعملی کے بدنتائج سے) ڈرانے والے تھے. اور ان سب کے ساتھ سچائی کے ساتھ کتاب (ضابطۂ قوانین) نازل کی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان مسائل میں جن میں وہ اختلاف کر رہے تھے (خدا کے قانون اور اس کی مرضی کے مطابق) فیصلہ کر سکیں۔

مَعَهُمُ (ان سب کے ساتھ) قابلِ غور ہے. کوئی رسول اور کوئی نبی بغیر کتاب کے نہیں آیا. لہٰذا نبی یا رسول بلا کتاب کا تصور یکسر غیر قرآنی ہے. اور تشریعی و غیر تشریعی کی تفریق اس حقیقت سے بیگانگی کی دلیل. جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہر رسول (یا نبی) پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی تھی. وہ وحیٔ اس کی کتاب[1] تھی. اور وہی کتاب اس کی شریعت کا ضابطہ. کوئی نبی اور رسول بغیر کتاب کے نہیں آسکتا. اور چونکہ قرآنِ کریم کے اندر دین مکمل ہو چکا ہے اور وہ دنیا میں اپنی اصلی شکل میں موجود ہے. اس لئے اب کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں. اور چونکہ کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں اس لئے اب کوئی نبی نہیں آسکتا. یہ مفہوم ہے خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ کا جس کی تفصیل "ختمِ نبوت" کے عنوان میں (معراجِ انسانیت) میں ملے گی. نبوت کا سلسلہ نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گیا. اب کسی کو وحی نہیں مل سکتی. وحی کے ذریعے خدا نے جو کچھ دینا تھا وہ سب قرآن کے اندر آچکا. اور قرآن کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا گیا. اس کی

---

[1] جس طرح قرآنِ کریم میں بعض رسولوں کا ذکر ہے اور بعض کا نہیں. اسی طرح ان میں سے بعض کی کتابوں کا ذکر ہے اور بعض کا نہیں. لیکن کتاب ہر رسول کے ساتھ ہوتی تھی. حتیٰ کہ حضرت ہارونؑ (جنہیں حضرت موسیٰؑ کا وزیر کہا گیا ہے ۲۵/۳۵) ان کے متعلق فرمایا کہ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲۱/۴۸)

اور (دیکھو) بلاشبہ ہم نے موسیٰ اور ہارون کو (حق و باطل میں) تمیز کرنے والی کتاب اور (سچائی کی) روشنی اور متقی لوگوں کے لئے نصیحت کی چیز عطا فرمائی۔

حضرت ہارونؑ کی رسالت کے متعلق حضرت موسیٰؑ کے عنوان کے ماتحت ذکر آئے گا۔

حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا. باقی رہا اس کتاب کے ذریعے ایسا معاشرہ متشکل کرنا جو وحی کا مقصود ہے سو اس کی ذمہ داری اس اُمّت کو سونپ دی گئی جسے اس کتاب کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ ان دونوں کا نام ہے نظامِ خداوندی. یعنی وہ نظام جسے اُمّتِ محمدیہ قرآن کی رُو سے قائم کرے. اس نظام کی موجودگی میں دنیا کو نہ کسی نبی کی ضرورت ہوگی اور نہ رسول کی. وَذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ حضرات انبیاء کرامؑ کا یہ سلسلہ کہاں سے شروع ہوا اور کن کن مراحل سے گزرتا ہوا کہاں تک پہنچا. اس کا تعلق تاریخ رسالت سے ہے. جو معارف القرآن کی جلدوں میں تکمیل پذیر ہوگی۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ۔

خلاصۂ مبحث

اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی راہ نمائی کے لئے اس کی طرف سے ہدایت ملے گی. یہ ہدایتِ آسمانی، حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے ملتی رہی. ان کے ذمہ انسانوں تک خدا کا پیغام پہنچانا تھا. یہ تمام رسول انسان تھے. مافوق البشر ہستیاں نہ تھے. ان رسولوں کے ذمہ صرف پیغام رسانی کا فریضہ ہی نہ تھا بلکہ اس پیغام کو عملی طور پر متشکل بھی کرنا تھا. اور اس طرح سے ثابت کرنا تھا کہ وہ نظام جس کی طرف وہ دعوت دیتے ہیں ناممکن العمل نہیں. رسول سب سے پہلے خود اس وحی کا اتباع کرتا تھا جو اسے خدا کی طرف سے ملتی تھی. اس اتباعِ وحی سے وہ ایک نظام قائم کرتا تھا جس کی بنیاد اللہ کی حاکمیت کے اقرار پر ہوتی تھی. وہ خود اس نظام کا اوّلیں مرکز ہوتا تھا. لہٰذا اس نظام کی اطاعت کے لئے ضروری تھا کہ اس مرکز کی اطاعت کی جاتی. اس لئے خدا کی اطاعت بذریعہ رسول کی اطاعت کے ہونی لازمی تھی. لیکن رسول کی اطاعت اس کی ذات کی اطاعت نہ تھی. یہ دراصل خدا ہی کی اطاعت تھی، کہ رسول خود خدا کی کتاب کی اطاعت کرتا تھا. رسول، ایک طبیبِ مشفق کی طرح ہمیشہ اس غمخواری

---

[1] یعنی جوئے نور، برق طور، شعلۂ مستور، اور معراجِ انسانیت میں۔

میں گھلتا رہتا تھا کہ لوگ تباہی و بربادی کے جہنم سے بچ جائیں. لیکن اس کے ذمہ پیغام رسانی کا فریضہ تھا. ہدایت کو دلوں کے اندر اتار دینا اس کے بس میں نہ تھا.

پھر ایک اور حقیقت کی طرف آیئے. آج عام طور پر دو قسم کے لوگ ملیں گے. ایک وہ جو کہتے ہیں کہ کہ ان کا مذہب تو سچا ہے لیکن باقی سب بانیانِ مذاہب (معاذ اللہ) جھوٹے تھے. دوسرا گروہ افراط کی طرف جا کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ نہیں، دنیا کے تمام مذاہب بالکل سچے اور یکساں ہیں. یہ دونوں مسلک غلط اور قرآن کی رُو سے باطل ہیں. قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر قوم کی طرف اپنے رسول بھیجے جن کی تعلیم اصولی اور بنیادی طور پر ایک تھی لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ تعلیم اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رہتی تھی. اس لئے اللہ کا ایک اور رسول آجاتا تھا. یہ سلسلہ یونہی جاری رہا. تا آنکہ بالآخر یہ تمام صداقتیں ایک جگہ جمع کر کے قرآن کے اندر محفوظ کر کے رکھ دی گئیں. اب دنیا میں خدا کی سچی تعلیم صرف قرآنِ کریم کے اندر ہے اور کہیں نہیں. اس لئے قرآن کی اطاعت ہی خدا کی اطاعت ہے.

۲. رسول اور نبی ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں ان میں کوئی فرق نہیں تھا.

نگہِ بازگشت

[گذشتہ اوراق میں جو مباحث آپ کی نظروں سے گذرے ہیں وہ متعدد عنوانات پرشتمل تھے اور ان میں قرآنی تعلیم کے بہت سے بنیادی گوشے آچکے ہیں. چونکہ یہ بنیادی اصول اس کے بعد بھی بار بار سامنے آئیں گے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سب پر ایک تیرتی ہوئی نگہِ بازگشت ڈال لی جائے تاکہ ان سب کی یاد تازہ ہوجائے. اور آگے بڑھنے سے پیشتر ان قطع کردہ منازل کے مناظر ایک ہی جگہ سمٹ کر سامنے آجائیں.]

نظریۂ ارتقاء دورِ حاضرہ کے علمِ طبیعیات کا معرکہ آراء کارنامہ تخلیقِ انسانی کے متعلق نظریۂ ارتقاء ہے. اس نظریہ کا ماحصل یہ ہے کہ انسان جس شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے، ازابتداء اسی شکل میں وجود میں نہیں آگیا تھا. بلکہ اوّلیں جرثومۂ حیات، ارتقائی مراحل طے کرتے اور مختلف مراحل میں سے گزرتے گزرتے اس مقام تک پہنچا ہے. قرآنِ کریم سے بھی اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے. لیکن اس تائید و توافق کے باوجود اس باب میں قرآنی تعلیم اور مغرب کے مادہ پرست علمائے طبیعیات کے نظریہ میں ایسا بنیادی فرق ہے جس کے پیشِ نظر ان دونوں کو کبھی ہم آہنگ نہیں قرار دیا جاسکتا ہم آہنگی تو ایک طرف، ان دونوں کی رُو سے حیات اور کائنات کے متعلق جو مختلف تصورات قائم ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں. کائنات کے متعلق میکانکی تصور انیسویں صدی کے مادہ پرست (MATERIALIST) علمائے طبیعیات کی تخلیق ہے. جو یورپ میں نظریۂ ارتقاء کے اوّلیں علمبردار ہیں. ان کے نزدیک، زندگی، غیرنامی (INORGANIC) مادہ میں بعض کیمیائی اور طبیعیاتی تبدیلیوں سے خود بخود (محض اتفاقی طور پر) پیدا ہوگئی اور اس طرح کاروانِ حیات نے (میکانکی طور پر) حیوانی پیکر

کی صورت اختیار کرلی۔ اس کے بعد، حیوانی دماغ میں بعض اسی قسم کی تبدیلیوں سے شعور (CONSCIOUSNESS) پیدا ہوگیا۔ اور یوں خاک کے ذرّے جیتے جاگتے باشعور انسان کی صورت میں متشکل ہوگئے۔ اس کے بعد جب یہ میکانکی ارتباط (MECHNAICAL COMBINATION) منتشر (DISINTEGRATE) ہوجائے گا تو زندگی اور شعور سب ختم ہوجائیں گے۔ لہٰذا زندگی یہی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے اور اسی کا تحفّظ و استحکام، انسان کا نصب العینِ حیات۔

اس کے برعکس، قرآنِ کریم کی رُو سے، نہ زندگی بے جان مادّہ میں کیمیائی اور طبیعیاتی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے اور نہ ہی انسانی شعور، حیوانی دماغ کے میکانی ارتقاء کی اگلی منزل۔ زندگی اور شعور کا سرچشمہ وہ خدائے حیّ و قیوم اور حکیم و بصیر ہے جو اپنی حکمتِ بالغہ کے ماتحت اس کائنات کو وجود میں لایا اور اس کے بعد بایں شانِ ربوبیت، اسے اس کے منتہیٰ کی طرف لے جارہا ہے۔ جن امور کا محققینِ مغرب نے انکشاف کیا ہے وہ درحقیقت وہ قوانین ہیں جن کے مطابق خالقِ کائنات اس تمام کارگہِ ہستی کو چلا رہا ہے اور جن کے مطابق ایک جرثومۂ حیات مختلف ارتقائی مراحل طے کرکے پیکرِ انسانی تک پہنچا ہے۔ لیکن (انہی قوانینِ خداوندی کی رُو سے) انسان کی موجودہ زندگی ارتقاء کے اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی نہیں بلکہ یہ گویا تمہید ہے کتابِ حیات کی جلد دوم کی۔ انسانی تخلیق کی ابتدائی کڑیاں تو اسی سلسلہ کی مظاہر ہیں جس کی رو سے دوسرے حیوانات کی پیدائش ہوتی ہے لیکن اس کے بعد، انسانی تخلیق ایک یکسر نئے دائرے میں داخل ہوتی ہے جو پچھلی کڑیوں کا طبعی نتیجہ نہیں۔ اس مقام پر اس میں رُوحِ خداوندی (DIVINE ENERGY) کا شمہ ڈالا جاتا ہے اور اس طرح اسے صاحبِ شعور و بصیرت، اور اختیار و ارادہ کا مالک انسان بنادیا جاتا ہے۔ یہی وہ رُوحِ خداوندی ہے جس سے انسان اپنی مستقل انفرادی حیثیت رکھتا ہے اسی کو انسانی ذات، نفس، خودی، انا یا ایغو، کہا جاتا ہے۔ انسانی تگ و تاز کا ماحصل اسی نفس (یا ذات) کی نشوونما اور تکمیل ہے۔ یہ انسانی خودی اپنی مناسب نشوونما (ربوبیت یا بالیدگی) سے ایسی مستحکم ہوجاتی ہے کہ موت بھی اسے فنا نہیں کرسکتی۔ اس طرح انسانی نفس حیاتِ جاوید کا مستحق ہوجاتا ہے۔

مغرب کی غلط نگہی

مغربی مادہ پرستوں کے میکانکی ارتقاء کے نظریہ کی بنیادیں اس قدر کمزور تھیں کہ انیسویں صدی کے اخیر میں خود مغرب ہی سے اس

کی تردید و مخالفت میں آوازیں اٹھنی شروع ہوگئیں. چنانچہ گلاسکو یونیورسٹی کا پرنسپل اور وائس چانسلر، جون کیرڈ (JOHN CARID) اپنے (۹۱ - ۱۸۷۸ء کے) لیکچرز (خطبات) میں کہتا ہے:

> آج تک اس امر کی کوئی ایک مثال بھی نہیں پیش کی جا سکی کہ زندگی محض کیمیائی عناصر (CHEMICAL CONSTITUENTS) سے پیدا ہوگئی ہو. لہٰذا یہ قیاس کہ زندگی کا ارتقا کسی اور زندگی کے اثر کے بغیر بھی ممکن ہے، بلا دلیل ہے. (PROTOPLASM) کو، جسے مادۂ حیات قرار دیا جاتا ہے محض کیمیائی مرکبات کی سطح پر نہیں رکھا جا سکتا. وہ مادۂ حیات جس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور جس کے کیمیائی اجزا معلوم ہو سکتے ہیں زندہ نہیں بلکہ مردہ مادہ ہوتا ہے. اس کے برعکس، وہ مادۂ حیات جسے زندہ کہا جا سکتا ہے، اگرچہ انہی اجزا کا مجموعہ ہوتا ہے جو مُردہ مادۂ حیات میں پائے جاتے ہیں لیکن اس سے ایسے خواص و اعمال کا مظاہرہ ہوتا ہے جو بالکل جدید ہوتے ہیں اور جنہیں اس کے کیمیائی اور طبیعیاتی اجزا کی طرف کبھی منسوب نہیں کیا جا سکتا. اگر کوئی شے کسی ایک وقت میں ایسے خواص کا مظاہرہ کرتی ہے جو یکسر کیمیائی یا میکانکی ہوں اور دوسرے وقت میں ایسے خواص کا جن سے وہ اپنے آپ کو ایک جیتے جاگتے، بڑھنے پھولنے والے جسم میں تبدیل کر لے یا ایسے افعال کا جن سے وہ دوسری چیزوں کو اپنا جزوِ بدن بنا سکے اور پھر اپنے جسم سے کچھ اور پیدا کر سکے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دوسری صورت میں جو نئی چیزیں اس میں پیدا ہوئی ہیں ان کا سبب کوئی ایسا جدید عنصر ہے جو پہلی صورت میں اس میں موجود نہ تھا جبکہ اس سے محض کیمیائی یا میکانکی عمل ظہور میں آتا تھا.

(INTERODUCTION TO THE PHILOSOPHY OF RELIGION; P-96)

یہ "جدید عنصر" زندگی ہے جو مادہ کی پیداوار نہیں. رفتہ رفتہ وہاں کے علمائے طبیعیات میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا جس نے یہ دیکھا کہ سلسلۂ ارتقاء میں جو نئی چیز پیدا ہوتی ہے اس کے خواص ان عناصر کے خواص سے مختلف ہوتے ہیں جن کے امتزاج سے وہ نئی چیز پیدا ہوتی ہے. اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ بے جان مادہ میں جب زندگی پیدا ہوتی ہے تو وہ مادہ کے میکانکی ارتقاء کا نتیجہ نہیں.

زندگی کیسے وجود میں آجاتی ہے؟ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس لئے اس کا نام انہوں نے ہنگامی ارتقاء[1] (EMERGENT EVOLUTON) رکھ دیا۔ اسی قسم کے ہنگامی ارتقاء سے (ان کے نزدیک) شعورِ انسانی پیدا ہوگیا۔ ان میں اور پہلی قسم کے مادہ پرستوں میں البتہ اتنا فرق[2] ہے کہ ان کے نزدیک شعور (اسی طرح وجود میں آکر) اپنی جداگانہ ہستی رکھتا ہے، اور کیمیا اور طبیعیات (CHEMISTRY AND PHYSICS) کے ان قوانین سے جن کے تابع جسمِ انسانی ہوتا ہے، الگ قوانین کے ماتحت ہوتا ہے۔

لیکن یہ نظریہ بھی چونکہ اطمینان بخش نہ تھا اور اس پر مختلف قسم کے اعتراضات وارد ہوتے تھے اس لئے مغربی فکر اور آگے بڑھا اور اس نے تخلیقی ارتقاء (CREATIVE EVOLUTION) کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریہ کے علمبردار جزئیات وتفاصیل میں باہمدگر متفق نہیں لیکن (جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے) اس کا ماحصل یہ ہے کہ زندگی کی لہر مادہ کے ساتھ شروع سے ہی موجود ہے لیکن خوابیدہ۔ کائنات تغیرات کی آماجگاہ ہے اس مسلسل تغیر سے زندگی میں بیداری پیدا ہوتی ہے اور جب زندگی مناسب جسم سے متمسک ہوتی ہے تو اس سے ہنگامی طور پر شعور پیدا ہوجاتا ہے[3] شعور پیدا تو اس طرح ہوتا ہے لیکن اس کے بعد زندگی اور جسم، دونوں سے الگ اپنا مستقل وجود رکھتا ہے۔ مغربی محققین کی اب کثیر جماعت ایسی ہے جو میکانکی ارتقاء کے نظریہ کو ٹھکرا کر نفسِ انسانی (MIND) کے جداگانہ وجود کی قائل ہے۔ (ان کا تفصیلی ذکر وحی کے عنوان میں ہوچکا ہے)۔

---

[1] انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ بعض اوقات ارتقاء کے ایک ہی سلسلہ میں ایسی چیزیں ظہور میں آجاتی ہیں جو باقی چیزوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ ایسی چیزوں کو (MUTATION SPORTS) کہتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے یہ توجیہہ بیان کی کہ ارتقاء کا سلسلہ بعض اوقات جست لگا کر علت ومعلول کی بہت سی کڑیوں کو پھاند جاتا ہے جس سے ایسی ایسی چیزیں ظہور میں آجاتی ہیں جن سے کوئی سائنٹفک توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی۔

[2] ہکسلے کے نزدیک "شعور بھی اسی طرح مادہ کے ایک عمل کا نام ہے جس طرح حرکت" لیکن TYNDALL لکھتا ہے کہ "یہ چیز تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ دماغ کی طبیعی ہیئت، شعور پیدا کرسکتی ہے"۔

[3] پروفیسر الیگزنڈر کے نزدیک شعور بھی زندگی کے اندر خوابیدہ ہوتا ہے اور زندگی کے تخلیقی ارتقاء سے بیدا ہوجاتا ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ مغرب کی مادہ پرستی (MATERIALISM) خود وہیں کے محققین کے ہاتھوں کس طرح رفتہ رفتہ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے. لیکن چونکہ ان لوگوں کے سامنے وحی کی (بے رنگ و بے لوث) روشنی نہیں اس لئے وہ ظن وتخمین کی وادیوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں. حقیقت تک ان کی رسائی نہیں.

باطل بنیادوں پر تہذیب

مغربی مفکرین انیسویں صدی کے کائنات کے میکانکی تصوّر کو چھوڑ کر بہت آگے نکل چکے ہیں لیکن اس قوم کی اور اس کے ساتھ ساری دنیا کی بدبختی کہ ان کی جو تہذیب اس میکانکی تصوّر کی بنیادوں پر اٹھی تھی وہ بدستور انہی بنیادوں پر قائم رہی. اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی. چونکہ یہ بنیاد ہی غلط تھی اس لئے اس پر اٹھی ہوئی عمارت بھی بے حد نازک اور کمزور تھی. چنانچہ جب زندگی کے ٹھوس حقائق کا سامنا ہوا تو وہ پہلے ہی دھچکے میں متزلزل ہوگئی اور اس کا نتیجہ آج اہلِ مغرب اور ان کے ساتھ اس ساری دنیا کے سامنے ہے جو اس تہذیب کے اثرات سے ملوّث ہوچکی ہے. اس قسم کی تہذیب کبھی حقائق کا مقابلہ نہیں کرسکتی.

"تاریخِ تہذیب" کا مشہور عالم (BRIFFAULT) اپنی کتاب (THE MARKING OF HUMANITY) میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہ روما کی عظیم الشان سلطنت اور اس قدر درخشندہ تہذیب کیوں تباہ ہوگئی، لکھتا ہے.

> انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی تدبّر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے. اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم وضبط اور ادھر اُدھر کی جزئی مرمّت سے کبھی رفع نہیں ہوسکتی. جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدر ہے. روما کی سلطنت عام انسانوں کی لوٹ کھسوٹ سے ایک خاص جماعت کو متموّل بنانے کا ذریعہ تھی. انہوں نے اس "سوداگری" کو نہایت قابلیت اور تدبّر، خلوص اور دیانتداری سے چلایا. لیکن (حُسنِ انتظام کی) یہ تمام خوبیاں، بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچاسکیں. غلط بنیادوں کے اثرات بلا رورعایت نتیجہ خیز ہو کر رہے. (صفحہ ۱۵۹)

بقول علاّمہ اقبالؒ ؎

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

اب ایک اور گوشے کو سامنے لایئے۔ غیر ذی حیات چیزوں کو اپنی ہستی کا احساس نہیں ہوتا اسی لئے انہیں اس کی حفاظت کی فکر نہیں ستاتی۔ اور جب کسی شے کو اپنی حفاظت کی فکر نہ ہو تو پھر ان قوتوں سے جو اسے فنا کرنے پر آمادہ ہوں کسی قسم کی مزاحمت نہیں ہوتی۔ لہٰذا غیر ذی حیات (یا غیر نامی) چیزوں کا کسی قسم کے تزاحم و تصادم سے واسطہ نہیں پڑتا۔ وہ لذتِ کشمکش سے ناآشنا ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس، ذی حیات (یا نامی اشیاء) میں اپنی ہستی کا احساس ہوتا ہے۔

کشمکش کے مدارج

وہ دنیا میں اپنی خاطر زندہ رہنا چاہتی ہیں۔ انہیں اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ہر مخالف قوت کا مقابلہ کرتی ہیں۔ لیکن (زندگی کے ابتدائی مراحل میں) حفاظتِ خویش کا یہ تقاضا ان کے اندر جبلی طور پر (BY INSTINCT) ہوتا ہے۔ یعنی وہ اپنی زندگی کو محفوظ رکھنے کے لئے جدوجہد ضروری کرتی ہیں لیکن انہیں کچھ علم نہیں ہوتا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر ان کے سامنے زندگی کا مقصد اپنی حیاتِ طبیعی کی حفاظت ہوتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ بنا بریں ان کی یہ تمام جدوجہد اور کشمکش صرف خارجی قوتوں سے ہوتی ہے۔ ان کی داخلی دنیا میں کوئی کشمکش نہیں ہوتی۔ حیوانات تک کی دنیا میں اسی قسم کی کشمکش ہوتی ہے۔

لیکن اس سے آگے جب انسان کی دنیا میں قدم رکھئے تو یہاں دو قسم کی کشمکشیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو وہی کشمکش جو حیوانی زندگی میں موجود تھی (اور جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے یعنی اپنی طبیعی زندگی کی حفاظت کے لئے خارجی قوتوں سے تزاحم و تصادم۔ اور دوسرے خود اپنی داخلی دنیا میں ایک گہری کشمکش۔ اس داخلی دنیا میں انسان کی جنگ خود اپنی ذات کے خلاف ہوتی ہے جہاں اصول کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے اور مصلحتوں کا تقاضا کچھ اور۔ یہ جنگ ان دو دشمنوں میں ٹھنتی ہے جو نہ کبھی ایک دوسرے سے صلح کر سکتے ہیں اور نہ ہی الگ ہو سکتے ہیں۔

انسانی زندگی جب اپنے ابتدائی مراحل میں تھی اور اس کے تقاضے ہنوز طبیعی حوائج سے آگے نہیں بڑھے تھے تو اس منزل کو آدم کی ابتدائی زندگی سمجھئے۔ اس منزل میں انسانوں کی ضروریات بہت

مختصر اور سامان نشوونما با افراط تھا اس لئے ان میں باہمی مفاد کا تصادم پیدا نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت ابھی انسان "انفرادی ملکیت" کے تصوّر سے ناآشنا تھا۔ کیونکہ اُسے حفاظتِ خویش کے لئے رزق کو جمع کرکے رکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن جب انسان شعور و ادراک کی نشوونما کے بعد کچھ آگے بڑھا تو عقل نے اسے یہ سکھایا کہ حصولِ رزق کے لئے مسلسل جدّوجہد کی بجائے یہ بہتر ہے کہ تھوڑے سے وقت میں، مختلف حیلوں سے، بہت کچھ اکٹھا کرلیا جائے اور اس طرح رزق کی طرف سے اطمینان حاصل کرلیا جائے۔ اس سے مختلف افراد کی عقول میں باہمی جنگ شروع ہوئی اور اس جنگ کا نتیجہ باہمی کشمکش ہوگیا۔ انسانیت کے مفادِ کلّی کا تقاضا یہ تھا کہ رزق کے سرچشمے تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں لیکن انفرادی عقل کا مطالبہ یہ تھا کہ رزق کے سرچشمے زیادہ سے زیادہ اس فرد کی ملکیت میں آجائیں تاکہ وہ اس کے اور اس کی اولاد کے کام آئیں۔ اس سے دوہری کشمکش شروع ہوگئی۔ ایک، انسان اور اس کے خارجی ماحول کی۔ اور دوسری، انسان کے اپنے اندر کی۔ اسی کا نام "آدم اور ابلیس کی آویزش" ہے۔ اور انسان کی ساری داستان اسی آویزش کی کہانی ہے۔

انسان نے اس کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے بڑی جدّوجہد کی ہے۔ اس ضمن میں ہمارے سامنے وہ منظّم کوشش آتی ہے جو دنیا میں "فلاطونی حکمت" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ وہ فلاطونی تصوّرِ حیات ہے جسے فلاطینس (PLOTINUS) نے پروان چڑھایا۔ اس حکمت نے (جو مختلف اوقات میں رہبانیت، ویدانت، عجمی تصوّف وغیرہ کے نظر فریب نقاب اوڑھ کر سامنے آتی رہی) اس کشمکش کا علاج آرزوؤں اور تقاضوں کے فنا و استہلاک میں سمجھا۔ گویا اس قسم کی ترکِ آرزو کی زندگی کا لازمی نتیجہ "انفرادی نجات" کا تصوّر تھا۔ یہ تصوّر نوعِ انسانی کی اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے کس درجہ ستم قاتل کا اثر رکھتا ہے۔ اس کے متعلق تفصیل سے اس کے اصلی مقام پر لکھا جائے گا۔ اس وقت ہم (BRIFEAULT) کے ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

حکمتِ یونانی

> اخلاقیات کے متعلق یونان کے ابتدائی تصوّر کا روانی اور ابیقوریت کے فلسفہ میں تبدیل ہوجانا ایسی خرابی کا موجب ہوا جس کی نظیر انسان کے اخلاقی تصوّر کی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ اخلاق جس سے مفہوم یہ ہے کہ انسانوں کے باہمی معاملات حق و صداقت پر مبنی

ہونے چاہئیں اپنا حقیقی مفہوم کھو دیتا ہے اگر اس کا نتیجہ نوعِ انسانی کی بہبود نہیں. اس سے تو اخلاقیات کا مقصود ہی فنا ہو جاتا ہے. اخلاقیات کا مقصود ایک فرد کی ذاتی بہبود یا نجات نہیں (اگرچہ نوعِ انسانی کی بہبود میں یہ ذاتی بہبود بدرجہ اُتم موجود ہے) بلکہ یہ مقصود ہے کہ اس فرد کا اس نوعِ انسانی کے ساتھ جس کا یہ ایک جُزو ہے کس قسم کا واسطہ ہے؟ اس (باہمی معاملات کے) ضابطۂ اخلاق کی بنیاد عدل ہے.... عدل کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر مستبدانہ اور قاہرانہ قوت سے غالب نہ آسکے...... اگر دنیا میں باطل (WRONG) کے کوئی معنی ہیں تو وہ یہی ہیں کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کو محض فرضی اقتدار کی بنیاد پر اپنا تابع فرمان بنالے..... اس باطل کا استیصال، اخلاقیات کا اصل فریضہ ہے. آپ مثالی اخلاقیات کی کیسی ہی شاندار عمارت کیوں نہ تعمیر کرلیں، اگر وہ باطل کا استیصال کرکے اس کی جگہ حق کو قائم نہیں کرتی تو وہ یکسر بے معنی ہے. یہ اوپر کی عمارت اخلاقیات کی عمارت کہلا ہی نہیں سکتی..... رواتی فلسفہ کی رُو سے نصب العینِ حیات، شر کا مقابلہ نہیں بلکہ اس کے سامنے جھک جانا رہ جاتا ہے. (صفحہ ۳۳۱ــــ۳۳۲)

مغرب کی مادّہ پرستی

یہ تو رہا رہبانیت (تصوّف) کا مسلکِ زندگی. اس کے برعکس مغرب کی مادہ پرستی نے یہ کہہ کر فرار کی راہ اختیار کرلی کہ زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں. اس لئے کشمکش صرف خارجی قوتوں سے ہے. جس نے تسخیرِ فطرت سے اپنی قوتوں میں اضافہ کرلیا، وہی آگے بڑھ گیا. سوال یہ ہے کہ کیا محض مادی ترقی کا نام "انسانی ترقی" ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب (BRIFFAULT) سے سنئے جس نے اقوام و تہاذیبِ عالم کے عروج و زوال کی تاریخ سے نتائج مرتب کئے ہیں. وہ لکھتا ہے.

اگر انسان بادلوں سے اونچا اڑنے لگ جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی بلند ہوگئی ہے. نہ ہی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار کے معنی ترقی ہیں. انسان اگر ستاروں کو تولنے کے قابل بھی ہوجائے اور علوم و فنون کے وسیع میدانوں میں گھوڑے دوڑانے لگ جائے تب بھی اس کے جوہرِ ذاتی میں قلبِ ماہیت پیدا نہیں ہو

سکتی۔ انسانی معاملات اس سے کہیں گہرے ہوتے ہیں........ قوت تہذیب، کلچر بے معنی چیزیں ہیں اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں۔ وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدر و قیمت پائی جاسکتی ہے۔ اخلاقی پیمانہ ہے۔ (صفحہ ۲۵۹)

اس قسم کے نظامِ تمدّن کے مآل کے متعلق یہی مؤرخ رقم طراز ہے۔

وہ نظامِ تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کردیا جاتا ہو آخرالامر تباہ ہوکر رہتا ہے۔ ناانصافی سے کوئی فرد کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے اس ناانصافی کی وجہ سے انجام کار برباد ہوجاتی ہے۔ انتخاب طبیعی اٹل قانون کی بناء پر گناہ کی اُجرت موت ہے۔ (صفحہ ۲۶۲)

کسی تہذیب کی تباہی سے یہ مراد نہیں کہ وہ قوم جو اس تہذیب کی حامل ہوتی ہے، امن و سلامتی میں رہتی ہے اور تہذیب فنا ہوجاتی ہے۔ کسی قوم کی تہذیب کی بربادی خود اس قوم کی موت ہوتی ہے۔ اور اس موت سے پہلے سکرات کی ہچکیاں اس قدر جاں گسل ہوتی ہے کہ قلب حساس اس کے نظارہ سے چیخ اٹھتا ہے۔ تہذیبِ مغرب کی اس جاں کنی کے عذاب کے متعلق ڈاکٹر جوڈ لکھتا ہے۔

انیسویں صدی، سائنس کی ظفر مندی کا زمانہ تھا۔ سائنس نے ہمیں سستا کوئلہ اور کپاس دی اور ذرائع رسل و رسائل میں انقلاب پیدا کردیا گیا اور دیگر سینکڑوں طریق سے انسانی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کردیں اور اس کی آسائش کے سامان مہیا کردیئے۔ لیکن یہ سائنس ایک دو دھاری تلوار تھی جس نے انسان کو وہ قوتیں عطا کردیں جن کا طریق استعمال وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی قتل و غارت گری کی استعداد میں بہت اضافہ ہوگیا اور اس طرح اس کی تہذیب تباہی کے جہنم کے کنارے تک آپہنچی۔ انیسویں صدی نے صرف سائنس کی ترقی دیکھی اور یہ ہمارے لئے چھوڑ دیا کہ ہم دیکھیں کہ سائنس کی اس ترقی کے ساتھ ساتھ انسانیت میں کس طرح تنزل واقع ہوتا گیا۔ (GOD AND EVIL; P-114)

یہ تھا مغرب کا وہ نظامِ تمدّن جس کی اساس اس غلط فکر پر تھی کہ زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے جس

ہیں کشمکش صرف خارجی قوتوں سے ہوتی ہے۔

ان دونوں (یعنی حکمتِ یونان اور تہذیبِ مغرب) کے برعکس، قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسانی زندگی کی کشمکش کا علاج حقائق سے چشم پوشی نہیں بلکہ ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے میں ہے۔ طبیعی زندگی کی کشمکش کے

قرآنی تعلیمِ فطرت

لئے تسخیرِ فطرت ضروری ہے اور اندرونی کشمکش کے لئے انسانی خودی کا نشوونما اور استحکام لازمی۔ نہ اُس سے فرار ہو سکتا ہے نہ اس سے گریز۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ اس باب میں داخلی اور خارجی کشمکش میں کوئی فرق نہیں۔ وہ ایک ایسا محیط کل نظام عطا کرتا ہے جس میں ایک ہی پروگرام کے ماتحت داخلی اور خارجی دونوں قوتیں انسان کو اس کے صحیح نصب العین کی طرف لے جاتی ہیں جس قسم کے قلبی جہنم میں آج یورپ گرفتار ہے، بعینہٖ یہی حالت رومن تہذیب کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ اس جہنم سے کس چیز نے بچایا؟ یہ ہم سے نہیں بلکہ (BRIFFAULT) سے سنئے وہ لکھتا ہے۔

> زندگی ایک الجھاؤ بن چکی تھی۔ برق رفتار لیکن بے سکون۔ فوری تبدیلیوں سے بھری ہوئی۔ انتہائی درجہ کی غمناک اندوہ گیں کشاکش میں مبتلا۔ بے پناہ خواہشات اور پھر مایوسیاں اور ناکامیاں۔ انسانیت اس مصیبت میں پھنسی ہوئی تھی کہ ایسے میں مشرق کی تصوراتی دنیا سے مذہب نے آکر ایک نئی روشنی اور نئے انکشافات دیئے درماندہ انسانیت اسی کے لئے تڑپ رہی تھی۔ مشرق ایک نجات دہندہ کی صورت میں مسیحا بن کر آگیا۔ (صفحہ ۱۵۵)

آج بھی دنیا کو اگر اس جہنم سے کوئی چیز امن و سلامتی کی راہ دکھا سکتی ہے تو وہ صرف وحی کی روشنی ہے۔ وحی کی رُو سے قائم شدہ نظام میں، سب سے پہلے ہوتا یہ ہے کہ انسانوں کے ہاتھ سے قوت و اقتدار چھین کر اس خدا کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو رَبُّ الْعٰلَمِیْن ہے (رَبّ کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ ہر شے کو اس کی ابتداء سے آخری نقطۂ ارتقاء تک بخیر و خوبی لے جاتا ہے) اس طرح وہ، علاماتِ مرض کا علاج کرنے کے بجائے، علّتِ مرض کو جڑ سے کاٹ دیتا ہے۔ انسانی قوت و اقتدار کی خرابیوں پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> جو کچھ مطلق قوت کے متعلق درست ہے وہی کچھ ہر قوت اور اقتدار کے متعلق درست ہے خواہ وہ کسی شکل اور کسی درجے میں ہو خواہ یہ اقتدار مراعات کا ہو یا قوتِ بازو کا۔ دولت

کی وجہ سے ہو یا ذہنی تفوق کی بنا پر۔ حاکم کا ہو یا حکومت کے کارندوں کا۔ مُلّا کا ہو یا فتنہ انگیز خطیب کا۔ انسانی اقتدار کا لازمی نتیجہ ظلم ہوتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ انسان بدواقع ہوئے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ قوّت کا خاصہ ہے کہ وہ حق و انصاف کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت میں خرابیاں پیدا کر دیتی ہے۔ (صفحہ ۲۷۸)

انسانی حاکمیّت کا استیصال

قرآن سب سے پہلے ہی کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس نظام میں بھی قوانین وضوابط کی پابندیاں ضروری ہوتی ہیں (اور پابندیوں کے بغیر حقیقی آزادی میسر کیسے آسکتی ہے؟) لیکن انسانوں کے خود ساختہ نظام اور وحیؔ کے متعیّن کردہ قوانین میں بہت بڑا فرق ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ وحیؔ کے قوانین حیاتؔ کے تقاضوں کی آواز ہوتے ہیں۔ اس لئے انسان ان کی اطاعت ومتابعت میں کسی خارجی قوّت کی محکومیت محسوس نہیں کرتا۔ پرنسپل کیئرڈ (CAIRD) کے الفاظ میں:۔

> صداقتِ مطلق..... کی زندگی کوئی اجنبی زندگی نہیں ہوتی۔ اگر وہ ہم سے کہیں باہر ہوتی ہے تو خود ہمارے اندر بھی وہی ہوتی ہے۔ اس کے سامنے جھک جانے سے ہم کسی خارجی مستبد قانون یا کسی بیرونی قوت کی محکومیت اختیار نہیں کرتے بلکہ ایک ایسے قانون کی متابعت کرتے ہیں جو خود ہماری ذات کا قانون ہوتا ہے۔ ایک ایسے حکمران کی اطاعت جس کا تختِ حکومت خود ہمارا عمیق قلب ہوتا ہے۔ (صفحہ ۲۳۷)

اسی حقیقت کو علّامہ اس بصیرت افروز انداز میں بیان کرتے ہیں:۔

> اسلام بہ حیثیت ایک نظامِ سیاست کے اصولِ توحید کو انسان کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا عملی طریق ہے۔ اس کا مطالبہ وفاداری، خدا کے لئے ہے نہ کہ تخت وتاج کے لئے۔ اور چونکہ ذاتِ باری تمام زندگی کی روحانی اساس ہے اس لئے اس کی اطاعت کیشی کا درحقیقت مطلب یہ ہے کہ انسان خود اپنی معیاری فطرت کی اطاعت اختیار کرتا ہے۔ (خطباتِ تشکیلِ جدید، صفحہ ۱۴۰)

قرآنِ کریم نے جب اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی تخلیق ایک "نفسِ واحدہ"

سے ہوئی ہے. یا یوں سمجھئے کہ حیات ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اور مختلف انسانی پیکر اس کی نمود کے ذرائع ہیں تو اس سے مقصود محض ایک سائنٹیفک مسئلہ سے تعارف نہیں بلکہ ایک عظیم الشان حقیقت کی طرف راہ نمائی ہے. یعنی اس حقیقت کی طرف کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل وحدتِ خالق اور وحدتِ خلق کے محکم اصول پر ہونی چاہیئے. اس کے معنی یہ ہیں کہ جب ایک فرد اس حقیقت پر ایمان لے آئے کہ

وحدتِ خلق

اس کی اپنی ذات کی نشوونما انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ کُل (انسانیت) کا ایک جُزو ہے اور جب تک کُل (انسانیت) کا ارتقاء نہیں ہوتا اس وقت تک جزو کا ارتقاء نہیں ہو سکتا، تو وہ اپنی محنت کے ماحصل کو کُل کی نشوونما ارتقاء کے لئے وقف کر دے گا. اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ ہے. جو خدا کے صفتِ رب العٰلمینی کا پرتو ہے. اس سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ وحی کی رُو سے قائم کردہ نظام میں تمام نوعِ انسانی کی بالیدگی اور فلاح کا راز مضمر ہوگا. نہ یہ کہ کسی قوم یا جماعت کے خون سے دوسری قوم یا جماعت کی پرورش کی جائے گی. یہی نظام صحیح نظامِ انسانیت کہلا سکتا ہے. بقول (BRIFFAULT) انسانی ارتقاء سے مفہوم ہی نوعِ انسانی کی تشکیل ہے نہ کہ افراد کی نجات و فلاح.

> فطرت کی میزان میں کسی ایسے بڑے مقدس اور نیک عمل کا وزن جو انسانیت کے ارتقاء میں ممد نہ ہو کبھی اتنا نہیں ہو سکتا جتنا اس ایک عمل کا جو نوعِ انسانی کے ارتقاء کا موجب ہو. (صفحہ ۳۵۲)

اسی بناء پر قرآنِ کریم، نسل، رنگ، قوم، وطن، زبان کی بناء پر نوعِ انسانی کی تفریق و تقسیم کو غلط قرار دیتا ہے. اس کے نزدیک نوعِ انسانی کی تقسیم صرف ایک معیار پر ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ وہ تمام انسان جو اس نظامِ ربوبیت کو نصب العین حیات قرار دیں جو وحی کی رُو سے قائم ہوتا ہے. ایک جماعت کے افراد. اور ان کے علاوہ وہ تمام انسان جو انفرادی (یعنی طاغوتی) نظام ہائے زندگی کو اپنا شعار بنا لیں. دوسری جماعت کے افراد. اوّل الذکر جماعت کا نام مومنین (یعنی اس نظام کو ماننے والے) اور دوسری کا کافرین (یعنی اس نظام سے انکار کرنے والے) ہے. لیکن اس تقسیم سے بھی یہ مفہوم نہیں کہ جماعتِ مومنین دوسری جماعت پر ظلم کرے گی اور ان سے ناانصافی برتے گی. قطعاً نہیں. جو نظام وحدتِ خلق کے عالمگیر اصول پر قائم ہو اس میں ظلم اور ناانصافی کا بھلا کیا دخل؟ وہ ان کے ساتھ بھی عدل کرے گی اور عدل کے معنی یہ ہیں

کہ کوئی فرد، بنیادی حقوقِ انسانیت سے محروم نہ رہنے پائے۔

وحی کے نظام کی ابتدا، ایمان سے ہوتی ہے۔ یعنی اس حقیقت کے اعتراف سے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل، اس کے باہمی معاملات کے سلجھاؤ اور انسانیت کے ارتقاء کے لئے تنہا عقل کی راہنمائی کافی نہیں۔ بلکہ خدا کی ہدایت یعنی وحی کی روشنی کی بھی ضرورت ہے۔ وحی کی کنہ و ماہیت کا ادراک عقل (یعنی علم استدلالی) کے بس کی بات نہیں۔ علم استدلالی کا دائرہ محسوسات کی حدود کے اندر ہے۔ اور وحی ان حدود سے باہر کی چیز ہے۔ محدود کے لئے لامحدود کا احاطہ ناممکن ہے۔ بقول پرنسپل

> کسی اعلیٰ فطرت کا (اپنے سے) ادنیٰ فطرت، یا لامحدود کا محدود پر اپنے آپ کو منکشف کر دینا تو ہماری سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن کسی محدود کا لامحدود کو ثابت کرنا یا اس کے اثبات کے دلائل لانا، ہمارے تصور میں نہیں آسکتا۔ (صفحہ ۴۰)

وحی اور عقل لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وحی کی تعلیم، عقل کے خلاف ہوتی ہے۔ وحی، خلافِ عقل ہو نہیں سکتی لیکن ماورائے عقل ہو سکتی ہے۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ کسی خاص زمانہ کی عقل، وحی کے کسی انکشاف کا احاطہ نہ کر سکے۔ ایسی صورت میں صحیح راہِ عمل یہی ہے کہ وحی کی پیش کردہ حقیقت پر ایمان رکھا جائے اور اس بات کا انتظار کیا جائے کہ جب زمانہ کی علمی اور عقلی سطح اور بلند ہو گی اُس وقت یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی۔ پرنسپل کیرڈ لکھتا ہے۔

> جو خلافِ عقل ہو وہ وحی نہیں ہو سکتی۔ لیکن وحی ہم تک ایسی چیزیں بھی تو پہنچاتی ہے جو عقل کی حدود سے بلند ہوتی ہیں۔ وحی میں وہ اسرارِ الٰہیہ بھی شامل ہوتے ہیں جو انسانی فہم کی حدود سے ماوراء ہوتے ہیں۔...... محدود عقل ان اسرار کو دریافت نہیں کر سکتی۔ اور جب یہ دریافت بھی ہو جائیں تو ان کا احاطہ نہیں کر سکتی۔...... لہٰذا یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ کسی مذہب میں ایسے تصورات بھی ہوں جو یقینی طور پر سچے ہوں، لیکن دنیا کے عملی تجربہ میں ان کا علم بعد میں جا کر آتے اور اُس وقت بھی نوعِ انسانی کے کسی خاص حصّہ کے علم میں۔
>
> (صفحہ ۶۶ - ۶۷)

انسان کی سب سے بڑی بھول یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی عقل اور اپنے زمانہ کی عقل کو ہمیشہ مکمل سمجھتا ہے حالانکہ یہ حقیقت کہ وہ اپنے سے پہلے زمانہ کی عقل پر ہنستا ہے خود اس امر کی دلیل ہے کہ بعد میں آنے

والا' اس کے زمانہ کی عقل پر اسی طرح ہنسے گا. اس لئے اس کے زمانہ کی عقل مکمل کیسے ہوسکتی ہے؟ ہم آج اپنے زمانہ کی سائنس کے انکشافات پر اس درجہ نازاں ہیں اور اس امر کے مدعی کہ صداقت وہی ہے جو اس سائنس کی رُو سے صحیح ثابت ہوجائے. لیکن ہماری اس سائنس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے متعلق (BRIFFAULT) کا فتوےٰ سنئے. وہ لکھتا ہے کہ

> ہمارے اپنے طبیعیاتی اور حیاتیاتی نظریئے آنے والی نسلوں کو اسی طرح عجوبہ دکھائی دیں گی جس طرح آج ہمیں وہ نظریئے دکھائی دیتے ہیں جن میں سائنس اپنے عہدِ طفولیت میں لپٹی ہوئی تھی. (صفحہ ۱۹۷)

جب انسان کے علم وعقل کی تدریجی ترقی کی یہ حالت ہے تو کسی حقیقت سے محض اس لئے انکار کردینا کہ وہ آج کے زمانہ کی سمجھ میں نہیں آسکتی. عقلی حدود کے متعلق مبالغہ سے کام لینا ہے. وحی کی تعلیم کی صداقت اس کے عملی نتائج سے پہچانی جاتی ہے یعنی اس حقیقت سے کہ زمانہ' فطرت کے تقاضوں سے مجبور ہوکر' کس طرح غیر وحی تصوراتِ حیات کو چھوڑتا جاتا اور ان کی جگہ قرآنی تصوراتِ زندگی کو ایک ایک کرکے قبول کرتا جاتا ہے.

رسُول کا منصب

جن نفوسِ قدسیہ پر حقیقت اپنے آپ کو بے نقاب کرتی ہے' انہیں دین کی اصطلاح میں رسول یا نبی کہا جاتا ہے. دین کا کام یہ نہیں کہ چند بنیادی صداقتیں (FUNDAMENTAL TRUTHS) نظری طور پر پیش کردے اور بس. بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ عملی طور پر بتائے کہ انسانی معاملات کو ان صداقتوں کے قالب میں کس طرح ڈھالا جاتا ہے. یہ ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کے عملی مسائل (جنہیں تمدن کہا جاتا ہے) شروع سے ایک جسم نامی کی طرح ارتقائے زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور پھیلتے جاتے تھے اسی لئے وہ اسالیب وانداز جن میں یہ بنیادی صداقتیں پیش کی جاتی تھیں اس ماحول کے مقتضیات کے مطابق اختیار کئے جاتے تھے جس میں وہ تعلیم سامنے آتی تھی. انسانی تقاضوں کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان اسالیب وانداز میں بھی ارتقائی تبدیلیاں ہوتی رہیں. حتیٰ کہ یہ جسم نامی اپنے عہدِ شعور تک پہنچ گیا. جہاں اس تعلیم کو اس طرح مکمل کردیا گیا کہ وہ انسان کے تمام تقاضوں کا اصولی حل اپنے اندر رکھتی ہے. یہ تعلیم قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے.

اس سلسلۂ رُشد و ہدایت کا انتظام یہ کیا گیا تھا کہ ایک رسول آتا اور وہ خدا کے پیغام کو اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق متشکّل کر کے دے دیتا. جب تک اس تعلیم کو علیٰ حالہٖ رکھنا مقصود ہوتا وہ باقی رہتی. اس کے بعد یا تو ضائع ہو جاتی یا تحریف و الحاق سے مسخ ہو جاتی. اس وقت ایک اور رسول آجاتا. چاہیئے تو یہ تھا کہ جب کسی سابقہ تعلیم کے ضائع، فراموش یا مسخ ہو جانے کے بعد نئی تعلیم آتی، تو چونکہ یہ تعلیم بھی اسی سرچشمۂ ہدایت کی طرف سے تھی جو سابقہ تعلیم کا منبع تھا، اس لئے اپنے آپ کو سابقہ تعلیم کی طرف منسوب کرنے والے اس نئے پیغام پر لبّیک کہتے. لیکن انسانی ضد اور ہٹ دھرمی ایسا نہ ہونے دیتی. سابقہ تعلیم کے وابستگانِ دامن الگ گروہ بن کر بیٹھ جاتے اور اس نئے پیغام کی تکذیب اور مخالفت میں سب سے بڑی سعادت محسوس کرتے. اس طرح مختلف مذاہب[1] و ملل کا وجود عمل میں آگیا جو آج تک قائم ہے. چونکہ مذہب کا تعلق یکسر جذبات سے سمجھا جاتا ہے اس لئے کوئی فرقہ یا گروہ غور و فکر سے کام لینے کی کوشش نہیں کرتا. ورنہ اگر ذرا بہ نظرِ تعمق دیکھا جائے تو یہ معاملہ کچھ ایسا مشکل نہیں کہ سمجھ میں نہ آسکے. یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا میں (آخری دین یعنی اسلام کے سوا) کسی کے ہاں ان کی آسمانی کتاب اپنی اصلی اور غیر محرّف شکل میں موجود نہیں، تاریخی شہادات کے علاوہ خود ان کتابوں کی (موجودہ) تعلیم اور ایک دوسرے کا باہمی اختلاف اس حقیقت پر گواہ ہے. تھوڑا عرصہ گذرا، ایک کتاب شائع ہوئی ہے (BIBLE OF THE WORLD) اس کتاب میں مختلف مذاہبِ عالم کی مقدس کتابوں کے ان اقتباسات کو یکجا کیا گیا ہے جو مرتّب کے نزدیک ان مذاہب کی بنیادی تعلیم کا ماحصل ہیں. اب ظاہر ہے کہ اگر یہ دعویٰ صحیح ہو کہ تمام مذاہب کی

مذہبی فرقہ بندیاں

---

[1] حضرات انبیاء کرامؑ خدا کی طرف سے دین لاتے تھے. لیکن جب ان کے نام لیوا بعد میں اس دین کو مسخ کر دیتے تو اسی کا نام مذہب ہو جاتا، دین اور مذہب کے اس فرق کو سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے. میں نے اس فرق کی تفصیل اور تشریح اپنی آیندہ تحریروں میں بڑی شرح و بسط سے کی ہے. حتّٰی کہ میری انگریزی کتاب کا عنوان ہی (ISLAM : A CHALLENGE OT RELIGION) ہے. اسلام، مذہب نہیں، دین ہے. اور دین، ہمیشہ مذہب کے خلاف چیلنج کرتا ہے.

مقدس کتابیں اپنی اصلی شکل میں دنیا میں موجود ہیں تو بائبل اوف دی ورلڈ میں پیش کردہ تعلیم میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہونا چاہیئے اس لئے کہ ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف اور متضاد تعلیمات کا تصور باطل ہے۔ لیکن پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں بائبل اوف دی ورلڈ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ "ان تعلیمات میں کس قدر باہمی اختلاف ہے۔ اور مباحث کو تو چھوڑیئے۔ صرف اس ایک مسئلہ میں کہ دنیا کا آغاز کس طرح ہوا۔ ایک تعلیم دوسرے سے نہیں ملتی۔"

دو غلط راہیں

مذاہبِ عالم کے ان اختلافات سے گھبرا کر لوگوں نے عام طور پر دو راہیں اختیار کر لیں۔ متشدد طبقہ نے تو یہ کہنا شروع کر دیا کہ ان کے بانیٔ مذہب[1] کے علاوہ دیگر بانیانِ مذاہب اپنے دعوے میں (معاذ اللہ) جھوٹے تھے اس لئے آسمانی صداقت صرف انہی کے پاس ہے۔ دوسرے طبقہ نے (جو، ہر دلعزیز رہنا چاہتا تھا) اس عقیدہ کو پھیلانے کی کوشش کی کہ عالمگیر صداقتیں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں[2] اس لئے کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر فوقیت و افضلیت حاصل نہیں۔ قرآنِ کریم کی رُو سے یہ دونوں مسلک باطل ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمام رسول خدا کی طرف سے سچی تعلیم لائے تھے اس لئے ان میں سے ہر ایک کے دعوۓ رسالت کی صداقت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ لیکن ان کی تعلیم اپنی اصلی شکل میں کہیں باقی نہیں رہی اپنی اصلی شکل میں صرف آخری تعلیم موجود (قرآن کریم کے اندر) ہے جسے اب ہمیشہ کے لئے انسانی زندگی کا نصب العین بنایا گیا ہے۔ لہٰذا یہ غلط ہے کہ آج تمام مذاہب میں عالمگیر صداقتیں یکساں طور پر موجود ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ دین کا کام محض چند صداقتوں کا نظری طور پر پیش کرنا نہیں بلکہ ایک نظامِ زندگی متعین کرنا ہے جو انسانی معاملات کے تمام انفرادی اور اجتماعی گوشوں کو محیط ہو۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام ایک

---

[1] مذہب کے لئے بانی کا لفظ دیگر مذاہب کی مروجہ اصطلاح کی رُو سے استعمال کیا گیا ہے ورنہ قرآنِ کریم کی رُو سے رسول آسمانی دین کا بانی نہیں ہوتا۔ دین خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ رسول اس دین کو انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ [2] ہمارے زمانے میں اس مسلک کے عام کرنے والے (مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم) تھے۔ میں نے ان کے اس مسلک کی شدت سے مخالفت کی تھی۔

ہی ہو سکتا ہے۔

کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

پھر اس حقیقت کو بھی سامنے رکھئے کہ مذہب کا یہ نظام (یعنی عالمگیر صداقتوں پر مشتمل عملی اسلوب) جسم نامی کی طرح بڑھتا رہا ہے۔ اس لئے اگر بفرضِ محال یہ بھی مان بھی لیا جائے کہ آج سے چھ سات ہزار سال پیشتر کے انسانوں کے لئے دین کا جو نظام متعین کیا گیا تھا، وہ آج بھی اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود ہے تو کیا وہ نظام اس نظام کے برابر ہو گا جو انسانیت کے عہدِ بلوغ میں، تمام نوعِ انسانی کا نصابِ زندگی بننے کے لئے دیا گیا ہے؟ کیا یہ حقیقت کہ ان دونوں میں بنیادی صداقتیں ایک ہی ہیں، ان دونوں کو ایک ہی سطح پر کھڑا کر دے گی؟ درخت کی وہ پہلی سوئی جو بیج سے پھوٹتی ہے اور پھلوں اور پھولوں سے لدا ہوا درخت دونوں میں ایک ہی بنیادی صداقت کارفرما ہوتی ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس اشتراک کے باوجود دونوں کا مقام ایک نہیں ہوتا۔ ایک نوجوان صاحبِ عقل و شعور میں وہی بنیادی صداقتیں جلوہ پیرا ہوتی ہیں جو اُس میں اُس وقت موجود تھیں جب وہ گھٹنیوں چلتا تھا۔ لیکن اس مشارکت سے جوان اور بچہ ایک جیسے کبھی نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی واضح رہے کہ جو چیز ایک جسمِ نامی کی طرح ارتقائی طور پر آگے بڑھ رہی ہو اس کی پچھلی منزل کی خصوصیات، اگلی منزل میں منتقل تو ہو جاتی ہیں۔ لیکن علیٰ حالہ قائم نہیں رہتیں۔ بلکہ اگلی منزل انہیں اپنے اندر جذب کر کے ایک اور ہی رنگ دے دیتی ہے جب شاخ، پھول بنتی ہے تو پھول میں شاخ موجود ہے لیکن اپنی اصلی حالت میں نہیں۔ پھول اسے اپنے اندر جذب کر کے اسے ایک اور ہی قبائے رنگین عطا کر دیتا ہے۔ پودا جن مختلف منازل میں سے گزرتا ہے وہ سب کی سب درخت کے اندر جذب ہوتی ہیں۔ لیکن اب ان کی شکل کچھ اور ہوتی ہے۔ ایک نوجوان میں بچپن سے لے کر جوانی تک کے تمام مقامات (STAGES) یکجا موجود ہوتے ہیں لیکن ایک نرالے انداز میں۔ اسی طرح مذہب کی عالمگیر صداقتیں جب انداز و اسالیب کی مختلف ارتقائی منازل طے کر کے آگے بڑھتی ہیں تو ہر سابقہ منزل کی خصوصیت نئی منزل میں جذب ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے حتّٰی کہ آخری منزل میں تمام سابقہ منازل کی خصوصیات جذب ہو کر انتہائی رعنائیاں اختیار کر لیتی ہیں۔ لہٰذا یہ تصور ہی غلط ہے کہ مختلف مذاہبِ عالم کی "مشترکہ خصوصیات" کو یکجا کر لیا جائے تو اس مجموعہ کا نام "عالمگیر صداقتیں" ہو گا جو "ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں"۔ یہ مشترکہ خصوصیات،

اخلاق کے چند مبادیات کے سوا اور کیا ہوں گی؛ دین ایک مکمل نظامِ زندگی عطا کرتا ہے لہٰذا نوعِ انسانی کی راہ نمائی کے لئے آخری دین ہی واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہو سکتا ہے نہ کہ مختلف مذاہب اپنی موجودہ شکل میں۔ مکمل، ہر سابقہ ناتمام کو اپنے اندر لئے ہوتا ہے۔[1] ناتمام، مکمل کو اپنے اندر نہیں رکھ سکتا۔ قرآن کریم نے اپنے اندر ایسے اصولِ حیات دے دیئے ہیں جو انسان کی مکمل زندگی کے لئے پوری پوری راہنمائی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس لئے قرآن کے بعد کسی مزید راہ نمائی کی ضرورت نہیں رہتی۔ (اس اجمال کی تفصیل کے لئے میری کتاب "اسلام کیا ہے" کا مطالعہ مفید رہے گا)۔

حکومتِ الٰہیہ کا مفہوم

یہ نظام جو وحی کی رُو سے قائم ہوتا ہے، اس کی تفصیلات و جزئیات طول طویل ہیں، لیکن اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ دنیا میں تمام انسانوں کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما پورے پورے طور پر ہوتی چلی جائے اور اس طرح انسانیت من حیث الکل اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور اوپر اٹھتی جائے (تفصیل ان امور کی میری تصنیف "قرآنی نظامِ ربوبیت" میں ملے گی) اس نظام کو بعض اوقات (بغرضِ تعارف) "حکومتِ الٰہیہ" بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ اس حکومت کی عملی تفصیل کیا ہے، اس کے متعلق تو شرح و بسط سے اپنے مقام پر لکھا جائے گا۔ سرِدست اس کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ "حکومتِ الٰہیہ" سے ذہن فوراً (THEOCRACY) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآنی نظریۂ حکومتِ الٰہیہ تھیاکریسی سے بالکل الگ ہے۔ تھیاکریسی کی اصطلاح سب سے پہلے، قدیم یہودی مؤرخ جوزیفس نے وضع کی تھی اور اس سے مقصود وہ اندازِ حکومت تھا جو بنی اسرائیل کی ابتدائی زندگی میں مروّج تھا۔ بنی اسرائیل کے ہاں یہوؔہ (خدا) کے متعلق یہ عقیدہ بھی موجود تھا کہ وہ ان پر حکومت کرتا ہے۔ شروع میں اس عقیدہ سے مفہوم کچھ ہی ہو لیکن رفتہ رفتہ "یہوؔہ کی حکومت" کچھ اور ہی صورت اختیار کر گئی۔ چنانچہ ان کے ہاں (i) یہوؔہ کا مقدس ہیکل (ii) اس کی کتابِ شریعت (جو دراصل فقہا کے فتاویٰ پر مشتمل تھی) اور (iii) خود احبار و رہبان۔ ان تینوں کے مجموعہ کا نام "حکومتِ خداوندی" تھا۔ ان کے ہاں اجتہاد کا تو تصوّر ہی نہ تھا۔ تورات کی تختیاں (جیسی کچھ

---

[1] اسی لئے قرآنِ کریم نے اپنے آپ کو تمام سابقہ ادیان کا 'مہیمن' کہا ہے جس کے اندر تمام سابقہ ادیان محفوظ ہو گئے۔

بھی وہ تھیں) ایک مقدس صندوق میں بند ایک مقدس مقام پر رکھی رہتی تھیں۔ اب "خدا کی کتابِ شریعت" جس طرح مدوّن ہوتی تھی اس کی تفصیل بلنجلی کے الفاظ میں دیکھئے۔ وہ اپنی کتاب

(THEORY OF THE STATE)

میں لکھتا ہے۔

قانونِ الٰہی ایک سونا منڈھے ہوئے صندوق میں رکھا رہتا تھا جس کی دو کرّوبی حفاظت کرتے تھے اور جس کی تعظیم الہامِ ربانی کے مرکز کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ تابوت، خیمہ کے اندر ایک پردہ کے پیچھے، قدس الاقداس' میں رہتا تھا" اور کاہنوں کی طرف سے پورے اہتمام سے اس کی نگرانی ہوتی تھی۔ یہیں کاہنِ اعظم یہوہ کے احکام معلوم کرتا اور لوگوں کو مطلع کرتا۔ قضاۃ جو قبائل میں شریعت کی تنفیذ پر مامور تھے۔ یہ کام خدا کے نام پر انجام دیتے تھے۔ کیونکہ حکم صرف اللہ کے لئے تھا۔ اگر ان کے سامنے کوئی معاملہ ایسا آجاتا جس کا فیصلہ ان کے لئے مشکل ہوتا تو اس میں ان کے لئے ضروری ہوتا کہ لاویوں کے ذریعے سے خدا کی مرضی معلوم کریں۔

یہ تو تھی احبار و رہبان کی حکومت۔ جب ان میں بادشاہت آگئی تو بادشاہ کے متعلق یہ عقیدہ قائم کیا گیا کہ وہ مامور من اللہ ہے اور خدا کی مرضی کا پورا کرنے والا۔ چنانچہ ہیکل کی برکات بادشاہ کے شاملِ حال اور مقدس راہبوں کی دعائیں اس کی محافظ و نگراں ہوتیں۔ اس طرح حکومت اور برہمنیت کے امتزاج سے ایک ایسا "خدائی نظامِ حکومت" وجود میں آگیا جو مقدس استبداد کا مجسمہ تھا۔ وہی نظام جو ہندوستان میں برہمن اور کھشتری راجاؤں کے ملی تغلّب سے وجود میں آیا۔ اس نظام میں راجہ کو ایشور کا اوتار قرار دیا جاتا تھا جس کی رکھشا (حفاظت)، براہمنوں کی اشیرباد (دعا) کرتی تھی۔ یہی وہ رُوح تھی جو مسلمانوں کے دورِ حکومت میں بادشاہ کو ظلِّ الٰہی قرار دینے کا موجب بنی۔

لیکن اس تخیّل کو قرآنِ کریم کے حکومتِ خداوندی کے تصوّر سے کچھ واسطہ نہیں۔ قرآن ملوکیت اور براہمنیت دونوں کو مٹانے کے لئے آیا ہے۔ حکومتِ الٰہیہ کے اصولی قوانین قرآنِ کریم کے اندر منضبط ہیں۔ ان اصولی قوانین کی روشنی میں، ہر زمانہ میں ملّتِ اسلامیہ باہمی مشورہ سے اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق عقل و علم کی روشنی میں، جزئی قوانین خود مرتب کرتی ہے۔ وہ اصول تو غیر متبدل رہتے ہیں۔ لیکن ان کی

روشنی میں مرتب کردہ جزئی قوانین زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ عند الضرورت بدلے جا سکتے ہیں. اس نظام میں وحی، علمِ انسانی اور مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ تینوں دوش بدوش چلتے ہیں اور ایسا انتظام کرتے ہیں جس سے تمام افرادِ انسانیہ کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی چلی جائے اور کسی انسان پر کسی دوسرے انسان کا کوئی حکم نہ چلے۔ نہ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج ہو۔

حضرات انبیاء کرامؑ اسی قسم کا نظامِ ربوبیت قائم کرنے کے لئے آئے تھے. اس مقصد کے لئے قرآن نے مختلف انبیاء کرامؑ کا ذکر کیا ہے اور ان کے ذکر کے ساتھ ہی اس کشمکش کا بھی ذکر کیا ہے جس سے انہیں اس قسم کے نظام کی تشکیل میں دوچار ہونا پڑتا تھا. اس لئے کہ مفاد پرست قوتیں کبھی نہیں چاہتی تھیں کہ رزق کے سرچشمے ان کے ہاتھ سے چھن کر نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے عام ہو جائیں.

ان انبیاء کرامؑ اور ان کے ہاتھوں سے لائے ہوئے انقلابات کا تذکرہ اگلی جلدوں (یعنی جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور اور معراجِ انسانیت میں ملے گا)۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْم

والسلام

پرویز